# فلسفۂ تعلیم

یعنی

حکیم ہربرٹ سپنسر کی کتاب "ایجوکیشن" کا ترجمہ

جس کو

مولوی خواجہ غلام الحسنین صاحب پانی پتی نے

حسب فرمایش "انجمن ترقی اُردو" باضافۂ دیباچہ و تذکرۂ مصنّف

و حواشی کثیرہ و دیگر امور ضروریہ مرتب کیا

اور مسلم یونیورسٹی بک ڈپو کے لیے

باہتمام محمد مقتدی خاں شروانی

مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڈھ کالج میں ۱۳۳۹ھ ۱۹۲۱ء طبع ہوا

[۵۰۰ جلد

# فہرست مطبوعاتِ انجمن ترقی اُردو

**فلسفۂ تعلیم** ہربرٹ اسپنسر کی مشہور تصنیف اور مسئلہ تعلیم کی آخری کتاب ہے۔ غور و فکر کا بہترین کارنامہ اور والدین و معلم کے لیے چراغِ ہدایت ہے ترجمے کے زبانی فقرنین کو اس قدر صحت کے ساتھ مرتب کیا ہے کہ کتاب الہامی معلوم ہوتی ہے اس کا نہ پڑھنا گناہ ہے قیمت للعہ

**القول الاظہر** ابن مسکویہ کی معرکۃ الآرا تصنیف الفوز الاصغر کا اُردو ترجمہ ہے۔ ابن مسکویہ آسمانِ علم و فضل کا آفتاب تھا یہ کتاب فلسفہ الہئین کے اُصول پر لکھی گئی ہے اور مذہب اسلام پر انھیں اُصول کو منطبق کیا گیا ہے اس کو بمبئی یونیورسٹی نے سرکاری کتب خانوں کے لیے تجویز کیا ہے قیمت - - - - - - - - - عم

**نپولین اعظم** ایبٹ کی مستند کتاب کا اُردو ترجمہ ہے کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ نپولین کی زندگی بشری جدوجہد کا آخری باب ہے واقعات کی داد یا تو سکندر کی زبان دا کر سکتی ہے یا تیمور کی زبان، ترجمہ آسان اور عام فہم ہے مکمل پانچ جلد قیمت للعہ

**رہنمایانِ ہند** مشہور کتاب پروفٹس آف انڈیا کا ترجمہ ہے شروع میں ہندو مذہب کے برگزیدہ عقائد کا بیان فاضلانہ مگر دلکش پیرایہ میں لکھا ہے اس کے بعد سری کرشن جی مہاراج کی سوانح اور گوتم بدھ کے پُراثر حالات آتے ہیں آخری حصہ میں شنکر اچارج رامانج اور رامانند کا ذکر ہے قیمت - - - - - - - - عہ

**اُمرائے ہنود** پانسو سے زیادہ ہندو امرا کے حالات قلمبند ہیں۔ یہ اُمرا سلاطین مغلیہ کے زمانہ میں بڑے بڑے عہدوں پر سرفراز تھے کتاب گویا ان متعصب اور ناواقف مورخوں کا جواب ہے جو اسلامی حکومت پر تعصب کا الزام لگاتے ہیں قیمت حصہ اوّل - - - - - - عگ حصہ دوم - - - - - عہ

**القمر** قوانین حرکت و سکون اور نظام شمسی کی صراحت اور چاند کے متعلق تحقیق جدید

سلسلۂ انجمن ترقی اردو نمبر ا

# فلسفۂ تعلیم

یعنی

حکیم ہربرٹ سپنسر کی کتاب "ایجوکیشن" کا ترجمہ

جس کو

مولوی خواجہ غلام الحسنین صاحب پانی پتی نے

حسب فرمایش "انجمن ترقی اردو" باضافۂ دیباچہ و تذکرۂ مصنف

و حواشی کثیرہ و دیگر امور ضروریہ مرتب کیا

اور مسلم یونیورسٹی بک ڈپو کے لیے

باہتمام محمد مقتدی خاں شروانی

مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڈھ کالج میں ۱۳۳۹ھ ۱۹۲۱ء طبع ہوا

بار دوم ] [ ۵۰۰ جلد

# فہرست مطبوعاتِ انجمن ترقی اُردو

**فلسفۂ تعلیم** ہربرٹ اسپنسر کی مشہور تصنیف اور مسئلہ تعلیم کی آخری کتاب ہے۔ غور و فکر کا بہترین کارنامہ اور والدین و معلم کے لیئے چراغِ ہدایت ہے تربیت کے زبانی قوانین کو اس قدر صحت کے ساتھ مرتب کیا ہے کہ کتاب الہامی معلوم ہوتی ہے اس کا نہ پڑھنا گناہ ہے قیمت عہ

**القول الاظہر** ابن مسکویہ کی معرکۃ الآرا تصنیف الفوز الاصغر کا اُردو ترجمہ ہے۔ ابن مسکویہ آسمانِ علم و فضل کا آفتاب تھا یہ کتاب فلسفہ الہیٰ کے اصول پر لکھی گئی ہے اور مذہب اسلام پر انھیں اُصول کو منطبق کیا گیا ہے اس کو بمبئی یونیورسٹی نے سرکاری کتب خانوں کے لیئے تجویز کیا ہے قیمت - - - - - - - - - عمہ

**نپولینِ اعظم** ایبٹ کی مستند کتاب کا اُردو ترجمہ ہے کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ نپولین کی زندگی بشری جد و جہد کا آخری باب ہے واقعات کی داد یا تو سکندر کی زبان ادا کرسکتی ہے یا تیمور کی زبان، ترجمہ آسان اور عام فہم ہے مکمل پانچ جلد قیمت للعہ

**رہنمایانِ ہند** مشہور کتاب پروفٹس آف انڈیا کا ترجمہ ہے شروع میں ہندو مذہب کے برگزیدہ عقائد کا بیان فاضلانہ مگر دلکش پیرایہ میں لکھا ہے اس کے بعد سری کرشن جی مہاراج کی سوانح اور گوتم بدھ کے پُر اثر حالات آتے ہیں آخری حصہ میں شنکر اچاریہ رامانج اور رامانند کا ذکر ہے۔ قیمت - - - - - - - عہ

**اُمرائے ہنود** پانسو سے زیادہ ہندو امرا کے حالات قلمبند ہیں۔ یہ اُمرا سلاطین مغلیہ کے زمانہ میں بڑے بڑے عہدوں پر سرفراز تھے کتاب گویا ان متعصب و ناواقف مورخوں کا جواب ہے جو اسلامی حکومت پر تعصب کا الزام لگاتے ہیں قیمت حصہ اول - - - - عہ حصہ دوم - - - - عہ

**القمر** قوانین حرکت و سکون اور نظام شمسی کی صراحت اور چاند کے متعلق جتنی جدید

# فہرستِ مضامین

| صفحہ | مضمون |
|---|---|



(ترجمہ)

# دیباچۂ مصنف



[1] ہندسہ بجائے ۳۷ کے ۳۶ چھپ گیا ہے۔

| مضمون | صفحہ |
| --- | --- |

## متن

# باب اوّل

## کون سا علم سب سے زیادہ قیمتی ہے؟



[1] ۵۳ کے بجائے ۲۲ کا ہندسہ فرمے پر غلط چھپ گیا ہے

ﻪ ۶۹/۷۰ کے بجائے ۱۳/۱۳ ہندسہ فرمے پر غلط چھپ گیا ہی

## باب دوم

## تعلیم عقلی

| مضمون | صفحہ |
| --- | --- |
|  | ۱۹۸ |

| مضمون | صفحہ |
|---|---|

## باب سوم ۳

## تعلیم اخلاقی

| مضمون | صفحہ |
| --- | --- |
| والدین کا عام برتاؤ اور اُن کے متناقض خصائل کا اثر اولاد پر | ۲۳۳ |
| قدرتی طریقہ تربیت کے نتائج کی توضیح ایک آسان مثال کے ذریعہ سے | ۲۳۵ |
| زبردستی کی روک ٹوک صرف اُن حالتوں میں ہونی چاہیئے جہاں بچوں کو سخت صدمہ پہونچنے کا اندیشہ ہو | ۲۳۷ |
| سخت خطاؤں میں قدرتی طریقہ تربیت کو کس طرح کام میں لانا چاہیئے ؟ | ۲۳۸ |
| قدرتی طریقہ تربیت کی بدولت سخت خطاؤں کی تعداد کم ہوجاتی ہی۔ اور بہت سخت خطائیں بھی سرزد نہیں ہوتیں | ؍؍ |
| سخت قصوروں کی حالت میں بھی قدرتی طریقہ تربیت اختیار کرنا چاہیئے | ۲۴۰ |
| مزید تشریح اس امر کی کہ خفیف اور نیز سخت قصوروں کے تدارک کے لیئے قدرتی نتائج کی تربیت مفید ہی | ۲۴۱ |
| سخت گیری کے مضر نتائج اور اس کے متعلق سرجان لاگ وغیرہ کی رائیں | ۲۴۲ |

## اخلاقی تربیت کے متعلق چند نصیحتیں

| مضمون | صفحہ |
| --- | --- |
| پہلی نصیحت - - - - - - - - - - - - - - - - - | ۲۴۴ |
| دوسری نصیحت - - - - - - - - - - - - - - - - | ۲۴۵ |
| تیسری نصیحت - - - - - - - - - - - - - - - - | ۲۴۷ |
| چوتھی نصیحت - - - - - - - - - - - - - - - - | ۲۴۸ |
| پانچویں نصیحت - - - - - - - - - - - - - - - - | ۲۴۹ |
| چھٹی نصیحت - - - - - - - - - - - - - - - - | ۲۵۱ |
| ساتویں نصیحت - - - - - - - - - - - - - - - - | ۲۵۲ |

| صفحہ | مضمون |
|---|---|
| | آٹھوین نصیحت |
| ۲۵۳ | اخلاقی تربیت کا کامل نمونہ نوع انسان کی ترقی یافتہ حالتوں کے لیئے مناسب ہی اور |
| ۲۵۵ | یہ طریقہ والدین اور اولاد دونوں کے لیئے مفید ہی |

# باب چہارم

## تعلیم جسمانی

| مضمون | صفحہ |
|---|---|
| اِن شہادتوں سے ثابت ہی کہ بچّوں کو عمدہ اور مقوی خوراک دینی چاہیئے۔ | ۲۷۹ |
| بچّوں کو ایک ہی قسم کی خوراک دینا سخت غلطی ہی | ۲۸۰ |
| خوراک کی تبدیلی کی ضرورت اور اُس کے فوائد | ۲۸۱ |
| ہر ایک کھانے پر کئی قسم کی چیزیں استعمال کرنے کی ضرورت اور اُس کی وجہ | ؍؍ |
| اِس اعتراض کا جواب کہ بچّوں کو ادل بدل کر خوراک دینا یا ایک وقت میں کئی طرح کی چیزیں دینا تکلیف مالا یطاق ہی | ۲۸۲ |
| خوراک کی بابت چند اور ہدایتیں | ۲۸۳ |
| خوراک کی طرح بچّوں کے لباس میں بھی کمی کی جاتی ہی۔ جسمانی احساسات ہمارے رہبر ہیں نہ کہ گمراہ کرنے والے | ۲۸۴ |
| بچّوں کے لباس میں گرمی اور سردی کے احساس کا لحاظ رکھنا لازم ہی۔ اُن کو جفاکش بنانے کے خیال سے کم لباس پہنانا محض لغو ہی | ۲۸۵ |
| سردی میں بدن کے کُھلے رہنے سے نمود کو ضرور نقصان پہونچتا ہی | ۲۸۶ |
| بیان مذکورۂ بالا کی تشریح علمی حیثیت سے | ۲۸۷ |
| جسم کو حرارت پہونچانے کے اعتبار سے لباس خوراک کی ایک خاص مقدار کا کام دیتا ہے۔ | ؍؍ |
| بچّوں کے جسم کا گرم رکھنا اور بھی زیادہ ضروری ہی۔ اس امر کی تشریح مثالوں کے ذریعے سے | ۲۸۸ |
| بچّوں کو ناکافی لباس پہنانا سخت حماقت ہی | ۲۸۹ |
| لباس کے متعلق ڈاکٹر کوم کا تجویز کیا ہوا قاعدہ | ؍؍ |
| مائیں اپنے بچّوں کو اہلِ فرانس کی تقلید میں بھڑک دار لباس پہناتی ہیں جو ناکافی | |

باقیماندہ

# دیباچۂ مترجم

**تمہید** محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا سولھواں سالانہ اجلاس جو ہندوستان کے قدیم دارالسلطنت شہر دہلی میں ۲۷ دسمبر سنہ ۱۹۰۲ء سے ۴ جنوری سنہ ۱۹۰۳ء تک رہا پچھلے تمام اجلاسوں میں ایک خاص امتیاز رکھتا ہے۔ چوں کہ ان دنوں دہلی میں حضرت شاہنشاہ معظم ایڈورڈ ہفتم کے جشنِ تاجپوشی کی تقریب تھی۔ اس لئے یہ اجلاس اس قدر بارونق تھا کہ گزشتہ اجلاسوں میں اُس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ اس کانفرنس کے صدر انجمن ہز ہائینس سر آغا خاں تھے۔ اسی کانفرنس میں لارڈ کچنر بہادر کمانڈران چیف سر مائیکل ہکس بیچ سابق وزیر خزانہ انگلستان اور سر منچرجی بھاؤنگری ممبر پارلیمنٹ جیسے معزز اور مقتدر ارکان سلطنت برطانیہ نے شریک ہو کر مسلمانوں کے تعلیمی معاملات سے ہمدردی ظاہر کی اسی کانفرنس میں شمس العلماء مولانا خواجہ الطاف حسین حالی نے اپنی لاجواب نظم پڑھ کر سنائی جس کی یادگار میں مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے لئے دو ہزار روپیہ سے زیادہ چندہ

جمع ہو گیا۔ اسی کانفرنس میں کانفرنس کی تجاویز پر پوری طرح عمل کرنے کے لئے خاص انتظام کیا گیا۔ اسی کانفرنس میں مقاصد کانفرنس کو وسعت دی گئی۔ اور صیغۂ علمی صیغۂ اصلاح تمدن اور صیغۂ امور متفرقات کانفرنس کے ساتھ شامل کئے گئے۔

**انجمن اُردو کا قیام** صیغۂ علمی کی عملی کارروائی کا آغاز اس طرح ہوا کہ ۴ جنوری ۱۹۰۳ء کو کانفرنس کے ایک غیر معمولی اجلاس میں انجمن ترقی اُردو کی بنیاد قایم ہوئی۔ اور بزرگان ذیل اس کے عہدہ دار اور رکن قرار دیے گئے۔

(۱) ٹی۔ ڈبلیو۔ آرنلڈ صاحب ایم اے[۱] پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور — صدر انجمن

(۲) شمس العلماء ڈاکٹر مولانا نذیر احمد خاں صاحب ایل ایل ڈی — نائب صدر انجمن

(۳) شمس العلماء مولانا خواجہ الطاف حسین صاحب حالی — نائب صدر انجمن

(۴) شمس العلماء خان بہادر مولوی ذکاء اللہ صاحب — نائب صدر انجمن

(۵) شمس العلماء مولانا محمد شبلی نعمانی — سکرٹری

(۶) منشی حامد علی صاحب صدیقی — اسسٹنٹ سکرٹری

اس کے بعد ۸ اپریل ۱۹۰۳ء کو انجمن اُردو کا دستور العمل چھاپ کر شایع کیا گیا۔ چونکہ یہ ایک علمی انجمن ہے اور کسی مذہب و ملت سے اس کو کچھ سروکار نہیں ہے اس لئے ملک کے روشن خیال اور علم دوست احباب نے بلا تخصیص کسی فرقہ کے انجمن کے ساتھ ہمدردی ظاہر کی۔ اور سیکڑوں آدمیوں نے اُس کا رکن اعانت بننا منظور کر لیا۔

---

[۱] پروفیسر آرنلڈ صاحب حال ہی میں ہندوستان سے قطع تعلق کرکے ولایت چلے گئے ہیں اور ان کی جگہ مسٹر بیل صاحب ایم اے ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم پنجاب اپنی اعلیٰ علمی قابلیت اور راسخ ہمدردی کی وجہ سے جو ان کو اہل ملک کی تعلیمی ترقی کے ساتھ ہے صدر انجمن منتخب ہوئے ہیں۔ صاحب ممدوح نے اس سے پہلے ہی انجمن کا رکن اعزازی بن جانے کے رائے منظور کر لیا تھا۔

انجمن مذکور کا مقصد | انجمن کا بڑا مقصد یہ ہے کہ اُردو زبان کو علمی حیثیت سے ترقی دی جائے اور فضول کتابوں کا جو ذخیرہ آئے دن بڑھتا جاتا ہے۔ اُس کو روکا جائے مختلف علوم و فنون کی عمدہ عمدہ اور مفید کتابیں انگریزی، عربی وغیرہ سے اُردو میں ترجمہ اور تالیف کرائی جائیں اور اس طرح ملک میں علم کا صحیح مذاق پیدا کیا جائے۔

"ایجوکیشن" کے ترجمہ کا عام اشتہار | جون ۱۹۰۳ء میں انجمن نے چند کتابوں کے ترجمہ کا ایک عام اشتہار دیا اور یہ شرط قرار دی کہ جو لوگ اُن میں سے کسی کتاب کا ترجمہ کرنا چاہیں اس کے ابتدائی دس صفحوں کا ترجمہ بطور نمونہ سکرٹری صاحب کے پاس بھیج دیں۔ جس شخص کا ترجمہ پسند ہوگا اُس سے تمام کتاب کا ترجمہ کرایا جائے گا۔ ان کتابوں میں سے ایک مشہور و معروف فلسفی ہربرٹ سپنسر کی کتاب "ایجوکیشن" تھی۔ اس کتاب کے ترجمے کے متعلق انجمن نے جو رائے قایم کی ہے وہ سکرٹری صاحب کی سالانہ رپورٹ سے واضح ہوتی ہے جس کا اقتباس ذیل میں درج ہے:۔

"یہ کتاب مشہور فلاسفر ہربرٹ سپنسر کی تصنیف ہے جس کا موضوع تعلیم ہے یہ کتاب اس رتبہ کی ہے کہ اگر انجمن اُردو کی طرف سے صرف یہی ایک کتاب ترجمہ ہو کر شایع ہوتی تو انجمن مبارک باد کی مستحق تھی۔ چوں کہ یہ کتاب ایک معرکۃ الآراء کتاب تھی اس لئے اس کے ترجمہ میں نہایت احتیاط سے کام لیا گیا۔ ترجمہ کا عام اشتہار دیا گیا۔ اور ہندوستان کے مختلف حصّوں سے پانچ ترجمے آئے۔ یہ تمام ترجمے شمس العلماء ڈاکٹر مولوی نذیر احمد صاحب۔ خان بہادر شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ صاحب۔ شیخ محمد اقبال صاحب ایم اے۔ مسٹر آرنلڈ صاحب پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور اور دیگر ممبروں کے پاس اظہار رائے کے لئے بھیجے گئے

باتفاق آرا، مولوی غلام الحسنین پانی پتی کا ترجمہ پسند کیا گیا۔[۱]

اس ترجمہ کی نسبت بعض بزرگوں کی رائیں کتاب کے آخر میں درج ہیں۔[۲]

**کتاب کی تقسیم** قبل اس کے کہ ترجمہ کی بابت کچھ تحریر کیا جائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اصل کتاب "ایجوکیشن" کے مضامین کا ایک مختصر سا خاکہ کھینچ دیا جائے۔ تاکہ مصنّف کے خیالات کا ایک عام نقشہ ناظرین کے ذہن میں جم جائے اور مطالب کتاب کے سمجھنے میں سہولت ہو۔ مصنّف نے اپنی کتاب کو چار بابوں میں تقسیم کیا ہے پہلا باب بطور مقدمۂ کتاب کے ہے دوسرے باب میں تعلیم عقلی، تیسرے میں تعلیم اخلاقی اور چوتھے میں تعلیم جسمانی سے بحث کی گئی ہے۔

**باب اوّل کا خلاصہ** باب اوّل کا عنوان یہ ہے "کون سا علم سب سے زیادہ قیمتی ہے"؟ اس میں اوّل یہ بتایا ہے کہ لوگ معاملہ میں آرائشی اور نمائشی چیزوں کو مفید اور ضروری چیزوں پر ترجیح دیتے ہیں اور تعلیم و تربیت میں بھی اسی قاعدہ کی پابندی کی جاتی ہے۔ بچوں کو مفید اور کارآمد علوم کی تعلیم نہیں دی جاتی۔ بلکہ ایسے علوم سکھائے جاتے ہیں جن کو عوام الناس عمدہ خیال کرتے ہیں۔ اس سے تعلیم کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ جو بچے اس قسم کی تعلیم پاتے ہیں وہ بڑے ہو کر اپنے فرائض کو کما حقہ ادا نہیں کر سکتے۔

اس کے بعد مشاغل زندگی کو بہ لحاظ اُن کی عظمت و ضرورت کے پانچ حصّوں میں تقسیم کیا ہے۔

---

[۱] دیکھو سالانہ رپورٹ انجمن ترقی اردو بابت ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۲۔ مرتبہ شمس العلما مولوی شبلی نعمانی ناظم سررشتہ علوم و فنون حیدرآباد دکن [۲] ان کو طبع ثانی میں حذف کر دیا گیا ہے۔

(۱) وہ کام جو "بلا واسطہ حفاظت نفس" میں مدد دیتے ہیں۔ مثلاً چوٹ ٹکر وغیرہ کے صدمہ سے اپنے آپ کو بچانا۔

(۲) وہ کام جو "با لواسطہ حفاظت نفس" میں مدد دیتے ہیں یعنی اپنی ضروریات زندگی بہم پہنچانا۔

(۳) وہ کام جو اولاد کی تعلیم و تربیت سے متعلق ہیں۔

(۴) وہ کام جو فرائض تمدن اور باہمی معاشرت سے متعلق ہیں۔

(۵) وہ کام جو شخصی تفریح اور حظ نفس سے متعلق ہیں۔

ان پانچوں مشاغل کی اضافی قدر و قیمت کا بیان کرکے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ بچوں کو ان پانچوں چیزوں کی تعلیم ایک مناسب اندازہ کے ساتھ دینی چاہیے یعنی جو امور "کامل معاشرت" میں زیادہ ممد و معاون ہوں اُن کی تعلیم زیادہ دی جائے اور جن کو "کامل معاشرت" سے کم تعلق ہو اُن پر نسبتہً کم توجہ کی جائے۔

اس کے بعد تعلیم کی ان پانچوں شاخوں پر علیحدہ علیحدہ نہایت شرح و بسط کے ساتھ عالمانہ اور محققانہ بحث کی ہے جس کی ضمن میں بیسیوں مفید اور کارآمد باتیں اور مختلف علوم کے مسائل ضمناً آگئے ہیں۔ یہاں ان کا مجمل بیان کیا جاتا ہے۔

تعلیم کی پہلی شاخ یعنی "بلا واسطہ حفاظت نفس" کے متعلق لکھا ہے کہ اس کا انتظام قدرت نے زیادہ تر اپنے ہی ہاتھ میں رکھا ہے۔ بچہ ابتدا سن تمیز سے خود بخود اُن چیزوں سے بچتا ہے جن سے صدمہ پہنچنے کا اندیشہ ہوتا ہے مثلاً کسی اجنبی آدمی یا جانور سے بچنا۔ سخت اور تیز اور نوک دار چیزوں سے بچنا۔ جیسے اینٹ، پتھر، چاقو، چھری وغیرہ۔ اس لیے اس تعلیم پر زیادہ توجہ

کی ضرورت نہیں۔ مگر "بلا واسطہ حفاظت نفس" کی ایک اور قسم بھی ہے
مثلاً وہ امراض اور تکالیف جو آہستہ آہستہ کام تمام کر دیتی ہیں۔ ان سے
ضرور بچنا چاہیئے۔ اس کے بعد بیماری کے نقصانات بیان کر کے
اس بات پر زور دیا ہے کہ قوانین صحت کی واقفیت ہر شخص کے لیئے لازمی
ہے۔ اور فزیالوجی (علم الاعضاء) کو نصاب تعلیم میں داخل کرنا ضروری
ہے تعلیم کی دوسری شاخ یعنی "بالواسطہ حفاظت نفس" جس کا
مقصد حصول معاش ہے اس پر بھی مفصل بحث کی ہے۔ اور یہ ثابت کیا ہے
کہ زندگی کے تقریباً تمام کاموں میں سائنس کی واقفیت
نہایت ضروری ہے مثلاً صنعت و حرفت کے کاموں میں
حساب کی ضرورت ہے۔ فن تعمیر، نجاری، پیمائش اور ریلوے کے
تمام کاموں میں علم ہندسہ کی ضرورت ہے۔ تمام دستکاریوں کا دارو
مدار علم جرثقیل پر ہے علم الحرارت۔ علم مناظر و مرایا۔ علم برق
علم مقناطیس اور علم کیمیا کے حیرت انگیز کرشمے طرح طرح کی صنعت و
حرفت میں مدد دیتے ہیں علم ہیأت۔ علم طبقات الارض علم الحیوا
علم المعاشرت کو بھی صنعت و حرفت سے بہت کچھ تعلق ہے۔ غرض کہ
ہر ایک کام اور پیشہ میں سائنس کی واقفیت نہایت ضروری ہے۔ اور
روز بروز اس کی ضرورت بڑھتی جاتی ہے۔ اس لئے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ
سائنس کی کافی تعلیم مدارس کے نصاب میں ضرور داخل
ہونی چاہیئے۔
تعلیم کی تیسری شاخ "تربیت اولاد" پر بحث کرتے ہوئے یہ دکھایا ہے کہ

والدین عموماً اولاد کی تربیت کے اُصول سے بالکل ناواقف اور غافل ہیں۔ اس ناواقفیت اور غفلت سے جو خوفناک اور مضر نتائج آئندہ نسلوں کی جسمانی۔ عقلی اور اخلاقی حالت پر مترتب ہوتے ہیں۔ اُن کو نہایت موثر اور درد انگیز الفاظ میں بیان کیا ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ بچوں کی قسمت کا بنانا یا بگاڑنا بہت کچھ والدین ہی کے اختیار میں ہے۔ آخر میں یہ بتایا ہے والدین کو فزیالوجی (علم الاعضاء) اور سائیکالوجی (علم النفس) سے تھوڑی بہت واقفیت ضرور ہونی چاہیئے۔

تعلیم کی چوتھی شاخ یعنی فرائض تمدن کے ضمن میں علم تاریخ پر مفصل بحث کی ہے اور یہ دکھایا ہے کہ جو تاریخیں مدرسوں میں پڑھائی جاتی ہیں وہ عموماً بے کار اور فضول واقعات سے پر ہوتی ہیں جن کے پڑھنے سے بچوں کو فرائض تمدن کے ادا کرنے میں کسی قسم کی ہدایت حاصل نہیں ہوتی۔ اس کے بعد یہ بتایا ہے کہ تاریخ کی کتابوں میں کس کس قسم کے واقعات درج ہونے چاہئیں اور پھر یہ ثابت کیا ہے کہ سائنس کے بغیر علم تاریخ محض بے کار ہے۔ اور تاریخ کی کنجی سائنس ہی ہے۔

تعلیم کی سب سے آخری شاخ یعنی مشاغل تفریح۔ جن میں مصوّری موسیقی، شاعری وغیرہ داخل ہیں۔ ان کو باقاعدہ حاصل کرنے کے لئے بھی سائنس کی سخت ضرورت ہے۔ اس بحث کو تفصیل کے ساتھ مدلل بیان کیا ہے اور اس کی توضیح کے لئے مثالیں بھی دی ہیں۔ شاعری کی بحث میں مصنف نے ایک نہایت عمدہ اور صحیح خیال ظاہر کیا ہے۔ جو عام اذہان سے بالاتر ہے کہ "سائنس بجائے خود شاعری ہے" اور

اپنے دعوی کا نہایت عمدہ اور دلچسپ ثبوت دیا ہے۔

تعلیم کی پانچوں شاخوں پر بالتفصیل بحث کرنے کے بعد مصنّف نے ایک نہایت ہی ضروری مضمون پر قلم اُٹھایا ہے۔ یعنی "زبان اور سائنس کا مقابلہ" اس مقابلہ میں سائنس کی تعلیم کو زبان کی تعلیم پر نہایت قوی دلائل کے ساتھ ہر ایک اعتبار سے فوقیت دی ہے۔ اور ثابت کر دیا ہے کہ سائنس کی تعلیم قوت حافظہ اور قوت فیصلہ دونوں کو ترقی دیتی ہے۔ اس سے عقلی اور اخلاقی تعلیم بلکہ مذہبی تعلیم بھی حاصل ہوتی ہے۔ سائنس کی مذہبی حیثیت پر خاص کر بہت عمدہ بحث کی ہے اور یہ بات بخوبی ثابت کی ہے کہ سائنس بے دینی کی تعلیم نہیں دیتا بلکہ سائنس سے غفلت کرنی بے دینی ہے سائنس اس امر کو تسلیم کرتا ہے کہ علّت العلل کی حقیقت کا ادراک انسانی عقل بلکہ خیال و قیاس سے بھی برتر ہے۔ یہ بحث خاص کر آج کل کے نئے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لئے مفید اور قابل غور ہے۔

ان تمام مباحث کے بعد باب اوّل کے خاتمہ میں اُس سوال کا جواب دیا ہے جو اس باب کے عنوان پر درج ہے۔ یعنی "کونسا علم سب سے زیادہ قیمتی ہے"؟ اور وہ جواب یہ ہے کہ "سائنس ہی سب سے زیادہ قیمتی علم ہے"! زندگی کے پانچوں مشاغل کے لئے سائنس نہایت ضروری ہے۔ یہاں تک کہ عقلی و اخلاقی و مذہبی تعلیم کے لئے بھی سب سے زیادہ قیمتی علم سائنس ہی ہے اور تہذیب و تمدّن کا وجود ہی سائنس کی بدولت ہے۔

باب دوم کا خلاصہ

**باب دوم** میں عقلی تعلیم سے بحث کی گئی ہے تمہید میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ **ہر ایک زمانہ کا طریقہ تعلیم و تادیب اس زمانہ کی معاشرت کے موافق ہوتا ہے**۔ جس زمانہ میں بادشاہ مطلق العنان ہوتے تھے اور عام طور پر خود مختاری کا دور دورہ تھا اور خفیف جرموں پر سخت سزائیں ملتی تھیں۔ اُس زمانے میں مدارس کی تادیب بھی ویسی ہی سخت ہوتی تھی۔ مگر آج کل جس طرح بادشاہوں کے اختیارات محدود اور رعایا کی آزادی زیادہ ہو گئی ہے۔ اسی طرح معلّموں کے اختیارات بھی کم ہو گئے ہیں۔ اور بچّوں کی تعلیم و تربیت میں سخت گیری کم ہونے لگی ہے۔

اس کے بعد یہ بحث کی ہے کہ یہ جو آج کل تعلیم کے بہت سے جدید طریقے پیدا ہو گئے ہیں اور ہر شخص اپنے طریقہ کی حمایت اور دوسرے طریقوں کی مذمّت کرتا ہے، یہ بات درحقیقت مفید ہے، کیونکہ ہر ایک طریقہ میں جتنی غلطی ہے وہ بحث و مباحثہ کے بعد رفتہ رفتہ دور ہو جائیگی اور جتنی خوبی ہے وہ عام طور پر تسلیم کر لی جائیگی اور آخرکار ایک صحیح اور کامل طریقہ تعلیم پر سب کا اتفاق ہو جائیگا۔

مصنّف نے اس کے بعد ایک عام عام قاعدہ بیان کیا ہے کہ **ایک غلطی کے دور ہو جانے کے بعد دوسری متضاد غلطی کو کچھ عرصہ تک عروج حاصل ہو جاتا ہے**۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ صرف جسم کی پرورش میں لوگ ہمہ تن مصروف اور عقلی تربیت سے غافل رہتے تھے۔ پھر وہ زمانہ آیا کہ لوگوں نے جسمانی تربیت سے غفلت کر کے صرف عقلی تربیت کو اپنا مقصد قرار دیا۔ اب وہ وقت آگیا ہے کہ لوگ ان

دونوں متضاد طریقوں کو جو افراط و تفریط سے خالی نہیں ہیں سمجھنے اور جسم اور نفس دونوں کی غور و پرداخت کرنے لگے ہیں۔

اس بحث کے بعد تعلیم کے قدیم اور جدید طریقوں کا باہم موازنہ کرکے جدید طریقہ کی فوقیت مفصل طور پر ظاہر کی ہے اور قوت مشاہدہ کو باقاعدہ ترقی دینے کی عظمت و ضرورت ثابت کرکے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ہر ایک علم و ہنر میں ترقی حاصل کرنے کے لیے کامل مشاہدہ نہایت ضروری اور کامیابی کا جزو اعظم ہے۔ اسی ضمن میں ملک سوئٹزرلینڈ کے ایک مشہور شخص پستالوزی کے مجوزہ طریقہ تعلیم کی تنقید اور اوس کے حسن و قبح پر مفصل بحث کی ہے بعد ازاں عقلی تعلیم کے سات اصول لکھے ہیں جن کے موافق بچوں کی تعلیم و تربیت ہونی لازم ہے۔

اس کے بعد یہ بتایا ہے کہ تعلیم زمانہ شیرخواری ہی سے شروع ہو جانی چاہیے۔ مثلاً رنگ، روشنی اور آواز کی مختلف قسموں سے شیرخوار بچوں کو واقفیت پیدا کرانا۔ جب بچہ کسی قدر بڑا ہو جائے تو اسی سلسلہ میں اُس کو اسباق الاشیا کی تعلیم دینی چاہیے۔ اس تعلیم کے طریقہ اور فوائد پر مفصل بحث کرکے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہی سبق تمام آیندہ علم کی بنیاد ہیں۔ یہی تعلیم بچہ کو سائنس کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔

اسباق الاشیا کے بعد مصوری کی تعلیم اور اوس کی ضرورت کا بیان ہے اور مصوری کی تعلیم کا طریقہ اور اُس کے فوائد بتا کر مصوری کے مروجہ طریقہ تعلیم کی خرابیاں دکھائی ہیں۔ اس کے بعد ہندسہ عملی اور ہندسہ عقلی کی تعلیم اور اُن کے فوائد پر شرح و بسط کے ساتھ بحث کی ہے

اس کے ساتھ ہی علم ہندسہ کو بچوں کے لئے دل کش بنانے کا طریقہ بھی بیان کیا ہے۔

آخر میں تعلیم کے دو ضروری اصول جن پر عموماً بہت کم توجّہ کی جاتی ہے، بیان کئے ہیں۔ یعنی

**اوّل۔** طریقۂ تعلیم ایسا ہونا چاہیے جس سے نفس کی تربیت خود بخود ہو سکے اور معلم یا والدین کی مدد کی ضرورت بہت کم ہو۔

**دوم۔** تعلیم سے بچوں کو خوشی حاصل ہو اور تحصیل علم ان کے لئے ناگوار نہ ہو۔

اس کے بعد ان اصولوں کی عظمت و منفعت پر نہایت تفصیل اور خوبی کے ساتھ بحث کر کے باب دوم کو ختم کیا ہے۔

باب سوم کا خلاصہ

**باب سوم** میں اخلاقی تعلیم کا بیان ہے۔ اوّل یہ بحث اٹھائی ہے کہ مدارس کے نصاب تعلیم کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ اخلاقی تعلیم اس میں داخل نہیں کی گئی اور اخلاقی تعلیم کی خرابی کو والدین اور خاص کر ماؤں کی غفلت یا ناواقفیت سے منسوب کیا ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے بچوں کو کبھی کچھ حکم دیتے ہیں اور کبھی کچھ۔ بچوں کو اس بات کا پتہ نہیں لگتا کہ ہم کو کیا کرنا چاہیے اور کیا نہ کرنا چاہیے۔ اس کے بعد یہ بیان کیا ہے کہ والدین کی طبیعت کی اصلاح ہوتے ہوتے ہو گی۔ کیونکہ کسی معاملہ کی اصلاح یک لخت نہیں ہو سکتی، ترقی ہمیشہ آہستہ آہستہ اور بتدریج ہوا کرتی ہے۔ بعد ازاں بچوں کے ساتھ والدین کے عام برتاؤ اور ان کی سخت گیری کی چند مثالیں دے کر یہ بات ثابت کی

ہے کہ جب تک والدین کا اخلاق عمدہ نہ ہو اولاد سے نیک اخلاقی کی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔ اس کے ساتھ ہی اس مسئلہ پر بحث کی ہے کہ "آباؤ اجداد کے خصائل اُن کی اولاد کو وراثتہً پہنچتے ہیں"۔ اخلاقی تعلیم قوم کی عام خصلت اور انسانی فطرت کی عام حالت کے موافق ہوتی ہے۔ سخت آدمیوں کے ساتھ سخت اور نرم آدمیوں کے ساتھ نرم برتاؤ کیا جاتا ہے اکھڑ اور ناشائستہ لوگوں کو اُن کے قصوروں پر سخت اور بھاری سزائیں اور نرم اور شائستہ لوگوں کو نرم اور خفیف سزائیں دی جاتی ہیں جب قوم عام طور پر اکھڑ اور درشت مزاج ہوتی ہے تو بچوں کی طینت بھی اسی قسم کی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی تعلیم و تربیت میں زیادہ سختی کی ضرورت پڑتی ہے برعکس اس کے جوں جوں قوم کے عادات و خصائل شائستہ اور معقول ہوتے جاتے ہیں بچوں کی تعلیم و تربیت میں بھی اسی نسبت سے نرمی برتی جاتی ہے۔

اِن تمہیدی بیانات کے بعد اصل مقصد کی طرف رجوع کی ہے اور یہ دکھایا ہے کہ قدرت بچّہ کو کیونکر تربیت کرتی ہے۔ والدین کو بھی اس طریقہ کی پیروی لازم ہے یعنی بچّوں کو اُن کے قصوروں پر قدرتی سزائیں دینی چاہییں نہ کہ مصنوعی۔ قدرتی سزاؤں کی خصوصیتوں پر مفصل بحث کی ہے۔

اِس کے بعد تربیت اخلاق کے قدرتی طریقہ کی چند عام فہم مثالیں دی ہیں اور قدرتی اور مصنوعی سزاؤں کا فرق اچھی طرح سمجھایا ہے

بعدازاں قدرتی طریقۂ تربیت کے چار فائدے بیان کرکے اس امر کا فیصلہ کر دیا ہے کہ بچوں کا قصور خفیف ہو تو اور سخت ہو تو، دونوں صورتوں میں ہمیشہ قدرتی طریقہ پر کاربند رہنا چاہیئے۔ آخر میں بچوں کے ساتھ سختی کرنے کے مضر نتائج بیان کئے ہیں اور اس بارہ میں سرجان لاک وغیرہ کی رائیں لکھی ہیں اور اخلاقی تربیت کے متعلق آٹھ نصیحتیں لکھ کر اس باب کو ختم کیا ہے۔ یہ نصیحتیں گویا تمام باب کا خلاصہ اور عملی ہدایتوں کا مجموعہ ہیں۔

باب چہارم کا خلاصہ

باب چہارم میں تعلیم جسمانی سے بحث کی گئی ہے۔ اس مضمون کی تمہید اس طرح اٹھائی گئی ہے کہ ہر طبقہ کے لوگ حیوانات کی پرورش اور اُن کی نسل بڑھانے کا بہت کچھ شوق رکھتے ہیں، مگر اپنے بچوں کی پرورش اور اُن کے رکھ رکھاؤ کی طرف سے عموماً غافل ہیں پھر جسمانی تربیت کی ضرورت جتا کر یہ بحث کی گئی ہے کہ اس کا انتظام سائنس کے مسلمہ حقائق کے موافق ہونا چاہیئے۔ اس کے بعد پُرخوری اور کم خوری کے عیوب بیان کرکے یہ ثابت کیا ہے کہ کم خوری بہ نسبت پُرخوری کے زیادہ مضر ہے۔ بچوں کی کھانے پینے کی روک ٹوک ہرگز نہیں کرنی چاہیئے، بلکہ اس معاملہ کو اُن کی طبیعت پر چھوڑ دینا چاہیئے تاکہ وہ اچھی طرح سیر ہو کر کھانا کھائیں۔ کیونکہ اشتہا ہی انسان اور حیوان دونوں کے لئے عمدہ رہبر ہے۔

اس کے بعد یہ بحث کی ہے کہ مقوی اور غیر مقوی خوراک کا اثر حیوانات پر کیا ہوتا ہے۔ اس کی بہت سی مثالیں دی ہیں اور اس بحث سے حسب

ذیل نتائج نکالے ہیں:-

اوّل- بچوں کی خوراک، عمدہ، مقوی، اور زود ہضم ہونی چاہیئے۔

دوم- خوراک اول بدل کر دینی چاہیئے- اور دستر خوان پر کئی طرح کی چیزیں ہونی چاہئیں۔

سوم- خوراک بہت کافی ہونی چاہیئے۔

خوراک کے بعد لباس پر بحث کی ہے اور بچوں کو ناکافی لباس پہنانے کے نقصانات بیان کر کے لباس کی بابت یہ چار ہدایتیں لکھی ہیں۔

(۱) لباس نہ تو اس قدر زیادہ ہونا چاہیئے کہ بدن میں شدید حرارت پیدا ہو جائے اور نہ اس قدر کم کہ سردی معلوم ہو۔

(۲) لباس مہین کپڑے کا نہیں ہونا چاہیئے بلکہ دبیز کپڑے کا ہونا چاہیئے۔

(۳) مضبوط ہونا چاہیئے کہ نہ زیادہ گھسے اور نہ زیادہ پھٹے۔

(۴) رنگ پکا ہونا چاہیئے کہ جلد نہ اُڑ جائے۔

لباس کے بعد ورزش کی بحث شروع کی ہے- اس میں اوّل یہ بتایا ہے کہ لڑکوں کی ورزش پر تو لوگ توجہ کرنے بھی لگے ہیں- مگر لڑکیوں کی ورزش سے اب تک غافل ہیں- اس کے بعد اُن اعتراضات کو دفع کیا ہے جو لڑکیوں کی ورزش پر عموماً کئے جاتے ہیں- اسی ضمن میں کھیل کود کے فائدے اور جمناسٹک کے نقصانات بیان کر کے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اگر کھیل کود کے ساتھ کسی قدر جمناسٹک کی جائے تو وہ مفید ہو سکتی ہے مگر کھیل کود کو ترک کر کے جمناسٹک پر ورزش کا دار و مدار

رکھنا مضر ہے"

اس کے بعد ایک نہایت ضروری سوال اُٹھایا ہے کہ "نئی تانتی کی طاقت اور اُس کا اُٹھان رو بہ تنزل ہے" اس کے متعدد اسباب بیان کئے ہیں۔ مگر خاص سبب "دماغی محنت کی کثرت" قرار دیا ہے۔ یہ امر تمام اہل ملک اور خاص کر اُن لوگوں کے لئے قابل غور ہے جو یونیورسٹی کی تعلیم کو اپنی زندگی کا مقصد سمجھ لیتے ہیں اور سب کام چھوڑ کر اُسی کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔

اس کے بعد مصنف نے کثرت مطالعہ کے مضر نتائج۔ جو جسم اور صحت پر مترتب ہوتے ہیں۔ نہایت خوبی اور تفصیل کے ساتھ بیان کئے ہیں اور بہت سی چشم دید مثالوں مدارس کے دستور العملوں اور نیز اپنے ذاتی تجربہ سے اس بیان کو مدلل کیا ہے۔ اسی ضمن میں طوطے کی طرح حفظ یاد کر لینے کے پانچ نقصان نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کر کے یہ لکھا ہے کہ یہ جابرانہ طریقہ تعلیم بہ نسبت مردوں کے عورتوں کے حق میں زیادہ مُضر ہے جس کی وجہ سے تعلیم یافتہ عورتیں عموماً زرد رو اور بدشکل ہو جاتی ہیں اور اُن کا فائدہ باقاعدہ نہیں ہوتا۔ اسی بحث میں یہ بات جتا دی ہے کہ مرد، عورتوں کی علمی لیاقت پر گرویدہ نہیں ہوتے۔ بلکہ زیادہ تر اُن کے جسمانی حُسن اور اخلاقی قابلیتوں پر مائل ہوتے ہیں۔ اس لئے عورتوں کو اس قدر عقلی تعلیم دینا جس سے اُن کے نمو اور صحت کو نقصان پہنچے۔ سخت غلطی ہے اعلیٰ تعلیم ضرور ایک عمدہ شے ہے۔ بشرطیکہ اس سے کوئی جسمانی

نقص پیدا نہ ہو۔

آخر میں بتایا ہے کہ بچوں کی جسمانی تربیت میں عموماً چار نقص پائے جاتے ہیں یعنی:۔

اوّل۔ بچوں کو ناکافی خوراک دی جاتی ہے۔

دوم۔ ناکافی لباس پہنایا جاتا ہے۔

سوم۔ ناکافی ورزش کرائی جاتی ہے (کم از کم لڑکیوں سے)

چہارم۔ عقلی محنت بہت زیادہ لی جاتی ہے۔

اس باب کے خاتمہ پر یہ ہدایت کی ہے کہ صحت کا قایم رکھنا انسان کا فرض ہے، اور قوانین صحت کی تمام خلاف ورزیاں جسمانی گناہ ہیں۔

ترجمہ کی خصوصیتیں

مضامین کتاب کا خاکہ کھینچنے کے بعد ترجمہ کی بعض خصوصیتوں کا کسی قدر حال بیان کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً

(۱) ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنے کی عموماً دو صورتیں ہوتی ہیں ایک یہ کہ لفظی رعایت قایم رہے، اور لفظ کے مقابلہ میں لفظ رکھ دیا جائے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ لفظی رعایت کو نظر انداز کرکے صرف اس بات کا التزام کیا جائے کہ مصنّف کا خیال اپنی عبارت میں ادا ہو جائے۔ اگر پہلے اصول کی پوری پابندی کی جائے تو ترجمہ بامحاورہ اور عام فہم نہیں ہو سکتا۔ خاص کر عالمانہ اور فلسفیانہ تصانیف کا ترجمہ تو بالکل مغلق اور چیستان بن جاتا ہے لیکن اگر دوسرے اصول کو اختیار کیا جاسے تو مصنف کا مطلب بہت کچھ صاف اور واضح ہو سکتا ہے اور اس کے سمجھنے میں چنداں دقت باقی نہیں رہتی۔ مگر اس صورت میں ایسے ترجمہ پر مشکل ہی سے ترجمہ کا اطلاق ہو سکتا ہے

کیونکہ وہ ایک قسم کی تالیف ہو جاتی ہے۔ چوں کہ "انجمن ترقی اُردو" کا یہ مقصد تھا کہ "ایجوکیشن" کا ترجمہ کیا جائے نہ یہ کہ اُس کے مطلب کو اپنی عبارت میں ادا کیا جائے اِس لئے میں نے اِس ترجمہ میں بین بین طریقہ اختیار کیا ہے یعنی لفظی رعایت کو حتی الامکان ہاتھ سے نہیں دیا" اور ساتھ ہی اس بات کی کوشش کی ہے کہ عبارت اُردو روزمرّہ کے خلاف نہ ہو۔

(۲) اگرچہ ترجمہ میں آزادانہ تصرف نہیں کیا اور لفظی رعایت کو تا بمقدور ہاتھ سے نہیں دیا۔ تاہم محض زبان کے اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ ترجمہ بقول بعض اہل الرائے کے عام طور پر بجائے خود ایک اصل تصنیف معلوم ہوتی ہے اور بادی النظر میں یہ خیال پیدا نہیں ہوتا کہ یہ کسی انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے۔

(۳) ترجمہ میں کہیں کہیں انگریزی اسلوب بیان کو قصداً قایم رکھا ہے۔ تاکہ اُردو زبان میں عالمانہ اور فلسفیانہ خیالات کے ادا کرنے کی قوت اور وسعت پیدا ہو۔ اس مقصد کے پورا کرنے کے لئے اپنی طرف سے الفاظ کے اضافہ کی ضرورت محسوس ہوئی ہے جن کو عموماً خطوط وحدانی میں لکھ دیا ہے۔

(۴) نہ صرف مصنّف کے خیالات کو بامحاورہ اُردو میں ادا کرنے کی کوشش کی گئی ہے بلکہ حتی الامکان اُس کی طرز تحریر اور زور قلم کو بھی قایم رکھا گیا ہے۔ اگرچہ اس امر کا پورا پورا التزام مترجم کی قدرت سے باہر تھا۔ مگر پروفیسر مولوی محمد اقبال صاحب ایم اے کا یہ خیال کہ "اس ترجمہ میں ہربرٹ سپنسر کی جھلک نظر آجاتی ہے" ظاہر کرتا ہے کہ مترجم کو اس مقصد میں ایک حد تک کامیابی ہوئی ہے۔

(۵) اصل کتاب میں مختلف علوم و فنون کی سینکڑوں اصطلاحیں اور ہزاروں الفاظ ایسے آئے ہیں جن سے اس ملک کے انگریزی دانوں کے کان عموماً ناآشنا

ہیں اور اُردو میں اُن کے لئے مناسب الفاظ موجود نہیں ہیں۔ اس لئے ایسے الفاظ و مصطلحات کا سمجھنا اور پھر اُن کے لئے عربی، فارسی کے موزوں الفاظ تلاش یا وضع کرنا مترجم کے لئے ایک بہت مشکل کام تھا، مگر خدائے تعالیٰ کے فضل و کرم سے یہ دقت رفع ہو گئی اور انگریزی الفاظ اس ترجمہ میں اس قدر کم ہیں کہ گویا نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ان میں سے اکثر انگریزی الفاظ تو پہلے ہی سے اُردو میں عام طور پر مستعمل ہیں ان کے علاوہ چند گنتی کے انگریزی لفظ ہیں جو ضرورتاً استعمال کرنے پڑے ہیں۔ مگر ایسے تمام الفاظ کی مفصل تشریح ذیلی حاشیوں (فٹ نوٹوں) میں جا بجا کر دی گئی ہے ترجمہ شروع کرنے سے پہلے مصنف کا دیباچہ پڑھ کر معلوم ہوا تھا کہ "ایجوکیشن" کا ترجمہ عربی میں ہو چکا ہے مگر باوجود تلاش کے عربی ترجمہ دستیاب نہ ہو سکا۔ اگر یہ ترجمہ بہم پہنچ جاتا تو مجھے اُردو ترجمہ کرنے میں کسی قدر سہولت ہوتی۔ اور اکثر اصطلاحات کے لئے بہتر الفاظ مل جاتے۔

(۶) اصل کتاب میں ہر باب کا مضمون مسلسل چلا جاتا ہے۔ اور اُس کی تقسیم نہیں کی گئی۔ ترجمہ میں یہ بات مناسب خیال کی گئی کہ ہر فقرہ (پیرے) کے شروع میں ایک حاشیہ کی سرخی (مارجنل نوٹ) بطور خلاصہ مضمون قائم کر دی جائے۔ تاکہ ناظرین کو مطالب کے سمجھنے اور ذہن نشین رکھنے میں مدد ملے اور ایک نظر ڈالنے سے مضمون کا نقشہ دل میں اُتر آتے۔ ان سرخیوں کے قایم کرنے میں، جن کی تعداد دو سو پچاس کے قریب ہے مترجم کو بہت کچھ محنت اُٹھانی پڑی ہے۔ اُمید ہے کہ ان کی وجہ سے ناظرین کو مطالعہ کتاب کے وقت فہم مطالب میں پوری مدد ملے گی۔

(۷) حاشیہ کی سرخیوں کے علاوہ جا بجا ذیلی حاشیے (فٹ نوٹ) دیئے گئے ہیں جن میں اکثر تاریخی نوٹ ہیں یعنی جن مشہور اشخاص کا نام کتاب میں آیا ہے

اُن کا مختصر سا حال لکھ دیا گیا ہے اور بعض حاشیوں میں مطالب متن کی تشریح کی گئی ہے
مصنف کے نوٹ اصل کتاب میں تین چار ہی ہیں۔ ان نوٹوں کے سوا باقی نوٹ مترجم
نے اپنی طرف سے اضافہ کئے ہیں۔

(۸) ترجمہ کے شروع میں ایک مفصل اور مسلسل فہرست مضامین اضافہ کی گئی ہے
ایسی فہرست مضامین کتاب میں نہیں ہے بلکہ اس کے آخر میں ایک انڈکس (فہرست
مضامین بہ ترتیب حروف تہجی) ہے اس انڈکس کا ترجمہ اُردو میں بے کار تھا۔ جدید انڈکس
تیار کرنے کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ یہی فہرست جو ترجمہ میں اضافہ کی گئی کافی ہے۔

(۹) کسی کتاب کے پڑھتے وقت مصنف کے حالات معلوم کرنے کی خواہش قدرتی طور پر
دل میں پیدا ہوتی ہے' ناظرین کے اس اشتیاق کو پورا کرنے کے لئے مصنف کا تذکرہ
بھی ترجمہ کے ساتھ لگا دیا گیا ہے، یہ تذکرہ مختلف اخبارات و رسائل کے مطالعہ کے بعد
ترتیب دیا گیا ہے، جس میں ہربرٹ سپنسر کی تعلیم و تربیت۔ اُس کی تصنیفات
انشا پردازی۔ علمی لیاقت۔ عادات و خصائل وغیرہ کا حال بیان کیا گیا ہے۔ اب
تک اُردو زبان میں ہربرٹ سپنسر کے حالات اس قدر تفصیل کے ساتھ قلم بند نہیں ہوئے

**مترجم کی خاص مشکلات** یوں تو ایک زبان سے دوسری زبان میں مطلب خیز ترجمہ کرنا کوئی
آسان کام نہیں ہے۔ مگر علمی و فلسفی اور خاص کر ہربرٹ سپنسر جیسے شخص کی تصانیف کا
ترجمہ کرنا سخت مصیبت ہے۔ اِس موقع پر چند خاص خاص دقتوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

(الف) ہربرٹ سپنسر کا علم نہایت وسیع۔ اس کی عام واقفیت غیر محدود۔ اور
خیالات نہایت گہرے ہیں۔ جب وہ کسی مضمون پر قلم اُٹھاتا ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ
اُس کے دل میں خیالات کا ایک دریا اُمڈا چلا آتا ہے اور پڑھنے والا اس دریا کی رَو
کے ساتھ بہتا چلا جاتا ہے۔ اُس کے فلسفیانہ مطالب کے سمجھنے کے لئے نہایت

خوض اور تعمق کی ضرورت ہی۔ اور اکثر حالتوں میں بغیر کامل غور و خوض کے اُس کے ایک جملہ کا ترجمہ بھی محال ہوتا ہے۔ یہی دقت "ایجوکیشن" کے ترجمہ میں شروع سے لے کر آخر تک پیش آتی ہے۔

(ب) اگرچہ اس کتاب کا مقصد "تعلیم" ہے۔ اور اس میں فلسفہ تعلیم سے بحث کی گئی ہے۔ تاہم اس میں بہت سے علوم و فنون کا ذکر ضمناً آگیا ہے۔ مثلاً

علم[1] النفس۔ علم[2] الحیواۃ۔ علم[3] الحیوانات۔ علم[4] الاعضاء۔ علم[5] المعاشرت علم[6] اللسان۔ علم[7] ہندسہ۔ علم[8] ہیئت۔ علم[9] مناظر و مرایا۔ علم[10] جر ثقیل۔ علم[11] طبیعی۔ علم[12] کیمیا۔ علم[13] طب۔ علم[14] تشریح الابدان۔ علم[15] الہیات۔ علم[16] اقتصاد فن[17] انجنیری۔ فن[18] مصوری۔ فن[19] بت تراشی۔ فن[20] موسیقی۔ فن[21] شاعری۔ فن[22] فصاحت و بلاغت فلسفہ[23] تاریخ۔ فلسفہ[24] حسن فلسفہ[25] اخلاق۔ فلسفہ[26] سیاست۔

ان علوم و فنون کی اصطلاحیں جابجا اس کتاب میں آئی ہیں۔ اور بعض علوم و فنون کے مسائل مجمل طور پر بیان ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پوری کامیابی کے ساتھ اس کا ترجمہ وہی شخص کر سکتا ہے جو علوم و فنون مذکورہ بالا میں ید طولےٰ رکھتا ہو۔ یا کم از کم ترجمہ کرنے سے پہلے اصل کتاب کے مطالب پر پوری طرح عبور حاصل کرے مترجم کو ان جملہ علوم و فنون کی پوری واقفیت تو کجا ابتدائی واقفیت کا بھی دعویٰ نہیں ہے البتہ اس بات کی پوری کوشش کی گئی ہے کہ مطالب کو اچھی طرح سمجھ کر کتاب کا ترجمہ حتی الامکان صاف اور با محاورہ اردو میں کیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس ترجمہ میں لفظ پر دقت کا سامنا تھا۔ اور جن صاحبوں کو انگریزی کی فلسفیانہ کتابوں کے

ترجمہ کا تجربہ ہے۔ وہ اس بات کو ضرور تسلیم کریں گے کہ بسا اوقات ایک ہی جملہ کا ترجمہ کرنے، اُردو میں ایک علمی اور سنجیدہ طرزِ بیان پیدا کرنے اور انگریزی کو اُردو کے قالب میں ڈھالنے کے لئے کئی کئی گھنٹے لگ گئے ہیں۔ بلکہ ایک مناسب اور موزوں لفظ کی تلاش میں بعض اوقات کئی کئی دن گزر گئے ہیں۔

(ج) ترجمہ میں بہت سی ایسی صورتیں پیش آئی ہیں جہاں لفظ کی جگہ لفظ رکھنے سے کام نہیں چل سکتا۔ بلکہ ایک لفظ کا مطلب ایک مرکب ناقص یا ایک جملہ میں ادا کرنا پڑتا ہے اور جب ایک لفظ کا مفہوم کئی کئی لفظوں میں ادا ہو تو عبارت کی سلاست اور مضمون کی روانی میں سخت خلل واقع ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے اِس لئے **نشست الفاظ** اور اُردو روزمرّہ کا خیال رکھنا، نا فرکلمات سے بچنا اور ایسے معترضہ جملوں سے پرہیز کرنا جو فہم مطالب میں مخل ہوں نہایت سخت اور دقت طلب کام ہے۔ ہربرٹ سپنسر کی تصانیف کے ترجمہ میں یہ دقت خاص کر پیش آئی ہے۔

**رسم خط اور کتابت کی خصوصیتیں**

یہ کتاب خاص اہتمام کے ساتھ چھپوائی گئی ہے۔ اور رسم خط اور کتابت میں بہت سی باتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے مثلاً:-

(۱) سررشتہ تعلیم پنجاب کی ابتدائی تعلیمی کتابوں کے موافق یاے معروف (ی) یاے مجہول (ے) ہاے مخلوط (ھ)، نون غنہ وغیرہ کی پوری پابندی کی گئی ہے اور صحت کا بھی پورا خیال رکھا گیا ہے۔

(۲) ہر لفظ کو علیحدہ علیحدہ لکھا گیا ہے۔ مثلاً "اُس کو" "نہ کرنا" "دور کرنے کے لئے" "اُس کے لئے" لکھا ہے۔ "اُسکو" "نکرنا" "دورکرنیکیلئے" "اُسکیلئے" نہیں لکھا۔

(۳) جملہ اعلام یعنی خاص اشخاص یا خاص مقامات کے نام جلی قلم سے لکھے گئے

ہیں۔ اس کے علاوہ جو الفاظ اور جملے مترجم کی رائے میں خاص طور پر قابل غور تھے اُن کو بھی جلی قلم سے لکھا ہے۔ حاشیہ کی سرخیوں اور ذیلی حاشیوں کو متن کی نسبت خفی قلم سے لکھا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس متن میں جہاں مصنف نے دیگر اشخاص کی رائیں نقل کی ہیں۔ اُن کو بھی خفی قلم سے اور دونوں طرف جدول سے کسی قدر ہٹا کر لکھا ہے بعض جگہہ عربی الفاظ کی تحریر میں خط نسخ بھی استعمال کیا گیا ہے۔ اس اختلاف تحریر کی وجہ سے مطالب کتاب پر عبور حاصل کرنے اور اُن کو ذہن نشین کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ یکساں تحریر کی وجہ سے پڑھنے والے کی طبیعت اُکتا جاتی ہے۔ اصل کتاب میں یہ خصوصیت نہیں ہے اُس کا خط تین چار مقاموں کے سوا بالکل یکساں چلا آتا ہے۔

(۴) اصل کتاب کی طرح ترجمہ میں بھی رموز اوقاف (پنکچوایشن) کی پوری پابندی کی گئی ہے، اور پورے وقفہ۔ تھوڑے وقفہ۔ سوال۔ تعجب۔ ندا۔ مقولہ وغیرہ کی علامتوں کا احتیاط کے ساتھ۔ لحاظ رکھا گیا ہے۔ تاکہ عام عبارت اور خاص کر طویل جملوں کے پڑھنے اور سمجھنے میں بہت کچھ سہولت ہو۔

شکریہ "ایجوکیشن" میں چند لاطینی اور فرانسیسی عبارتیں آئی ہیں۔ پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ صاحب ایم اے، سابق پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور (حال مقیم انگلستان) نے میری استدعا پر اُن عبارتوں کا انگریزی میں ترجمہ کر دیا تھا۔ جس سے میں نے اُن کا اُردو ترجمہ کیا ہے۔ پروفیسر صاحب موصوف کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں شمس العلما جناب مولانا خواجہ الطاف حسین صاحب حالی کا شکریہ ادا کرنا بھی میرا فرض ہے جنھوں نے اپنا بیش قیمت وقت صرف کر کے اس ترجمہ کے بعض حصّوں پر نظر ثانی کی تکلیف گوارا کی۔ اور بعض مناسب الفاظ و مصطلحات

کے بہم پہنچانے میں مجھے نہایت قیمتی مدد دی۔ ناشکری ہوگی۔ اگر اس موقع پر مولوی سید ممتاز علی صاحب۔ مالک رفاہ عام سٹیم پریس۔ و اڈیٹر اخبار "تالیف و اشاعت" لاہور کا شکریہ نہ ادا کیا جائے۔ جن کے حسنِ انتظام سے یہ ترجمہ اس قدر خوبی کے ساتھ چھپ کر تیار ہوا۔

معذرت | میں نے اس کتاب کے ترجمہ میں اپنی طرف سے کوشش و محنت کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ مگر کوئی انسان سہو و نسیان سے خالی نہیں ہو سکتا اور میں تو خود ہی اپنی زبان دانی اور علم و فہم کے قصور کا معترف ہوں حتی الامکان یہی کوشش کی گئی ہے کہ مصنف کے خیالات کو سنجیدگی اور صفائی کے ساتھ با محاورہ اور بہ رعایت الفاظ اردو زبان میں ادا کیا جائے۔ مجھے امید ہے کہ ناظرین اس ترجمہ پر رائے قائم کرتے وقت ان امور کو ضرور مدنظر رکھیں گے کہ "ایجوکیشن" اپنی قسم کی پہلی کتاب ہے جو اردو میں ترجمہ ہوئی ہے۔ یہ کوئی معمولی کتاب نہیں۔ بلکہ ایک ایسے شخص کے دل و دماغ کا نتیجہ ہے جو زمانہ میں اپنا مثل نہیں رکھتا تھا۔ اس کے مطالب کو دوسری زبان میں ادا کرنا۔ یا ترجمہ کرنا تو ایک طرف رہا۔ ان کا سمجھنا ہی سخت مشکل ہے۔ یہ کتاب اکثر علوم و فنون کے اصطلاحات و مسائل سے پر ہے۔ اس قسم کے ترجمہ کا کوئی پہلا نمونہ میرے پیش نظر نہ تھا۔ اردو زبان میں بحالت موجودہ ایسے دقیق اور فلسفیانہ مطالب کے ادا کرنے کی قابلیت بہت کم ہے۔ علمی اصطلاحات کا کوئی لغت بھی اردو میں موجود نہیں ہے جس سے ترجمہ میں سہولت ہوتی۔

آخر میں ناظرین باتمکین کی خدمت میں یہ عرض ہے کہ اس ترجمہ میں جہاں

کہیں کوئی سقم نظر آئے ازراہ کرم مترجم کو اُس سے مطلع فرمائیں۔اس قسم کی تمام صلاحیں یا اصلاحیں شکرگزاری کے ساتھ قبول کی جائیں گی۔اور طبع ثانی میں ضروری ترمیم کی جائے گی۔

خاکسار

مترجم

# تذکرۂ حکیم ہربرٹ سپنسر

## منجانب مترجم

**ولادت اور ابتدائی تعلیم**

ہربرٹ سپنسر ۲۷ اپریل ۱۸۲۰ء کو بمقام ڈربی واقع انگلستان پیدا ہوا اس کا باپ ڈربی میں مدرّس ریاضی اور انجمن فلسفہ کا سکرٹری تھا اور چچا پادری۔ اول باپ کی نگرانی میں اور پھر ایک پرائیویٹ اسکول میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ چچا کو اُس کی تعلیم و تربیت کا بہت خیال تھا۔ فرائض منصبی ادا کرنے کے بعد جو کچھ وقت ملتا اُس کو اپنے بھتیجے کی تعلیم و تربیت میں صرف کرتا۔ ہربرٹ سپنسر کو بچپن ہی سے سائنس کا شوق تھا۔ زبانوں اور صرف و نحو کی طرف اُس کو رغبت نہ تھی۔ خوش قسمتی سے اُس کو ایک سمجھ دار باپ ملا تھا جس نے بیٹے کو اُس کے قدرتی میلان کے خلاف صرف و نحو وغیرہ پڑھنے پر کبھی مجبور نہیں کیا بلکہ اُس کو اُس کی رائے پر چھوڑ دیا کہ جو چاہے سو پڑھے۔

**یونیورسٹی کی تعلیم سے مستفید نہ ہونا اور انجنیری کا پیشہ اختیار کرنا** اس وقت

یونیورسٹی کے نصاب میں السنۂ قدیمہ یعنی یونانی۔ لاطینی وغیرہ کی تعلیم لازمی قرار دی گئی تھی۔ اس لئے یونیورسٹی کی تعلیم پاکر ڈگری حاصل کرنا ہربرٹ سپنسر کے لئے ایک امر محال تھا۔ اب اِس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ اُس کو کسی کام میں لگایا جاوے اس زمانہ میں غالباً صرف انجنیری ایسا پیشہ تھا جس میں ایسے اشخاص جو السنۂ قدیمہ کی تعلیم حاصل کرنا نہ چاہیں، داخل ہوسکتے تھے۔ غرض ہربرٹ سپنسر کو **سرچارلس فاکس** کے پاس ریلوے انجنیر کا کام سیکھنے کے لئے بھیجا گیا اور وہ ۱۸۳۷ء یعنی ۱۷ سال کی عمر میں سول انجنیر بن گیا۔ نوجوان انجنیر نے آٹھ سال تک اس پیشہ کو جاری رکھا اور اس اثنا میں انجنیری کے ایک رسالہ میں مضامین بھی لکھتا رہا۔ مگر **ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات**، انجنیری جیسے محدود پیشہ میں اس کا دل نہ لگا اور ۱۸۴۵ء میں انجنیری چھوڑ کر علمی مشاغل میں مصروف ہوگیا۔

**عہدۂ انجنیری سے دست برداری اور علمی مشاغل میں مصروفیت**

۱۸۴۸ء سے ۱۸۵۳ء تک رسالہ اکانومسٹ کا اسسٹنٹ ایڈیٹر رہا اور لندن میں مستقل سکونت اختیار کرکے رسالہ **ویسٹ منسٹر ریویو** میں کثرت سے مضامین لکھنے شروع کئے یوں تو ابتدا ہی سے تصنیف وتالیف کا شوق تھا مگر اُس زمانہ میں جبکہ وہ انجنیر تھا عام لٹریچر کے میدان میں اُس نے طبیعت کی جولانی کا ثبوت اس طرح دیا کہ ۱۸۴۲ء میں رسالہ **نان کنفرمسٹ** میں ایک سلسلہ مضامین لکھنا شروع کیا جس کا عنوان تھا "گورنمنٹ کی حد مناسب" یہ مضامین پسند کئے گئے اور اگلے سال کتاب کی شکل میں طبع ہوئے۔ ان مضامین میں ملکی طور پر معاشرتی امور سے بحث کی گئی ہے اور ان میں اُس خیال کی جھلک پائی جاتی ہے جس نے رفتہ رفتہ ارتقا کی شکل اختیار کی جو آخر کار ہربرٹ سپنسر کی شہرت کا باعث ہوا۔

۱۸۵۵ء میں یعنی ڈاروِن کی کتاب آریجن آف سپیشیز (انواع کی اصلیت) کے چھپنے سے چار سال پہلے اُس نے اپنی کتاب پرنسپلز آف سائی کالوجی (اصول علم النفس) چھپوائی۔ اِس کی تیاری میں اُس نے اس قدر محنت اُٹھائی کہ صرف ۸ مہینے میں اُس کو پورا کر دیا جس سے اُس کی صحت نہایت خراب ہو گئی اور وہ تقریباً دو سال تک سخت بیمار رہا۔ اس عرصہ میں تصنیف و تالیف کا کام بالکل معطل رہا۔ ۱۸۵۷ء سے ۱۸۵۹ء تک اُس نے مختلف اخباروں اور رسالوں میں مضامین لکھے۔

| ہربرٹ سپنسر کی زبردست اور عالمانہ تصنیف "سسٹم آف سنتھٹک فلاسفی" ہے |
|---|

۱۸۶۰ء میں سسٹم آف سنتھیٹک فلاسفی" (نظام فلسفۂ ترکیبی) کے نام سے اُس نے ایک نہایت ضخیم کتاب لکھنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اور اُس کے مضامین کا ایک خاکہ کھینچ کر بطور ایک اشتہار کے شایع کیا۔ اس کتاب کے مختلف حصے وقتاً فوقتاً چھپ کر شایع ہوتے رہے۔ اس کے بعد یہ تمام مجموعہ حسب ذیل دس ضخیم جلدوں میں چھاپا گیا:-

(۱) فسٹ پرنسپلز - - - (اصول اولیہ) - - - ایک جلد
(۲) پرنسپلز آف بیالوجی - - - (اصول علم الحیات) - - - دو جلد
(۳) پرنسپلز آف سائی کالوجی - - (اصول علم النفس) - - - دو جلد
(۴) پرنسپلز آف سوشیالوجی - - (اصول علم المعاشرت) - - - تین جلد
(۵) پرنسپلز آف ایتھکس - - - (اصول علم الاخلاق) - - - دو جلد

ہربرٹ سپنسر اس کتاب کی تکمیل میں بڑی دلیری اور صبر و استقلال کے ساتھ مصروف رہا اور اگرچہ اس عرصہ میں اُس کی صحت اچھی نہیں رہی اور اُس کو طرح طرح کی مشکلات اور مایوسیوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ مگر "ہمت مرداں مدد خدا"! آخرکار ۱۸۹۶ء میں ۳۶ سال کی محنت شاقہ کے بعد اُس کو پورا کیا۔ یہ وہ کتاب ہے جس نے اُس کا نام تمام علمی دنیا میں مشہور کر دیا

اور اُس کی بے نظیر علمی لیاقت اور خداداد قابلیت کا سکہ بٹھا دیا۔

**تصانیف پر ایک اجمالی نظر**

مذکورہ بالا کے علاوہ اس نے فلسفہ۔ سائنس اور ملکی معاملات میں بہت سی کتابیں، رسالے اور مضامین لکھے ہیں۔ ان میں شاید سب سے زیادہ عام پسند اور مقبول کتاب "ایجوکیشن" (تعلیم) ہے۔ اس میں عقلی و اخلاقی وجسمانی تعلیم پر نہایت قابلیت اور عالمانہ طریقہ سے بحث کر کے یہ بات ثابت کی ہے کہ اصلی وحقیقی تعلیم وہی ہے جو نفس کو خود بخود نشو و نما پاتے اور ترقی حاصل کرنے میں مدد دے۔ اور یہ بتایا ہے کہ ہر قسم کی تعلیم میں ایسا طریقہ اختیار کیا جائے کہ آسان سے مشکل تک، مبہم سے معین تک، مادیات سے مجردات تک، عملی سے عقلی تک بتدریج ترقی ہو۔ انگریزی زبان میں اس مضمون پر اس سے بہتر کوئی کتاب موجود نہیں ہے۔ اس کی خوبی اور عام مقبولیت کا اندازہ صرف اس امر سے ہو سکتا ہے کہ ۱۸۹۹ء تک دنیا کی مختلف زبانوں میں اس کے سولہ [۱۶] ترجمے شائع ہو چکے ہیں، یہاں تک کہ سنسکرت، یونانی، چینی اور جاپانی زبانوں میں بھی اس کے ترجمے ہو چکے ہیں۔ اردو زبان اس وقت تک محروم تھی۔ مگر اب "انجمن ترقی اردو" کی سرپرستی سے اس زبان میں بھی اس کا ترجمہ ہو گیا ہے۔

**ہربرٹ سپنسر نے کس قسم کی تعلیم پائی تھی اور انشاپردازی میں اُس کا کیا مرتبہ ہے؟**

ہربرٹ سپنسر کی جسمانی صحت اچھی نہیں تھی اور جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا اُس کے باپ نے کبھی اُس پر لکھنے پڑھنے کا دباؤ نہیں ڈالا۔ وہ کھیتوں اور میدانوں میں سیر و تفریح کے لئے نکل جایا کرتا تھا۔ بچپن میں اُس کو کیڑے پکڑنے اور پودے جمع کرنے کا بہت شوق تھا۔ اس کا قول ہے کہ بچوں کو تعلیم دینے اور علم کا شوق دلانے کے لئے قدرتی طریقہ یہی ہے جو کھیل کا کھیل ہے اور تعلیم کی تعلیم۔ اس مضمون کو نہایت خوبی کی

ساتھ اُس نے اپنی کتاب **ایجوکیشن** میں لکھا ہے۔ غرض ہربرٹ سپنسر نے بچپن ہی سے گویا سائنس ہی کی تعلیم پائی تھی۔ اگرچہ اُس نے **رسمی علوم** یعنی **السنہ قدیمہ** اور **صرف و نحو** کی تعلیم نہیں پائی تھی۔ یہاں تک کہ یونانی زبان کا ایک حرف تک نہیں جانتا تھا۔ مگر اُس نے حیوانات و نباتات وجمادات اور اجرام سماوی وغیرہ موجودات قدرت کا علم حاصل کیا تھا۔ اکثر اشخاص ان رسمی علوم کی تعلیم پر اس وجہ سے زور دیتے ہیں کہ ان سے اپنی مادری زبان کے صحیح استعمال میں مدد ملتی ہے۔ یہ دلیل کس قدر سبک اور کم وزن ہے! باوجودیکہ ہربرٹ سپنسر نے رسمی تعلیم حاصل نہیں کی، تاہم وہ نہایت صحت ودرستی اور فصاحت و بلاغت کے ساتھ انگریزی لکھتا ہے۔ نئے الفاظ حسب ضرورت بڑی خوبی کے ساتھ گھڑ لیتا ہے۔ اپنے خیالات کو نہایت آزادانہ اور مؤثر طریقہ میں ظاہر کرتا ہے اور فلسفہ اور سائنس کے مشکل مضامین میں بھی انشا پردازی کی شان نظر آتی ہے۔

**زبانوں کی تعلیم کے متعلق ہربرٹ سپنسر کی رائے**

ہربرٹ سپنسر کے نزدیک ضرورت سے زیادہ زبانوں کی تعلیم محض تضیع اوقات اور اصلی و حقیقی علم کے حاصل کرنے میں سدراہ ہے۔ اُس کا قول ہے کہ بچوں کو مختلف زبانیں سکھانے کا جو دستور ہو گیا اُس کی بنیاد صرف نام و نمود پر ہے نہ کہ کسی فائدہ پر۔ جس طرح وحشی باشندے محض نمود کے لئے اپنے بدن کو رنگ لیتے ہیں اسی طرح لڑکوں اور لڑکیوں کو مختلف زبانیں سکھانے کا اصل منشا یہ ہے کہ لوگوں کی نظروں میں اُن کی قدر و منزلت ہو۔ اُس نے زبان اور سائنس کی تعلیم کا مقابلہ کر کے دکھا دیا ہے کہ سائنس کی تعلیم ہر ایک اعتبار سے زبان کی تعلیم پر فوقیت رکھتی ہے۔

**ملکی معاملات میں ہربرٹ سپنسر کی رائے**

ملکی معاملات میں ہربرٹ سپنسر کی رائے نہایت آزاد تھی۔ جب ۱۸۴۰ء میں جو لڑائی سرکار انگریزی اور قوم بوئر کے درمیان بمقام ٹرنسوال

واقع جنوبی افریقہ پیش آئی تھی اور کئی سال تک جاری رہی تھی وہ اس لڑائی کا سخت مخالف تھا۔ اُس نے اہل جاپان کو یہ صلاح دی تھی کہ اگر تم لوگ بچنا چاہتے ہو تو اہل یورپ سے الگ رہو ورنہ اپنی آزادی کھو بیٹھو گے۔ اُس کی کتاب "سوشیل سٹیٹکس" پولیٹکل فلاسفی (فلسفۂ سیاست) میں مشہور کتاب ہے اور بعض یونیورسٹیوں میں داخل درس ہے مگر انگلستان میں اُس کی رائے کی عموماً مخالفت کی گئی تھی۔

**مذہب کے متعلق اُس کی رائے**

مذہب کے متعلق اُس کی یہ رائے نہایت منصفانہ اور قابل وقعت ہے کہ سائنس اور مذہب ایک دوسرے کے مخالف نہیں بلکہ ممد و معاون ہیں اُس کا قول ہے کہ سائنس اُن توہمات کا دشمن ہے جو مذہب کے نام سے مشہور ہیں نہ کہ اصلی و حقیقی مذہب کا جس کو یہ توہمات محض پوشیدہ کر دیتے ہیں۔ یہ خیال باطل ہے کہ سائنس لامذہبی کی تعلیم دیتا ہے۔ لامذہبی کی تعلیم دینا تو ایک طرف سائنس سے غفلت کرنی بے دینی ہے۔ اُس نے صاف صاف اقرار کیا ہے کہ علت العلل (خدائے تعالےٰ) کی ماہیت کا سمجھنا نہ صرف عقل انسانی بلکہ خیال و قیاس سے بھی بالاتر ہے۔ سائنس ایک خاص حد تک ہماری رہنمائی کر سکتا ہے جس کے آگے کا حال ہم مطلق معلوم نہیں کر سکتے۔ اس مضمون پر ہربرٹ سپنسر نے اپنی کتاب ایجوکیشن میں بڑی خوبی کے ساتھ بحث کی ہے۔ یہ اُس شخص کی رائے ہے جس نے تمام عمر سائنس اور فلسفہ کے مطالعہ میں گزار دی ہے اور جو اپنے زمانہ کا سب سے بڑھ کر فلسفی ہوا ہے۔ جو لوگ سائنس کی ابجد پڑھ کر ہمہ دانی کا دعویٰ کرنے لگتے ہیں اور رازہائے سربستہ کی گرہ اپنے ناخن تدبیر سے کھولنا چاہتے ہیں۔ یا الٰہی اسرار کے عقدہ کو اپنی ناقص اور محدود عقل کے ذریعہ سے حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو ہربرٹ سپنسر کی رائے سے ہدایت حاصل کرنی چاہیے۔

## تصانیف کی ناقدری اور مالی نقصانات میں ہربرٹ سپنسر کی مستقل مزاجی

ہربرٹ سپنسر کی اس قدر تصنیفات کا حال معلوم کر کے شاید کوئی شخص یہ نتیجہ نکالے کہ اس نے اپنی کتابوں سے لاکھوں روپیہ پیدا کیا ہو گا۔ مگر درحقیقت یہ بات نہیں ہے۔ زمانہ میں علمی تصانیف کی عموماً ناقدری ہوا کرتی ہے انگلستان میں بھی ایک عرصہ دراز تک اس کی کتابوں کی قدر نہیں کی گئی۔ نفع تو درکنار کتابوں کی فروخت سے لاگت بھی وصول نہیں ہوتی تھی۔ اس موقع پر اس کی تصانیف کی ناقدری کا حال بیان کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہو گا۔ ۱۸۵۰ء میں اس نے اپنی پہلی کتاب سوشل سٹیٹکس چھپوانے کا ارادہ کیا۔ تو اس کو کوئی ایسا شخص نہ مل سکا جو اس کی اشاعت کی جوکھوں میں پڑے اس لئے مجبوراً اپنے خرچ سے چھپوا کر اس کو کمیشن پر فروخت کے لئے دے دیا۔ اس کتاب کی صرف سات سو پچاس جلدیں طبع ہوئی تھیں جن کے فروخت ہونے میں چودہ سال سے کم صرف نہیں ہوئے۔ پانچ سال کے بعد اس نے پرنسپلز آف سائی کالوجی (اصول علم النفس) چھپوائی۔ اس کے چھاپنے کے لئے بھی کسی کتب فروش یا مالک مطبع نے ہامی نہ بھری۔ اس لئے اس کتاب کی اشاعت بھی کمیشن پر کرائی گئی اس کی بھی سات سو پچاس جلدیں طبع ہوئی تھیں۔ مگر ان کو بھی فروخت ہوتے ہوتے ایک مدت لگ گئی۔ چنانچہ ہربرٹ سپنسر افسوس کے ساتھ لکھتا ہے کہ "میں نے بہت سی جلدیں تو مفت بانٹ دیں اور باقی ماندہ کتابیں ساڑھے بارہ سال میں فروخت ہوئیں"۔

ان واقعات سے صاف ظاہر ہے کہ ان دونوں مشہور و معروف اور قابل قدر کتابوں سے اس کو مطلق نفع نہیں ہوا۔ نفع تو درکنار اس کا سارا سرمایہ ان کتابوں میں صرف ہو گیا اور وہ سچ مچ محتاج ہو گیا۔ اسی طرح اپنا مجموعہ مضامین اور کتاب تعلیم چھپوا کر چند سال بعد اس کو یہ بخوبی تجربہ ہو گیا کہ فلسفیانہ تصانیف سونے کی چڑیا یا جواہرات

کی کان نہیں ہیں۔ چنانچہ اُس نے لکھا ہے کہ "میں نے اپنی تمام کتابوں سے نقصان ہی نقصان اُٹھایا ہے۔"

سنہ ۱۸۶۰ء میں جب اُس کے "سسٹم آف سینتھٹیک فلاسفی" (نظامِ فلسفہ ترکیبی) کے عنوان سے اپنی سب سے زیادہ ضخیم اور مشہور و معروف کتاب چھپوانے کا ارادہ کیا تو اور بھی زیادہ آفت کا سامنا ہوا۔ مصنف کے پاس اُس کی اشاعت کے لئے روپیہ نہ تھا۔ وہ پہلے ہی اپنا سرمایہ پبلک کی ناقدری کی نذر کر چکا تھا۔ اور کوئی صاحبِ مطبع یا کتب فروش ایسا نہیں مل سکتا تھا جو اتنی بڑی کتاب کے چھپوانے کا بیڑا اُٹھا سکے اور اپنے روپیہ کو خطرہ میں ڈالے۔ خاص کر ایسی حالت میں جب کہ ہربرٹ سپنسر کی کتابوں کی پہلے ہی بہت کچھ ناقدری ہو رہی تھی۔ اس لئے اُس نے یہ ترکیب نکالی کہ اُس کتاب کے کچھ خریدار پیدا کئے۔ اور اُس کے حصے سہ ماہی رسالوں کی شکل میں چھاپنے شروع کئے۔ ہربرٹ سپنسر کہتا ہے کہ "جب اس کتاب کی پہلی جلد فرسٹ پرنسپلز (اصول اولیہ) قریب الختم تھی تو میں نے دیکھا کہ مجھے نقصان ہوا ہے۔ دوسری جلد پرنسپلز آف بیالوجی (اصول علم الحیات) کی اشاعت کے زمانہ میں بھی مجھ کو نقصان رہا۔ اسی طرح تیسری جلد کی اشاعت کے درمیان میں نقصان رہا یہاں تک کہ میں نے دیکھا کہ میرا تمام اثاثہ برباد ہو رہا ہے۔ اُس وقت میں نے اپنے حساب کتاب کی جانچ پڑتال کی تو معلوم ہوا کہ میں نے پندرہ سال کے عرصہ میں تخمیناً بارہ سو پونڈ یعنی اٹھارہ ہزار روپیہ برباد کیا ہے اور اگر اس میں سود بھی شامل کیا جائے تو بارہ سو پونڈ سے بھی زیادہ ہو گا۔ چونکہ میں کھکھ ہو چلا تھا اس لئے میں نے خریداروں کو باقی ماندہ کتاب کی اشاعت بند کرنے کا اشتہار دے دیا۔" مگر عین تنت کے وقت اُس کو ایک ترکہ مل گیا جس کی وجہ سے کام برابر چلتا رہا۔ پہلے بھی دو دفعہ اُس نے

کتابوں کی اشاعت بند کر دینے کا ارادہ کر لیا تھا۔ مگر ع

"مردے از غیب بروں آید و کارے بکند"

حسنِ اتفاق سے دونوں دفعہ ایسی ہی مدد اُس کو مل گئی اس لیئے اُس کا کام رُکنے نہیں پایا۔ کوئی اور شخص ہوتا تو ایسے بے سود سودے میں کبھی اپنا روپیہ برباد نہ کرتا اور ایک دفعہ نقصان اُٹھا کر آئندہ کے لیئے اُس کے کان ہو جاتے مگر ہربرٹ سپنسر ہی کا حوصلہ تھا کہ باوجود متواتر ناکامی اور نااُمیدی کے ہمّت نہ ہاری۔ تاہم اس بات کے معلوم ہونے سے کسی قدر تسلی ہوتی ہے کہ انجام کار اُس کو اپنی محنت کا کچھہ نہ کچھ معاوضہ مل گیا۔ یعنی آغاز تصانیف سے چوبیس سال بعد نفع نقصان برابر ہو گیا۔ اس میں شک نہیں کہ اس وقت سے ہربرٹ سپنسر کو اپنی کتابوں سے آہستہ آہستہ خاصی آمدنی ہونے لگی تھی مگر غور کرو ایسے شخص کی جرأت و ہمّت اور صبر و استقلال پر جو باوجود مفلسی اور تنگ دستی کے اس قدر مالی نقصانات برداشت کرے!

یہ تو ابتدائی زمانہ کا ذکر تھا۔ مگر آخر زمانہ میں بھی اُس کو کچھ زیادہ فائدہ نہیں ہوا چنانچہ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ اُس نے اپنی کتاب **سوشیولاجیکل ٹیبلز** کی تیاری میں **دو ہزار نو سو اٹھاون پونڈ یعنی چوالیس ہزار تین سو ستر روپیئے** صرف کیئے جس کی نسبت اُس نے بطور مزاح یہ کہا تھا کہ "اگر میری عمر سو برس سے زیادہ ہو تو بھی جو روپیہ میرے ہاتھ سے نکل گیا ہے مجھے اُس کے واپس ملنے کی کوئی توقع نہیں ہے۔"

**اس کے فلسفہ اور علمی لیاقت پر ایک سرسری نظر**

یہ کہنا کچھ بے جا نہ ہو گا کہ ہربرٹ سپنسر نے فلسفہ کی کایا پلٹ دی ہے۔ اُس نے قدیم طریقہ کو چھوڑ کر تحقیقات اور استدلال کا ایک جداگانہ اور نیا طریقہ نکالا ہے جس نے علمی دنیا کے خیالات میں ایک سخت تلاطم اور حیرت انگیز انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ ڈارون نے صرف

انواع کی اصلیت کی بنیاد قانون ارتقا پر رکھی ہے مگر ہربرٹ سپنسر نے یہ قانون تمام کائنات کے لیے عام قرار دیا ہے۔ ڈارون نے صرف نباتات اور حیوانات کی انواع کی اصلیت پر محض ان کی جسمانی ساخت اور افعال اعضا کے اعتبار سے اپنی توجہ مبذول کی تھی۔ مگر ہربرٹ سپنسر نے یہ تعلیم دی ہے کہ قانون ارتقا کا عمل موجودات عالم کی ہر ایک شے پر حاوی ہے عام اس سے کہ وہ ذی روح ہو یا غیر ذی روح۔ مادی ہو یا غیر مادی اور حیوانات و نباتات و جمادات سے لے کر نفس ناطقہ اور انسانی خیالات سب اس قانون کے تابع ہیں۔

یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ ڈارون کی کتاب آریجن آف سپیشیز (انواع کی اصلیت) کے طبع ہونے سے پہلے مسئلہ ارتقا کا خیال ہربرٹ سپنسر کے ذہن میں آچکا تھا۔ اس لئے یہ خیال غلط ہے کہ ہربرٹ سپنسر اس مسئلہ میں ڈارون کا شاگرد ہے۔ ان کا باہمی تعلق اُستاد و شاگرد جیسا نہیں ہے بلکہ وہ ایک دوسرے کے ہم سر ہیں۔ اُنیسویں صدی عیسوی اور خاص کر اُس کا پچھلا نصف حصہ علم کی ترقی اور علمی کوشش کا زمانہ تھا اور لوگوں نے خیالی اور ہوائی باتوں کو چھوڑ کر علمی اور حقیقی علم کی طرف توجہ شروع کر دی تھی۔ اس لئے زمانہ کو ایسے معلم کی ضرورت تھی جو حال کی علمی تحقیقات کے نتائج کے موافق فلسفہ پر نظر ثانی کر کے اُس کو نئے سانچے میں ڈھال دے۔ یہ شخص ہربرٹ سپنسر تھا۔ ممکن ہے کہ وہ بعض اعلیٰ مسائل پر آخری فیصلہ کرنے سے قاصر رہا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ اُن مسائل کا جو حل اُس نے پیش کیا ہے وہ ناکافی ہو اور جو نتائج اُس نے نکالے ہیں ناقابل اطمینان ہوں۔ مگر اُس کے ساتھ ہی یہ بات ضرور تسلیم کرنی پڑے گی کہ اُس نے علم کے تمام پراگندہ ذخیرہ کو باقاعدہ مرتب کرنے کی ایک نرالی کوشش کی ہے۔ بہت سے بحث طلب مضامین پر بالکل نئی روشنی

ڈال دی ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ روشنی کا ایک دریا بہا دیا ہے۔ ایک حکیم کا قول ہے کہ "دنیا نے آج تک جس قدر علم حاصل کیا ہے اُس کو ہربرٹ سپنسر نے اپنے دماغ میں مرتب کرنے کے بعد کتابیں لکھی ہیں"۔ ایک اور مصنف کہتا ہے کہ "اگر افلاطون اس وقت زندہ ہوتا اور پچھلے بائیس سو برس کی علمی ترقی سے واقف ہوتا تو وہ بھی ہربرٹ سپنسر سے بہتر نہیں لکھ سکتا تھا"۔

**عادات وخصائل** ہربرٹ سپنسر نڈر اور مستقل مزاج آدمی تھا۔ اُس نے مفلسی کے مصائب کو جواں مردی اور صبر کے ساتھ برداشت کیا۔ جس کام کا بیڑا اُٹھایا تھا اُس کے پورا کرنے میں تمام عمر مصروف رہا۔ اور محنت کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ اگرچہ اُس کی محنت کی داد جیسی کہ چاہیے نہیں ملی۔ تاہم وہ علمی تصانیف میں برابر مصروف رہا جس سے صاف ظاہر ہے کہ کتابیں لکھنے سے اُس کا مقصد لوگوں کو فائدہ پہنچانا تھا نہ کہ روپیہ کمانا۔ اُس کی طبیعت نہایت غیور اور آزاد واقع ہوئی تھی۔ اس کے دوستوں نے بارہا اُس کی مدد کرنی چاہی مگر اُس نے گوارا نہ کیا۔ برطانیہ کلاں۔ یورپ۔ اور امریکہ کی یونیورسٹیوں نے متعدد مرتبہ فلسفہ کے اعلیٰ سے اعلیٰ عہدے اس کے لئے پیش کئے مگر اُس نے کوئی عہدہ منظور نہ کیا اور شکریہ کے ساتھ ہمیشہ انکار کرتا رہا۔ اُس نے علم کو علم کی غرض سے حاصل کرنے کا نہایت عمدہ ثبوت دیا اور دوسروں کا دست نگر رہنے کے بجائے اپنے دست و بازو پر بھروسہ کرنے کا عملی نمونہ دنیا کو دکھا دیا۔

**وفات** ہربرٹ سپنسر اپنی ضعیفی اور بیماری کی وجہ سے پچھلے دس پندرہ سال سے بالکل گوشہ نشین تھا۔ اپریل ۱۹۰۳ء میں اُس کے ہزاروں مداحوں اور قدردانوں نے اس کی تراسیویں سالگرہ کی خوشی میں ایک جلسہ منعقد کیا اور یہ دعا کی تھی کہ خدا اس کو بہت سے ایسے سال دیکھنے نصیب کرے۔ مگر مشیت الٰہی میں کچھ اور ہی تھا

تقریباً سات ماہ کے بعد اس نامور حکیم نے ۸ دسمبر ۱۹۰۳ء کو تقریباً چوراسی[۸۴] برس کی عمر میں انتقال کیا۔ یہ کہنا کہ ہربرٹ سپنسر اپنے زمانہ کا سب سے بڑا فلسفی اور قدیم زمانہ کے مشہور ترین فلاسفہ کے برابر تھا اس کی زیادہ تعریف نہیں ہے ہربرٹ سپنسر کے انتقال کی وجہ سے انگلستان سے ایک ایسا آدمی گم ہو گیا جس کی شہرت عالمگیر تھی۔ مگر حقیقت میں اُس کی موت سے نہ صرف انگلستان اور یورپ کو بلکہ بالعموم تمام دنیا کو نقصان پہنچا ہے۔

اہل ہند کے لئے یہ بات قابل فخر ہے کہ ہربرٹ سپنسر کی یادگار قایم کرنے کے لئے سب سے پہلے ایک معزز ہندوستانی نے پندرہ ہزار روپیہ کی معقول رقم دینے کا وعدہ کیا ہے اور اس طرح قدردانی کا فرض ادا کر کے ایک حد تک اپنے ہم وطنوں کو سبکدوش کر دیا ہے۔

ترجمہ

# دیباچۂ مصنّف

تعلیم کے متعلق یہ چند باب جو میں نے لکھے ہیں جب ان کے اصل اڈیشن کی مانگ بڑھنے لگی تو مجھے خیال پیدا ہوا کہ ایک ایسا اڈیشن شایع کرنا مناسب ہی جو بآسانی عام لوگوں میں زیادہ اشاعت پا سکے اضلاع متحدہ (امریکہ) میں اس کتاب نے بہت کچھ اشاعت حاصل کی ہے۔ اور ممالک فرانس و جرمنی و اٹلی و روس و ہنگری و ہالینڈ و ڈنمارک کی زبانوں میں اس کے ترجمے ہو چکے ہیں[1]۔ ان واقعات نے مجھے اس بات کا یقین کرنے کے لئے

[1] اب سپین، سویڈن، بوہیمیا، یونان، جاپان، چین، اور بلگیریا کی زبانوں اور سنسکرت و عربی کا بھی اضافہ کر سکتے ہیں۔

اور زیادہ تقویت دی کہ انگلستان میں وسیع تر اشاعت کی غرض سے اس کتاب کے ایک ارزاں اڈیشن کی ضرورت ہے۔

متن میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی۔ اگر زیادہ اہم مشاغل درپیش نہ ہوتے تو میں بغور اس کتاب پر نظر ثانی کرتا۔ مگر بجائے اس کے کہ زیادہ اہم کاموں کو ملتوی کیا جاتا۔ میں اس پر نظر ثانی کرنے سے باز رہا۔

چونکہ قیمتی اڈیشن کی فروخت بھی جو اُسی کارخانہ کا شایع کیا ہوا ہے جس نے یہ ارزاں اڈیشن شایع کیا ہے بدستور جاری رہیگی۔ اس لئے کتاب کی فرمایش کے وقت یہ ضرور بتانا چاہیے کہ کونسا اڈیشن مطلوب ہے۔ گراں یا ارزاں۔

لندن

ستمبر ۱۸۷۸ء

# تعلیم

## باب اوّل

### کونسا علم سب سے زیادہ قیمتی ہے؟

قدامت کے اعتبار سے آرایش لباس سے مقدم ہے

یہ مقولہ صحیح ہے کہ قدامتِ زمانہ کے اعتبار سے آرایش لباس سے مقدم ہے جو لوگ بہت کچھ جسمانی تکالیف اس غرض سے اُٹھاتے ہیں کہ اپنے بدن کو گُدوا کر خوب صورت بنائیں۔ وہ موسم کی سخت سے سخت گرمی سردی کی بھی برداشت کر لیتے ہیں۔ لیکن انھیں رفع کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ ہمبولٹ[1] صاحب بیان کرتے ہیں۔ کہ اورِی نوکو[2] کے وحشی باشندے جسمانی راحت و آرام کی طرف سے تو بالکل غافل ہیں۔ مگر دو دو ہفتہ تک اِس غرض سے محنت و مزدوری کرتے ہیں کہ اپنے بدن کو رنگنے کے واسطے رنگ خرید سکیں۔ تاکہ اُن کو رنگا ہوا دیکھ کر سب لوگ واہ وا کریں

[1] ہمبولٹ۔ جرمنی کا مشہور و معروف فلسفی اور سیاح تھا۔ ۱۷۶۹ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۵۹ء میں فوت۔ مترجم

[2] اورِی نوکو۔ جنوبی امریکہ کا ایک دریا ہے۔ اس کا طول سولہ سو (۱۶۰۰) میل ہے۔ کوہستان گانا سے نکل کر بحر اوقیانوس میں جا گرتا ہے۔ مترجم

اور وہی وحشی عورت جو اپنی جھونپڑی سے بالکل برہنہ باہر نکلنے میں کچھ پس و پیش نہیں کرتی اُس کو اتنی جرأت نہیں ہوتی کہ اپنے بدن کو رنگ لگائے بغیر باہر چلی جائے اور اس بدسلیقگی کی مرتکب ہو۔ بحری سفر کرنے والوں نے معلوم کیا ہے کہ وحشی قومیں سوتی کپڑے اور بانات کی نسبت رنگین مالاؤں اور انگوٹھی چھلے وغیرہ کو زیادہ عزیز رکھتی ہیں۔ اس بات کے قصے موجود ہیں کہ جب کبھی ان وحشیوں کو قمیص یا کوٹ دیے جاتے ہیں تو وہ ان کی مضحکہ آمیز نمایش کرتے ہیں۔ اس سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ آرایش کا خیال فائدہ کے خیال پر کتنا غالب ہے، بلکہ اس سے بھی کہیں بڑھ کر مثالیں موجود ہیں۔ کپتان سپیک[1] صاحب اپنے افریقی رفقا کا ذکر کرتے ہیں کہ مطلع صاف ہونے کے وقت تو یہ لوگ بکری کی کھال کے کوٹ پہنے اِدھر اُدھر اکڑتے پھرتے تھے۔ مگر بارش کے وقت اُن کو تہ کر دیتے تھے اور مینہ میں کانپتے ہوئے ننگے پھرا کرتے تھے! وحشی باشندوں کی طرز معاشرت کے واقعات درحقیقت اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ زینت و آرایش ہی نے ترقی کرتے کرتے لباس کی شکل اختیار کی ہے، اور جب کہ ہم اس امر کو مدنظر رکھیں کہ ہم لوگوں میں بھی اکثر آدمی کپڑے کے گرم ہونے کی نسبت اس کے مہین ہونے کا اور بہ نسبت آرام و آسائش کے لباس کی قطع و برید کا زیادہ لحاظ رکھتے ہیں اور جب کہ ہم دیکھتے ہیں کہ آج کل کے زمانہ میں بھی زیادہ تر مفاد اصلی پر ظاہری شکل و صورت کو فوقیت دی جاتی ہے، تو ہم کو اصول بالا کی تائید میں ایک اور وجہ ہاتھ آجاتی ہے۔

علوم عقلیہ — عجیب بات یہ ہے کہ ایسے ہی تعلقات نفس پر صادق آتے ہیں۔ علوم عقلیہ

[1] کپتان سپیک۔ انگلستان کا باشندہ تھا۔ وسط افریقہ میں وہاں کے حالات دریافت کرنے کی غرض سے گیا تھا۔ ۱۸۲۷ء میں پیدا ہوا۔ اور ۱۸۶۴ء میں انتقال کیا۔ مترجم

کی تحصیل میں بھی جسمانی امور کے مانند آرائش کو فائدہ پر مقدم سمجھا جاتا ہے۔ قدیم زمانہ ہی پر کیا منحصر ہے، ہمارے اپنے زمانہ میں بھی قریب قریب یہی حالت ہے۔ جو علم نوع انسان کی بہبودی میں ممد و معاون ہے اُس کو تو اُٹھا کر بالائے طاق رکھ دیتے ہیں اور جس علم کے حاصل کرنے میں چاروں طرف سے تحسین و آفرین کی صدائیں بلند ہوتی ہیں اُس پر توجہ کرتے ہیں۔ یونان کے مدرسوں میں موسیقی، شاعری، فصاحت و بلاغت اور فلسفہ اعلیٰ درجہ کے مضامین تعلیم سمجھے جاتے تھے اور جب تک سقراط[1] نے تعلیم دینی شروع نہیں کی تھی، اُس وقت تک یونانی فلسفہ کو عمل سے کچھ ایسا تعلق نہ تھا، اور جس علم سے فنون معاشرت (صنعت و حرفت وغیرہ) میں مدد ملتی ہے اُس کو بہت کم درجہ پر رکھا گیا تھا۔ آج کل ہماری یونیورسٹیوں اور مدرسوں میں بھی یہی خرابی موجود ہے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ دس طالب علموں میں سے نو طالب علم اپنی آیندہ زندگی میں لاطینی اور یونانی زبانوں کی واقفیت کو عملی مقاصد کے لئے استعمال نہیں کرتے، تو ہم ایک پوچ اور لچر بات کہنے کے مجرم ہیں۔ یہ قول

"کسی طالب علم کو دوکانداری، دفتری کاروبار، اپنے خاندان یا جائداد کے انتظام، بینک یا ریلوے کی خدمت منتظمی کو انجام دینے میں اُس علم سے جس کی تحصیل میں اس کے بہت سے سال صرف ہوئے ہیں، بہت ہی کم مدد ملتی ہے، اس قدر کم کہ اُس علم کا بہت سا حصہ اُس کے صفحۂ دل سے عموماً محو ہو جاتا ہے"

اس درجہ عام اور مبتذل ہو گیا ہے کہ اُس میں کوئی جدت باقی نہیں رہی اور اگر کوئی شخص گاہے گاہے لاطینی زبان کا کوئی مقولہ استعمال کرتا ہے، یا کسی یونانی افسانہ کا حوالہ دیتا ہے، تو اس سے مضمون زیر بحث کی توضیح بہت کم مقصود ہوتی ہے۔ زیادہ تر مقصد

(حاشیہ: کی تحصیل میں بھی عام طور پر نمائش کو فائدہ پر ترجیح دی جاتی ہے۔ اس کی وجہ)

[1] سقراط۔ ملک یونان کا مشہور حکیم ہے۔ شہر ایتھنز کا رہنے والا تھا۔ ۴۶۹ قبل مسیح میں پیدا ہوا اور ۳۹۹ قبل مسیح میں فوت۔ مترجم

لوگوں پر اثر ڈالنا ہوتا ہے۔ اگر ہم اس بات کو دریافت کریں، کہ لڑکوں کو قدیم زبانوں کے علوم ادبیہ کی تعلیم دینے کا اصل مدعا کیا ہے تو ہم کو معلوم ہو جائیگا کہ اصل غرض عوام الناس کی رائے کا اتباع ہے۔ لوگ جس طرح عام پسند دستور کے مطابق لباس پہنتے ہیں، اسی طرح اپنے بچوں کے قوائے عقلیہ کو عام پسند زیور سے آراستہ کرتے ہیں۔ جس طرح اوری نوکو کا وحشی باشندہ اپنی جھونپڑی سے نکلنے سے پہلے اپنے بدن کو رنگین کر لیتا ہے، نہ اس غرض سے کہ رنگ لگانے سے اُس کو کوئی فائدہ پہنچتا ہے بلکہ اس غرض سے کہ رنگ لگائے بغیر باہر نکلنے سے اُس کو شرم آتی ہے، اسی طرح کسی لڑکے کو لاطینی اور یونانی کی تعلیم دینے پر کچھ ان زبانوں کی اصلی اور ذاتی قدر و قیمت کی وجہ سے زور نہیں دیا جاتا، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُن سے جاہل رہ کر وہ اپنے اقران و امثال میں ذلیل و حقیر نہ سمجھا جائے۔ یا یوں کہو کہ لاطینی اور یونانی کی تعلیم دینے کا باعث یہ ہے کہ ایک شریف آدمی کے لئے جو تعلیم ضروری سمجھی جاتی ہے وہ تعلیم اُس کو دی جائے تاکہ اس "تمغائے شرافت" کے حاصل ہونے سے ہمچشموں میں عزت و توقیر حاصل ہو۔

عورتوں کی تعلیم میں نمایش زیادہ تر مدنظر رکھی جاتی ہے۔

یہ مماثلت عورتوں کی تعلیم میں اور بھی زیادہ صراحت کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے جسمانی اور عقلی دونوں قسم کی تربیت کے لحاظ سے مردوں کی نسبت عورتوں میں آرایش کا عنصر ہمیشہ زیادہ تر غالب رہا ہے۔ ابتدا میں جسمانی آرایش پر مردوں اور عورتوں دونوں کی توجہ یکساں مبذول رہتی تھی۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ تہذیب کے اس آخری دور میں مردوں کے لباس میں ظاہری نمایش کا خیال آرام و آسایش کے خیال سے بہت کچھ مغلوب ہو گیا ہے اور اُن کی تعلیم میں بھی تھوڑے عرصہ سے مفید تعلیم نمایشی تعلیم پر غالب آتی جاتی ہے۔ مگر عورتوں کی حالت میں کیا باعتبار جسمانی تعلیم اور کیا باعتبار عقلی تعلیم کے کچھ ایسا فرق ظہور میں نہیں آیا۔ کانوں میں بالیاں، ہاتھوں میں انگوٹھی، چھلّے اور چوڑیاں، سر کے بالوں کو بڑے تکلف سے آراستہ کرنا، اب بھی گاہے گاہے رنگ کا استعمال کرنا، لباس کو کافی طور پر دلکش

اور خوش نما بنانے کے لئے بے حد محنت کرنا، اور عام دستور اور فیشن کے مطابق چلنے کی خاطر سخت تکلیف اٹھانا ان تمام باتوں سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ عورتوں کے لباس میں پسندیدگی کی خواہش نے بدن گرم رکھنے اور آرام دینے کی خواہش کو، جو لباس کی علت غائی ہے، کالعدم کر دیا ہے۔ علی ہذا القیاس عورتوں کی تعلیم میں جو تعلیم "ہنرمندی اور خوش سلیقگی" کے نام سے موسوم کی جاتی ہے۔ اُس کو بے حد فوقیت دی گئی ہے۔ اس سے بھی یہی ثابت ہے کہ نام و نمود کی خواہش فائدہ کے خیال پر غالب آگئی ہے۔ رقص[۱] و سرود باجا بجانا، مصوری، آداب نشست و برخاست، ان فنون کی تعلیم پر کیا کچھ زور دیا جاتا ہے! اگر تم سوال کرو کہ عورتوں کو اٹلی اور جرمنی کی زبانیں کیوں سکھائی جاتی ہیں! تو تم کو معلوم ہو جائے گا کہ خواہ کتنی ہی جھوٹی دلیلیں اس کی تائید میں پیش کی جائیں، اصل وجہ یہی ہے کہ ان زبانوں کی تعلیم عورتوں کے مناسب حال سمجھی جاتی ہے کچھ اس وجہ سے نہیں کہ ان زبانوں میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں، عورتیں اُن سے فائدہ اُٹھائیں۔ شاذونادر ہی کوئی عورت فائدہ اُٹھاتی ہوگی، بلکہ غرض اصلی یہ ہے کہ وہ اٹلی اور جرمنی زبانوں کے گیت گائیں اور اُن کی اس تحصیل علمی پر حیرت و استعجاب کے ساتھ لوگوں میں باہم سرگوشیاں ہوں۔ بادشاہوں کی ولادت، وفات، شادی اور اسی طرح دوسرے چھوٹے موٹے تاریخی واقعات کے سنہ و تاریخ اس وجہ سے نہیں یاد کرائے جاتے کہ اُن کے علم سے براہ راست کوئی مفاد حاصل ہو سکتا ہے۔ بلکہ اس وجہ سے کہ لوگ اس واقفیت کو عمدہ تعلیم کا جز خیال کرتے ہیں۔ اور اس وجہ سے کہ اگر عورتوں کو اس قسم کی واقفیت نہ ہو تو ممکن ہے کہ دوسرے لوگ اُن کو نظر حقارت سے دیکھیں۔ پڑھنا، لکھنا، املا

---

[۱] یہ بیان ممالک یورپ اور خصوصاً انگلستان کی تعلیم سے متعلق ہے۔ اُن ملکوں میں جب تک کسی عورت کو ناچنا، گانا، بجانا وغیرہ نہ آئے ملک کی تہذیب کے موافق اس کو ناتربیت یافتہ اور بدسلیقہ سمجھا جاتا ہے۔

مترجم

صرف و نحو، حساب اور سوزن کاری، بس قریب قریب کل یہی مضامین ہیں جو کسی لڑکی کو زندگی میں واقعی طور پر کار آمد ہونے کے خیال سے پڑھائے جاتے ہیں۔ ان میں سے بھی بعض مضامین ذاتی مفاد کے خیال سے نہیں بلکہ زیادہ تر اس غرض سے پڑھائے جاتے ہیں کہ دوسرے لوگ ان مضمون کی نسبت اچھی رائے رکھتے ہیں۔

عقلی تعلیم میں نمائش کے مقدم رکھنے کی وجہ

اس حقیقت کو پوری طرح سمجھنے کے لئے کہ مثل جسمانی تربیت کے عقلی تربیت میں بھی آرایش فائدہ پر مقدم ہے۔ ہم کو اُس کے اُصول پر ایک نظر ضرور ڈالنی چاہیئے۔ یہ اس امر پر مبنی ہے کہ نہایت ہی قدیم زمانہ سے لے کر حال کے زمانہ تک شخصی ضرورتیں جماعت کی ضرورتوں کے تابع رہی ہیں اور جماعت کی بڑی ضرورت یہ رہی ہے کہ افراد قوم کو اپنے قابو میں رکھے۔ ہم عموماً یہ خیال کرتے ہیں کہ بادشاہ، پارلیمنٹ اور باضابطہ حکّام کی حکومت کے سوا اور کوئی حکومت نہیں ہے۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ ان مسلّم حکومتوں کے علاوہ دوسری غیر مسلّم حکومتیں بھی ہیں جو تمام گروہوں میں نشو و نما پاتی ہیں۔ جن میں ہر زن و مرد، بادشاہ یا ملکہ یا رکن سلطنت بننے کی کوشش کرتا ہے۔ بعضوں سے سبقت لے جانا اور اُن سے اپنا ادب کرانا اور اپنے بالادستوں کو خوش رکھنا، اس کشمکش و کوشش میں ہر شخص مبتلا ہے۔ اور زندگی کی بڑی قوتیں اسی میں صرف ہوتی ہیں۔ ہر شخص اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ اجتماع دولت، طرز معاشرت، خوبصورت لباس، اور اظہار علم و دانش کے ذریعہ سے دوسرے لوگوں کو اپنا تابع فرمان بنائے اور اس طرح حدود و قیود کے اُس پھیلے ہوئے جال کے بننے میں مدد دیتا ہے، جس سے نظام تمدن قائم ہے۔ نہ صرف وحشی سردار جنگ کا ہیبت ناک رنگ اپنے بدن کو لگا کر اور کھوپریوں کی کھالیں[1] اپنی کمر سے لٹکا کر اپنے ماتحتوں پر اپنا رعب بٹھانا چاہتا ہے، نہ صرف حسین عورت اپنے پُر تکلف سنگار، شایستہ

[1] امریکہ کا وحشی باشندہ جب اپنے حریف پر فتح یاب ہو جاتا ہے تو اوس کی کھوپری کی کھال اُتار کر اپنی کمر سے باندھ لیتا ہے۔ یہ اس بات کا نشان ہے کہ اُس نے اپنے دشمن کو مغلوب کر کے قتل کر ڈالا ہے۔ مترجم

اطوار، اور بڑی خوش سلیقگی کے ذریعہ سے لوگوں کو "تسخیر کرنے" کی کوشش کرتی ہے، بلکہ عالم، مورخ اور فلسفی بھی اپنے اپنے علوم کو اسی غرض سے استعمال کرتے ہیں۔ ہم میں سے کوئی شخص اس بات پر قانع نہیں ہے کہ اپنی شخصیت کو پوری طرح چپ چاپ چاروں طرف پھیلا دے۔ بلکہ یہ بے چین کرنے والی خواہش لگی رہتی ہے کہ اپنی شخصیت دوسروں سے منوائی جائے اور کسی طرح سے اُن کو اپنا تابع فرمان بنایا جاسے اور یہی وہ بات ہے جو ہماری تعلیم کی نوعیت کا فیصلہ کرتی ہے۔ اس بات پر غور نہیں کیا جاتا کہ کون سے علم کی اصلی قدر و قیمت سب سے زیادہ ہے؟ بلکہ اس امر کا لحاظ رکھا جاتا ہے کہ سب سے زیادہ تعریف اور عزت و توقیر کس علم کے ذریعہ سے حاصل ہوتی ہے؟ کون سا علم اقران و امثال میں امتیاز و اعتبار حاصل کرنے کے لئے سب سے زیادہ مدد و معاون ہو سکتا ہے؟ کون سا علم لوگوں پر سب سے زیادہ اثر ڈال سکتا ہے؟ جس طرح عام زندگی میں یہ سوال پیش کیا جاتا ہے کہ دوسرے لوگوں کی ہماری نسبت کیا رائے ہے؟ نہ یہ کہ ہم درحقیقت کیا ہیں؟ اسی طرح تعلیم میں بھی یہ سوال نہیں ہوتا کہ علم کی اصلی اور ذاتی قدر و قیمت کیا ہے؟ بلکہ زیادہ تر یہی سوال ہوتا ہے کہ دوسرے لوگوں پر اُس علم کا ظاہری اثر کیا ہوتا ہے؟ چونکہ یہ خیال ہماری طبیعت پر مستولی ہے، اس لئے ہم کو علم سے براہ راست فائدہ اُٹھانے کا خیال اُس وحشی آدمی کی نسبت کچھ زیادہ نہیں ہوتا جو محض آرائش کے خیال سے اپنے دانتوں کو سوہن سے صاف کرتا اور اپنے ناخنوں کو رنگ سے رنگین کرتا ہے۔

مختلف علوم کی اضافی قیمت کا عام طور پر کوئی قاعدہ مقرر نہیں کیا گیا بلکہ رواج

اگر ہماری تعلیم کی ناشائستہ اور غیر ترقی یافتہ روش کی بابت شہادت مزید کی ضرورت ہو تو وہ اس امر پر غور کرنے سے حاصل ہو سکتی ہے کہ علم کی مختلف قسموں کی اضافی قدر و قیمت پر اب تک شاذ و نادر ہی بحث کی گئی ہے۔ اور باقاعدہ طور پر تو جس سے یقینی نتائج مستنبط ہوں، اور بھی کم بحث کی گئی ہے۔ یہی نہیں کہ علوم کی اضافی قدر و قیمت

یا تعصب پر اس کی بنا ہے

کے معیار پر ابھی تک عقلا نے اتفاق نہیں کیا۔ بلکہ صاف طور پر کسی ایسے معیار کے وجود کا تصوّر بھی نہیں کیا گیا۔ اور یہی نہیں کہ ایسے معیار کے وجود کا خیال تک نہیں کیا گیا بلکہ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ شاید ہی کبھی اُس کی ضرورت کو محسوس کیا گیا ہوگا۔ لوگ ایک خاص مضمون کی کتابیں پڑھتے ہیں اکسی دوسرے مضمون کے لکچر سنتے ہیں، اس بات کا پختہ ارادہ کر لیتے ہیں کہ اپنے بچوں کو علم کی فلاں فلاں شاخوں کی تعلیم دلائیں گے اور فلاں فلاں شاخوں کی تعلیم نہیں دلائیں گے۔ اور ان تمام امور کا تصفیہ محض دستور، رغبت، یا تعصب کی بنا پر کرتے ہیں اور اس ضروری اور مہتم بالشان امر پر غور نہیں کرتے کہ جو چیزیں در حقیقت سب سے زیادہ دیکھنے کے لایق ہیں ایک معقول طریقہ سے اُن کا تصفیہ کرلیں۔ یہ سچ ہے کہ تمام گروہوں میں ہم کسی نہ کسی علم کی عظمت کی بابت کبھی کبھی ذکر اذکار سنتے ہیں۔ لیکن جو وقت اُس کی تحصیل میں صرف کیا جاتا ہے۔ آیا اُس کی ضرورت کے درجہ کے لحاظ سے اس قدر وقت صرف کرنا ٹھیک بھی ہے یا نہیں ؟ آیا اُس علم سے زیادہ اہم اور ضروری دوسرے علوم جن پر وقت کا صرف کرنا زیادہ تر مفید ہے، موجود ہیں یا نہیں ؟ یہ ایسے سوال ہیں کہ اگر کبھی ان پر بحث ہوتی بھی ہے تو شخصی پاس داری کے لحاظ سے سرسری طور پر اُن کا تصفیہ کر دیا جاتا ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ ہم کبھی کبھی علوم ادبیہ اور علوم ریاضیہ کی اضافی قدر و قیمت کی بابت بحث و مباحثہ ہوتے سنتے ہیں۔ مگر یہ مباحثہ اِس طرح پر ہوتا ہے کہ لوگ اپنے اپنے ذاتی تجربہ کے مطابق رائے دیتے ہیں۔ اور تحقیق کے ساتھ کوئی معیار معین نہیں کیا جاتا۔ اور یہ تنقیح طلب سوال اُس عام سوال کے مقابلہ میں جس کا وہ ایک جزو ہے بے حقیقت ہے۔ مناسب **نصاب تعلیم** کے تصفیہ کے لیے اِس امر کا فیصلہ کر لینا کہ آیا ریاضی کی تعلیم سب سے بہتر ہے یا **علم ادب** کی یہ معنی رکھتا ہے کہ تمام **علم اغذیہ** کا حاصل کر لینا اس امر کے معلوم کرنے پر منحصر ہے کہ روٹی بہ نسبت آلو کے زیادہ مقوی ہے یا نہیں۔

مختلف علوم کی قیمت اضافی قرار دینے کی ضرورت و عظمت

امر زیر بحث جو نہایت مہتم بالشان ہے، یہ نہیں ہے کہ فلاں علم قابل قدر ہے۔ بلکہ یہ ہے کہ اس علم کی **اضافی قیمت** کیا ہے؟ جب لوگ کسی مقررہ نصاب تعلیم کے خاص فوائد بیان کرتے ہیں۔ جو اُن کو حاصل ہوئے ہیں تو وہ فرض کر لیتے ہیں کہ ہم نے تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے۔ مگر اس بات کو بالکل فراموش کر دیتے ہیں کہ آیا وہ فوائد کافی ہیں یا نہیں حالانکہ فیصلہ طلب امر یہی ہے۔ شاید کوئی بھی مضمون ایسا نہیں کہ لوگ اُس پر توجہ کریں اور اُس سے کچھ نہ کچھ فائدہ حاصل نہ ہو۔ اگر کوئی شخص **علم الانساب** و **علم الاسلحہ** کے حاصل کرنے میں ایک سال تک محنت کرے تو یہ بات بالکل ممکن ہے کہ اُس کو قدیم زمانہ کے اوضاع و اطوار اور آداب و اخلاق میں ذرا زیادہ بصیرت حاصل ہو جائے۔ اگر کوئی شخص انگلستان کے تمام شہروں کے درمیانی فاصلے یاد کرے تو ممکن ہے کہ اُن ہزار باتوں میں سے جو اُس نے حاصل کی ہیں ایک دو باتیں مدت العمر میں اُس کے لئے کارآمد ہوں جب کہ وہ کہیں سفر کرنے کا ارادہ کرے۔ کسی حصہ ملک کے تمام ادنیٰ درجہ کے زبان زد خلائق افسانوں کو جمع کرنا اگرچہ ایک بے فائدہ شغل ہے، تاہم ممکن ہے کہ یہی شغل کبھی کبھی کسی مفید بات کے قایم کرنے میں مدد دے مثلاً قدیم روایتوں کو نسلاً بعد نسل پہنچانے کی یہ ایک عمدہ صورت ہے۔ لیکن ان مثالوں میں ہر شخص تسلیم کرے گا کہ جو محنت ایسے علموں کو حاصل کرنے کے لئے درکار ہے۔ اُس کو کوئی مناسبت اس فائدہ سے نہیں ہے۔ جسکے حاصل ہونے کا احتمال ہے۔ کوئی شخص گوارا نہیں کرے گا کہ بہت زیادہ قیمتی علم کو چھوڑ کر ایک لڑکے کی عمر کے چند سال ایسے علم کے حاصل کرنے میں صرف کئے جائیں جس کو وہ اس قدر مدت صرف کئے بغیر یوں بھی حاصل کر سکتا تھا۔ پس اگر یہاں اضافی قیمت کے معیار کو مسلم سمجھا جاتا ہے تو پھر تمام علموں کو اسی کسوٹی پر کسنا اور اسی کسوٹی کو قطعی اور یقینی قرار دینا چاہیے۔ اگر ہم کو عمر نوح عطا کی جاتی اور جملہ علوم و فنون پر عبور حاصل کرنے کے لئے کافی وقت مل سکتا تو اس بات کا چنداں خیال نہ ہوتا۔ جیسا کہ ایک قدیم راگ کا مضمون ہے؎

کسی[1] کو اگلے وقتوں کی طرح گر یہ یقیں ہوتا
کہ ہے دنیا میں جینے کی مجھے صدیوں تلک مہلت

تو وہ کیا کیا کرشمے اپنی دانائی کے دکھلاتا!
اُسے یاں ہتی کیسی کیسی تحقیقات کی فرصت!

نہ کوئی فکر اطمینان میں اُس کے مخل ہوتا
نہ کرنی پڑتی گھبرا کر اُسے ہر کام میں عجلت

مگر ہماری مدت حیات نہایت قلیل ہے اس لئے تحصیل علم کے محدود زمانہ کو ھسترم دل نشین رکھنا چاہیے۔ اور اس بات کو یاد کر کے کہ یہ زمانہ نہ صرف مدت عمر کی کوتاہی بلکہ زیادہ تر مشاغل دنیاوی کی وجہ سے کس قدر محدود ہے۔ ہم کو خاص طور پر خیال رکھنا چاہیے کہ جو کچھ تھوڑا بہت وقت ہمارے پاس ہے اُس کو اس طرح کام میں لائیں کہ اُس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اوٹھائیں۔ دانشمندی فی الحقیقت اسی امر کی مقتضی ہے کہ جو علم عام رواج یا مذاق کے موافق ہو اُس پر چند سال صرف کرنے سے پہلے بڑی احتیاط کے ساتھ اس بات کا اندازہ کر لیا جائے کہ اگر وہی زمانہ دیگر علوم کی تحصیل میں صرف کیا جائے تو اس خاص علم کے نتائج بمقابلہ اُن نتائج کے جو دوسرے علوم کی تحصیل سے حاصل ہو سکتے ہیں کس قدر وقعت رکھتے ہیں؟

پس تعلیم کے تمام سوالوں میں سب سے مہتم بالشان یہی سوال ہے جس پر ذرا باقاعدہ بحث کرنے کا اب موقع ہے۔ بہ لحاظ اپنی عظمت کے سب سے مقدم مسئلہ (اگرچہ غور کرتے وقت اُس کو سب سے پیچھے ڈال دیا جاتا ہے) یہ ہے کہ مختلف مضامین جو ہماری توجہ کو اپنی طرف مائل کرنا چاہتے ہیں۔ اُن کے مختلف دعوؤں کا فیصلہ کیا جائے یعنی کس کس علم پر کس قدر توجہ کرنی چاہیے۔ کسی معقول نصاب تعلیم کے مقرر کرنے سے پہلے یہ بات ضرور طے کر لینی چاہیے کہ کن چیزوں کا جاننا سب سے زیادہ ضروری ہے۔ یا اگر بیکن[2]

---

[1] اصل کتاب میں بھی ایک نظم ہے۔ اس لئے نظم ہی میں اس کا ترجمہ کرنا مناسب خیال کیا گیا۔ یہ ترجمہ علاوہ مطلب خیز ہونے کے قریب قریب لفظی بھی ہے۔ مترجم

[2] بیکن انگلستان کا مشہور فلسفی اور مدبر سلطنت تھا ۱۵۶۱ء میں پیدا ہوا اور ۱۶۲۶ء میں انتقال کیا۔ مترجم

کا قول استعمال کریں (جو قسمتی سے اب متروک ہو گیا ہے۔ تو ہم کو "علوم کی اضافی قدر و قیمت" کا تصفیہ کرنا چاہئے۔

علوم مختلفہ کی اضافی قیمت کا معیار

اس غرض کے حاصل کرنے کے لئے قیمت کا ایک معیار مقرر کرنا نہایت ضروری ہے اور خوش قسمتی سے قیمت کے صحیح معیار کی بابت اگر اُس کو عام عبارت میں ظاہر کیا جائے تو کسی کو جائے کلام نہیں ہے۔ ہر شخص جب کسی خاص علم کی قدر و قیمت کی بابت بحث کرتا ہے تو زندگی کے کسی حصہ کے ساتھ اُس کا تعلق ظاہر کرتا ہے۔ اس سوال کے جواب میں کہ اس علم سے کیا فائدہ ہے؟ ریاضی داں۔ زباں داں۔ ماہر حیات اور فلسفی اپنے اپنے علم کا فائدہ بیان کرتے ہیں کہ کس طریقہ سے اُن کا علم عمل پر مؤثر ہے؟ کس طرح بدی سے بچاتا اور نیکی کی طرف رہ نمائی کرتا ہے؟ اور کیونکر خوشی کا موجب ہوتا ہے؟ جب خوش نویسی کا معلم یہ بات بتاتا ہے کہ خوش نویسی کاروبار میں کامیابی حاصل کرنے میں یعنی روزی کمانے میں یا یوں کہو کہ خاطر خواہ زندگی بسر کرنے میں بڑی مدد دیتی ہے تو وہ اپنے دعوے کو ثابت کر دکھاتا ہے۔ اور جب مردہ واقعات کا جمع کرنے والا (مثلاً قدیم سکوں اور کتبوں سے واقفیت رکھنے والا) اُن نتائج کو جو اُن واقعات سے انسانی بہبودی پر مترتب ہو سکتے ہوں صاف طور پر بیان کرنے سے قاصر رہتا ہے تو بالآخر اُس کو مجبوراً تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اُن چیزوں کا علم نسبتہً بے قدر اور ناکارہ ہے۔ غرض کہ صراحتاً یا کنایتاً سب اسی قطعی و یقینی معیار کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

تعلیم کی علت غائی

ہمارے واسطے بڑا ضروری سوال یہ ہے کہ "زندگی کیوں کر بسر کرنی چاہئے؟" یہاں "زندگی بسر کرنے" سے صرف جسمانی ضروریات کا پورا کرنا مقصود نہیں ہے۔ بلکہ یہ لفظ اپنے وسیع تر معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ عام سوال جو ہر ایک تمدنی سوال پر حاوی ہوتا ہے یہ ہے کہ ہر ایک حالت اور ہر ایک معاملہ میں اپنی روش و طرز عمل کو درست رکھا جائے مثلاً جسم کے ساتھ کس طرح سلوک کرنا چاہئے؟ نفس کے ساتھ کس طرح سلوک کرنا چاہئے؟ اپنے

معاملات کا کس طرح انتظام کرنا چاہیے؟ بال بچوں کی پرورش کس طرح کرنی چاہیے؟ تمدنی حیثیت سے کیا طرز عمل رکھنا چاہیے؟ خوشی کے ذرایع جو قدرت نے مہیا کئے ہیں اُن سے کس طرح فائدہ اُٹھانا چاہیے؟ یعنی اپنی تمام قوتوں کو خود اپنے تئیں اور دوسروں کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہونچانے کے لیے کیوں کر استعمال کرنا چاہیے؟ قصہ کوتاہ کامل طور پر کیوں کر زندگی بسر کرنی چاہیے؟ چوں کہ ہم کو کامل معاشرت کے سیکھنے کی بڑی ضرورت ہے اس لئے بڑی بات جو تعلیم سے حاصل ہونی چاہیے یہی ہے۔ تعلیم کو جو فرض ادا کرنا پڑتا ہے وہ یہ ہے کہ ہم کو پوری طرح زندگی بسر کرنے کے لئے تیار کردے اور نصاب تعلیم کی نسبت رائے قائم کرنے کا یہی ایک معقول طریقہ ہے کہ اس امر کی تحقیق کی جائے کہ وہ کس درجہ تک اس فرض کو پورا کرتا ہے۔

مختلف علوم کے اضافی قیمت کا معیار مقرر کرنے میں بہت احتیاط رکھنی چاہیے

اس معیار کو پورے طور پر درکنار جزوی طور پر بھی شاذونادر ہی استعمال کیا گیا ہے اور وہ بھی مبہم اور بے خبرانہ طریقہ سے اس لئے ضرورت ہے کہ اس معیار کو شعور اور باقاعدگی کے ساتھ اور تمام حالتوں میں کام میں لایا جائے۔ ہم کو لازم ہے کہ اس بات کو صاف طور پر اور ہمیشہ مد نظر رکھیں کہ معاشرت کامل کا اختیار کرنا ہی تعلیم کی علت غائی ہے تاکہ ہم بچوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت میں اس مقصد کو کامل طور پر پیش نظر رکھ کر غور و تامل سے مضامین و طرق تعلیم کا انتخاب کرسکیں۔ تعلیم کے معاملہ میں صرف یہی احتیاط ضروری نہیں ہے کہ عام دستور کو بے سوچے سمجھے اختیار کرلینے سے باز رہنا چاہیے۔ جو کسی دوسرے دستور سے بہتر قرار نہیں دیا جاسکتا۔ بلکہ ہم کو لازم ہے کہ کسی علم کی قدر و قیمت کو جانچتے وقت اُس ناشایستہ اور عملی طرز کو بھی ترک کردیں جس کو وہ لوگ اختیار کرتے ہیں جو ذرا زیادہ سمجھدار ہیں۔ اور اپنے بچوں کی عقلی ترقی کی نگرانی کا کچھ نہ کچھ خیال رکھتے ہیں۔ صرف یہ خیال کرلینا کافی نہ ہونا چاہیے کہ فلاں علم آیندہ زندگی میں مفید ہوگا۔ یا فلاں علم بہ نسبت فلاں علم کے زیادہ قدر و قیمت رکھتا ہے۔ بلکہ اُن کی اضافی قیمتوں کو معین کرنے کے لئے کوئی ایسی

ترکیب ڈھونڈھ کر نکالنی چاہیے جس سے حتی الامکان قطعی طور پر معلوم ہو جائے کہ کون سے علم سب سے زیادہ توجہ کے مستحق ہیں۔

مختلف علوم کی قدر و قیمت کا معیار مقرر کرنا بہت مشکل ہے

اس میں شک نہیں کہ یہ کام مشکل ہے بلکہ شاید اس میں پوری پوری کامیابی حاصل ہی نہیں ہو سکتی مگر جب کہ ان فوائد کی وسعت پر غور کیا جائے۔ جن کے زائل ہونے کا خطرہ ہے۔ تو یہ مشکل اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ کم ہمتی سے اُس کو نظرانداز کر دیا جائے بلکہ زیادہ تر اس بات کی دلیل ہے کہ اپنی تمام ہمت کو اُس میں مصروف کیا جائے۔ اور اگر ہم صرف باقاعدہ کارروائی کریں تو بہت جلد ہماری رسائی اُن نتائج تک ہو سکتی ہے جن کی وقعت کچھ کم نہیں ہے۔

زندگی کے مشاغل کی تقسیم ترتیب پانچ حصوں میں

ہمارا پہلا کام صریحاً یہ ہونا چاہیے کہ انسانی زندگی کے بڑے بڑے کاموں کی ضرورت و عظمت کے اعتبار سے اُن کے درجے مقرر کریں۔ قدرتی طور پر ان کاموں کی ترتیب اس طرح ہو سکتی ہے۔

(۱) وہ کام جو **حفاظت نفس** میں بلاواسطہ مدد دیتے ہیں۔

(۲) وہ کام جو ضروریات زندگی کو بہم پہنچا کر بالواسطہ **حفاظت نفس** کے لئے مدد دیتے ہیں۔

(۳) وہ کام جن کی غرض **پرورش و تربیت اولاد** ہے۔

(۴) وہ کام جو مناسب **تمدنی اور سیاسی تعلقات** پر مشتمل ہیں۔

(۵) وہ مختلف کام جو زندگی کے زمانہ فرصت کو مصروف رکھتے ہیں۔ اور مذاق اور **جذبات کی تفریح** کے واسطے مخصوص ہیں۔

حفاظت نفس سب کاموں پر مقدم ہونے کی وجہ

اس بات کے ثابت کرنے کے لئے کہ ان کاموں کو قریب قریب اُن کے اصلی درجہ کے موافق ترتیب وار بیان کیا گیا ہے۔ کچھ زیادہ غور و خوض کی ضرورت نہیں ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ وہ کام اور وہ پیش بینی جس کے ذریعے سے وقتاً فوقتاً **ذاتی حفاظت** حاصل

ہوتی ہے، اُس کو باقی تمام کاموں پر مقدم کرنا چاہیے۔ اگر کوئی آدمی مثل شیر خوار بچے کے اردگرد کی اشیا اور حرکات سے، یا اس بات سے کہ اُن کے درمیان کس طرح اپنی رہ نمائی کرے، ناواقف ہوتا تو وہ اوّل ہی مرتبہ باہر بازار میں نکلنے کے ساتھ ہی یقیناً اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا۔ خواہ دوسرے معاملوں میں اُسے کتنا ہی علم کیوں نہ ہوتا۔ اگر کوئی شخص باقی تمام باتوں سے ناواقف محض بھی ہو تو یہ امر اس قدر جلد اُس کی ہلاکت کا باعث نہیں ہو سکتا جس قدر کہ اس خاص معاملہ (حفاظت نفس) سے بالکل ناواقف ہونا منجر بہ ہلاکت ہے۔ پس یہ بات تسلیم کرنی چاہیے کہ جو علم حفاظت نفس میں براہ راست ممد و معاون ہو وہی سب سے زیادہ ضروری ہے۔

"بالواسطہ حفاظت نفس کا درجہ دوسرا ہے اور اس کی وجہ"

اس میں بھی کسی شخص کو کلام نہ ہوگا کہ "بلا واسطہ حفاظت نفس" کے بعد "بالواسطہ حفاظت نفس" کا درجہ ہے جس سے مراد ہے وسائل معاش کا حاصل کرنا کسب معیشت کے فرائض کو مادری، پدری فرائض پر مقدم سمجھنا اس دلیل سے ثابت ہے کہ عام طور پر فرائض والدین کی بجا آوری صرف اُس صورت میں ممکن ہے جب کہ پہلے سے کسب معیشت کے فرائض کو پورا کر لیا جائے۔ چونکہ اپنے نفس کو پرورش کرنے کی طاقت، اولاد کو پرورش کرنے کی طاقت سے لامحالہ مقدم ہے۔ اس لئے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جو علم اپنے نفس کی پرورش کے لئے درکار ہے، اُس کا حق زیادہ قوی ہے بہ نسبت اُس علم کے جو بال بچوں کے آرام و آسائش کے لئے ضروری ہے اور یہ علم باعتبار قدر و قیمت کے صرف اُس علم سے دوسرے درجہ پر ہے جو براہ راست حفظ نفس کے واسطے ضروری ہے۔

فرائض والدین کی ملکی و تمدنی فرائض پر مقدم ہیں اس کے دلائل

چوں کہ قدامت زمانہ کے اعتبار سے خاندان سلطنت سے پہلے ہے۔ چوں کہ بچوں کی پرورش، سلطنت کے قائم ہونے سے پہلے یا اوس کے معدوم ہو جانے کے وقت بھی ممکن ہے اور چوں کہ سلطنت کا وجود صرف بچوں کی پرورش کے ذریعہ سے ممکن ہے۔ اسلئے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ والدین کے فرائض، ملکی و تمدنی فرائض کی نسبت زیادہ غور و توجہ کے

محتاج ہیں۔ اس خصوص میں ایک اور دلیل پیش کی جا سکتی ہے۔ چوں کہ عامہ ناس کی فلاح و بہبودی بالآخر باشندگان شہر کی طبیعت پر منحصر ہے۔ اور چوں کہ باشندگان شہر کی طبیعت بہ نسبت کسی دوسری شے کے ابتدائی تربیت کے ذریعہ سے زیادہ تر تبدیل ہو سکتی ہے پس ہم کو یہ نتیجہ ضرور نکالنا چاہیے کہ خاندان کی بہبودی عامہ ناس کی بہبودی کی بنیاد ہے۔ اور اس وجہ سے جو علم خاندان کی بہبودی میں براہ راست مدد و معاون ہو اُس کو اُس علم پر ضرور فوقیت دینی چاہیے جو براہ راست عامہ ناس کی بہبودی کا معاون ہو۔

شغلی تفریح اور حفاظت نفس کا درجہ سب سے آخری اور اسکی سبب

سنجیدہ مشاغل کے بعد جو وقت فرصت باقی رہتا ہے اُس کو پورا کرنے کے لئے آرام و راحت کے مختلف مشغلے مثلاً **موسیقی۔ شاعری۔ مصوّری۔ وغیرہ** تمدن کے پہلے سے موجود ہونے پر بہ صراحت دلالت کرتے ہیں۔ ان فنون کا معقول ترقی کرنا بغیر اس کے کہ لوگوں میں تمدنی اتحاد عرصہ دراز سے قائم ہو، نہ صرف محال ہے بلکہ ان فنون کا نفس مضمون ہی زیادہ تر تمدنی جوش اور ہمدردی پر مشتمل ہے۔ صرف اتنی ہی بات نہیں کہ ان علموں کی ترقی کے واسطے تمدن ضروری شرط ہے بلکہ وہ خیالات اور جذبات بھی جن کو یہ علوم ظاہر کرتے ہیں، تمدن ہی کی بدولت پیدا ہوتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ انسان کے چال چلن کا وہ حصّہ جو تمدنی حقوق کو عمدہ طور پر ادا کرنے کے متعلق ہے، اُس حصّہ سے زیادہ وقعت رکھتا ہے جو زینت و آرائش یا مذاق کی تربیت میں صرف ہوتا ہے اور جو تعلیم انسان کو پہلے کام کے لئے تیار کرتی ہے اُس کا درجہ اس تعلیم سے مقدم ہونا لازم ہے جو دوسرے کام کے لئے تیار کرتی ہے۔

بیان مذکورۂ بالا کا اعادہ اور تعلیم کے مختلف حصّوں کا باہمی تعلق

اب ہم اسی مضمون کو دہراتے ہیں کہ تعلیم کی مختلف شاخوں کی عقلی ترتیب اُن کی ضرورت کے لحاظ سے قریب قریب حسب ذیل ہے۔

**اوّل۔ وہ تعلیم جو بلاواسطہ حفاظت نفس کے لئے تیار کرتی ہے**

**دوم۔ وہ تعلیم جو بالواسطہ حفاظت نفس کے لئے تیار کرتی ہے**

سوم۔ وہ تعلیم جو فرائض والدین کے لئے تیار کرتی ہے۔

چہارم۔ وہ تعلیم جو حقوق تمدن کے پورا کرنے کے لئے تیار کرتی ہے۔

پنجم۔ وہ تعلیم جو زندگی کے مختلف مشاغل تفریح کے لئے تیار کرتی ہے جو تمدن کے ساتھ وابستہ ہیں۔

اس بیان سے ہماری یہ مراد نہیں ہے کہ یہ شاخیں قطعی طور پر ایک دوسرے سے جدا ہو سکتی ہیں۔ ہم اس بات سے انکار نہیں کرتے کہ وہ پیچیدہ طور پر ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہیں اور ایسا ہو نہیں سکتا کہ اُن میں سے کسی ایک قسم کی تعلیم دی جائے اور اُس سے باقی ماندہ شاخوں کی کچھ نہ کچھ تعلیم حاصل نہ ہو جائے۔ ہم کو اس میں بھی کلام نہیں ہے کہ تعلیم کی ہر ایک شاخ میں ایسے حصے موجود ہیں جو مسبوق الذکر شاخوں کے بعض حصوں کی نسبت زیادہ ضروری ہوتے ہیں۔ مثلاً ایسا شخص جس کو کاروبار میں بہت مہارت ہو، مگر دوسری قوتیں کم رکھتا ہو۔ ممکن ہے کہ وہ کامل معاشرت کے درجہ سے بہ نسبت اُس شخص کے بہت دور جا پڑے جس کو روپیہ کمانے میں تو متوسط درجہ کی لیاقت ہو، مگر فرائض والدین کی انجام دہی میں اُس کی سمجھ بوجھ بہت عمدہ ہو۔ یا مثلاً جو شخص اصلی حقوق تمدن سے کامل واقفیت رکھتا ہو، مگر علم ادب اور فنون لطیفہ[۱] کی عام تعلیم سے بالکل بے بہرہ ہو۔ ایسے شخص کی دنیا میں کم ضرورت ہے۔ بہ نسبت اُس شخص کے جس کو حقوق تمدن سے معمولی درجہ کی واقفیت ہو، اور علم ادب اور فنون لطیفہ سے بھی کچھ کچھ واقفیت ہو۔ لیکن اس ضروری تفریح کے بعد بھی ان شاخوں میں بہت کچھ نمایاں فرق باقی رہتا ہے اور یہ بات پھر بھی بجائے خود صحیح و درست ہے کہ ان شاخوں کا درجہ ترتیب مذکورۂ بالا کے مطابق ایک دوسرے کے بعد ہے۔ چوں کہ تعلیم کی ان پانچ شاخوں کے مقابلہ

[۱] فنون لطیفہ سے مراد وہ فنون ہیں جو قوت متخیلہ پر منحصر ہیں۔ مثلاً شاعری، مصوری، معماری، موسیقی۔ بعض اوقات صرف شاعری اور مصوری پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ مترجم

میں زندگی کے پانچ درجے موجود ہیں، لہذا یہ بات ممکن ہے کہ یہ شاخیں بھی اُسی ترتیب سے ایک دوسرے کے بعد واقع ہوں۔

تعلیم کے مختلف حصّوں میں اُن کی قدر وقیمت کے لحاظ سے معقول تناسب قایم رکھنا ضروری ہے

تعلیم کا منتہائے کمال تو یہی ہے کہ ان تمام علموں میں پورا کمال حاصل ہو جائے لیکن اگر ایسا کمال حاصل کرنے میں کامیابی نہ ہو، جیسا تہذیب و تمدن کی موجودہ حالت میں ہر شخص کو تھوڑی بہت ناکامیابی ضرور ہوتی ہے، تو تعلیم کا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ ہر ایک حصّے کی تیاری کے درجوں میں ایک **معقول تناسب** قایم رکھا جائے۔ یہ نہ ہو کہ کسی ایک حصّے میں بدرجۂ غایت لیاقت حاصل کی جائے اگرچہ وہ حصّہ نہایت ہی ضروری ہو، یہ بھی نہ ہو کہ صرف دو تین یا چار حصّوں پر جو سب سے زیادہ ضروری ہوں تمام تر توجہ مبذول کی جائے، بلکہ سب حصّوں پر توجہ کرنی چاہیئے۔ جو حصّہ قدر وقیمت میں سب سے زیادہ ہو اُس پر سب سے زیادہ، جو کم ہو اُس پر کم، اور جو سب سے کم ہو اُس پر سب سے کم توجہ کرنی چاہیئے۔ کیوں کہ اوسط درجہ کے آدمی کے واسطے (اس بات کو بھولنا نہیں چاہیئے کہ خاص آدمیوں کو علم کی کسی ایک شاخ میں خاص قابلیت ہوتی ہے اور وہ قابلیت اُسی علم کی تحصیل کو روٹی کمانے کا مشغلہ بنا دیتی ہے) ضرورت اس بات کی ہے کہ اُس کو ایسی چیزوں کی تقریباً کامل تعلیم دی جائے جو کامل معاشرت میں سب سے زیادہ مدد و معاون ہوں اور جن چیزوں کو کامل معاشرت سے کم تعلق ہو اُن کی تکمیل کی طرف اسی قدر کم توجہ کی جائے۔

باعتبار قدر وقیمت کے علم کی تین قسمیں اور اُن کی تشریح مثالوں کے ذریعہ سے

اس معیار کے ذریعہ سے تعلیم کا انتظام کرنے میں بعض عام باتیں غور طلب ہیں، جن کو ہمیشہ مدنظر رکھنا چاہیئے۔ کسی قسم کی تربیت کی قدر وقیمت اس حیثیت سے کہ اُس سے کامل معاشرت میں مدد ملتی ہے، یا تو لازمی ہوتی ہے، یا کم و بیش عارضی ہوتی ہے۔ پس علم کی تین قسمیں ہو سکتی ہیں۔ ایک وہ علم جس کی قیمت اصلی و ذاتی ہے۔ دوسرے وہ علم جو فی الجملہ اصلی و ذاتی قیمت رکھتا ہے۔ تیسرے وہ علم جس کی قیمت رسمی ہے یعنی صرف لوگوں کی نظر میں اُس کی وقعت ہے مثلاً اس قسم کے واقعات کہ "اعضا میں ایک جسی

اور سنسناہٹ کا پیدا ہو جانا فالج سے پہلے عموماً محسوس ہوتا ہے۔" "جو جسم پانی میں حرکت کرتا ہے۔ پانی کی مزاحمت اس کی شرح رفتار کے مربع کے لحاظ کم یا زیادہ ہوتی رہتی ہے" "کلارین[۱] دافع امراض متعدیہ ہے" یہ واقعات اور عموماً سائنس کے حقائق مسلمہ حقیقی اور اصلی قدر وقیمت رکھتے ہیں۔ یہ حقائق اب سے دس ہزار برس بعد بھی انسان کے اعمال و افعال پر ویسا ہی اثر کریں گے جو اب کرتے ہیں۔ اپنی مادری زبان (انگریزی) کا ضرورت سے زیادہ علم جو لاطینی اور یونانی زبانوں کی واقفیت سے حاصل ہوتا ہے فی الجملہ اصلی و ذاتی قیمت رکھتا ہے۔ ان زبانوں کی قدر ہمارے واسطے، اور ان دوسری نسلوں کے واسطے جن کی زبانیں ان سرچشموں کی بہت کچھ احسان مند ہیں، ضرور باقی رہنی چاہیے۔ لیکن یہ علم صرف اس وقت تک قایم رہے گا جب تک ہماری زبانیں قایم ہیں۔ ہاں البتہ اس قسم کا علم جس کی تعلیم تاریخ کے غلط نام سے ہمارے مدرسوں میں دی جاتی ہے یعنی محض ناموں، تاریخوں اور مردہ و بے معنی واقعات کا سلسلہ، صرف رسمی قدر و قیمت رکھتا ہے۔ اس علم کو ہمارے کسی فعل سے بعید سے بعید علاقہ بھی نہیں ہے۔ اور یہ علم محض عوام الناس کی اس ناگوار حرف گیری سے بچنے کے لئے کارآمد ہے، جو اس قسم کی تاریخی معلومات نہ ہونے کی وجہ سے کی جاتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اُن واقعات کو جو ہر زمانہ میں تمام بنی نوع انسان سے تعلق رکھتے ہیں، بہ نسبت اُن واقعات کے، جن کا تعلق ایک محدود زمانہ تک نوع انسان کے صرف ایک حصہ سے ہے، زیادہ وقعت دینی چاہیے، مگر بہ نسبت اُن واقعات کے جن کا تعلق نوع انسان کے صرف ایک حصے کے ساتھ اتنی ہی مدت تک ہی ہے جب تک کہ ایک خاص فیشن کا رواج قائم ہے" ان علم واقعات کو اور بھی زیادہ وقعت کی نگاہ سے دیکھنا لازم ہے۔ پس اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اصلی اور ذاتی قیمت والے علم کو اس علم پر مقدم سمجھنا لازم ہے، جو فی الجملہ ذاتی قیمت یا محض رسمی قیمت رکھتا ہے، بشرطیکہ

---

[۱] کلارین [illegible] رنگ کی ایک [illegible] گیس ہے جو عام نمک کا ایک جزو ہے۔ مترجم

باقی امور مساوی ہوں۔

تحصیل علم کی قدر و قیمت دو وجہ سے ہے۔ اوّل باعتبار تعلیم کے دوم باعتبار تربیت کے

اسی مضمون کے متعلق ہم ایک اور تمہید بیان کرتے ہیں۔ ہر قسم کی تحصیل علم دو وجہ سے قابل قدر ہے اوّل بوجہ نفس علم کے جو اُس سے حاصل ہوتا ہے۔ دوسرے باعتبار تربیت کی ہر طرح کے واقعات کی واقفیت، قطع نظر اس کے کہ وہ ہمارے کردار اور رویہ کی ہدایت کے لیے مفید ہے۔ اس وجہ سے بھی سودمند ہے کہ اُس سے عقل بڑھتی ہے۔ اور تحصیل علم کے نتائج پر اس حیثیت سے کہ وہ ہم کو کامل معاشرت کے واسطے تیار کرتے ہیں، ان دونوں فائدوں کو مد نظر رکھ کر غور کرنا چاہیے۔

پس نصاب تعلیم پر بحث کرتے وقت ان عام خیالات کو پیش نظر رکھنا لازم ہے: اوّل، زندگی کی تقسیم مختلف قسم کے کاموں میں، جو بہ لحاظ عظمت و ضرورت کے بتدریج ایک دوسرے سے کم تر درجہ پر واقع ہیں۔ دوم ہر قسم کے واقعات کی حقیقی، فی الجملہ حقیقی اور رسمی قدر و قیمت جس کے ذریعہ سے یہ مختلف کام باقاعدہ منضبط رہتے ہیں۔ سوم۔ ان واقعات کا باضابطہ اثر جس کا اندازہ تعلیم اور تربیت دونوں حیثیتوں سے کرنا چاہیے۔

تعلیم بلاواسطہ حفاظت نفس کی تعلیم کا انتظام قدرت نے اپنے ہی ہاتھ میں رکھا ہے

تعلیم کا جو حصہ سب سے زیادہ ضروری ہے یعنی "بلاواسطہ حفاظت نفس"، خوش قسمتی سے اُس کے لیے تو پہلے ہی سامان مہیا کر دیا گیا ہے۔ چونکہ یہ تعلیم اس قدر اہم اور معظم بالشان ہے کہ اُس کو ہمارے بھروسے پر نہیں چھوڑا جا سکتا تھا کہ آئے دن پڑے ٹھوکریں کھایا کریں۔ اس کو ہمارے بھروسے اُس کو اپنے ہی ہاتھ میں رکھا ہے۔ شیرخوار بچہ ابھی انا کی گود میں ہوتا ہے اور چلنے پھرنے کی طاقت نہیں رکھتا، کہ اجنبی شخص کی صورت دیکھ کر اپنا منہ چھپا لیتا اور رونے لگتا ہے۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ بچہ کی فطرت میں بھی اُس عقل حیوانی کا ظہور ابتدائی طور پر پایا جاتا ہے جس کے ذریعہ سے ہم ایسی نئی اور نامعلوم شے سے بھاگ کر بچتے ہیں جس کے خطرناک ہونے کا احتمال ہے

اور جب بچہ پاؤں چل سکتا ہے، اور کسی اجنبی کتّے کے پاس آنے سے خوف کھاتا ہے
یا کسی چوکنّا کر دینے والی آواز یا نظارہ کے بعد چیخ مار کر اپنی ماں کے پاس دوڑ جاتا ہے
تو اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عقل حیوانی نے اور زیادہ ترقی کی ہے۔ اس کے علاوہ
جو علم "بلا واسطہ حفاظت نفس" میں مدد معاون ہے۔ اُس کے حاصل کرنے میں بچہ ہر
گھڑی مصروف رہتا ہے۔ اپنے جسم کو کس طرح سنبھالنا چاہیئے؟ اپنی حرکات کو کس طرح
قابو میں رکھنا چاہیئے۔ تاکہ صدمہ اور ٹکر سے محفوظ رہے؟ کون سی چیزیں سخت ہیں۔ جن
کی ٹکر یا دھکّے سے چوٹ لگ جاتی ہے؟ کون سی چیزیں بھاری ہیں۔ اور ہاتھ پاؤں
پر گرنے سے تکلیف دیتی ہیں؟ کون سی چیزیں جسم کا بوجھ سہار سکتی ہیں اور کون سی
نہیں سہار سکتیں؟ آگ۔ آلات حرب اور نوک دار اوزار سے کیسی تکلیف پہنچتی ہے؟
یہ سب باتیں اور اسی قسم کی مختلف معلومات جو موت یا حادثہ سے بچنے کے لئے ضروری
ہے، بچہ ہمیشہ حاصل کرتا رہتا ہے۔ چند سال کے بعد جب اس کی قوتیں گھر سے باہر
نکل کر دوڑنے، اُچھلنے، کودنے، کسی چیز پر چڑھنے اور زور آزمائی یا ہنرمندی کے
کرتبوں میں صرف ہوتی ہیں، تو ہم دیکھتے ہیں کہ یہ سب کام جن کے ذریعہ سے رگ پٹھے
نشوونما پاتے ہیں، قوت مدرکہ تیز ہوتی ہے اور قوت فیصلہ سرعت کے ساتھ اپنا عمل کرنے
لگتی ہے، ہم کو اس بات کے لئے تیار کرتے ہیں، کہ آس پاس کی اشیا اور حرکات
کے درمیان جسم کو کیوں کر محفوظ رکھنا چاہیئے اور اُن بڑے بڑے خطروں کا کس طرح
مقابلہ کرنا چاہیئے، جو کبھی کبھی ہر شخص کی زندگی میں پیش آتے رہتے ہیں۔ چوں کہ اس
ضروری اور بنیادی تعلیم کا اہتمام قدرت نے نہایت عمدہ طور پر کر دیا ہے، اس لئے
اُس پر توجہ کرنے کی ضرورت نسبتہً کم ہے۔ خاص طور پر جس بات کا خیال رکھنا ہم کو لازم
ہے وہ یہ ہے کہ اس تجربہ اور اس تربیت کے حاصل کرنے کے لئے بچوں کو بے روک
ٹوک موقع ملتا رہے۔ اور مقتضائے فطرت کی تکمیل میں کوئی امر مانع نہ ہو، جیسا کہ بیوقوف

معلمات، لڑکیوں کو جو اُن کی زیرِ نگرانی ہیں، قدرتی چستی و چالاکی اور کود پھاند میں مصروف ہونے سے روک دیتی ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ نسبتہً اس قابل نہیں رہتیں کہ خطرہ کے موقعوں پر اپنی حفاظت آپ کر سکیں۔

"بلا واسطہ حفاظت نفس" کی دوسری قسم

جو تعلیم "بلا واسطہ حفاظت نفس" کے واسطے تیار کرتی ہے، یہ ہرگز نہیں سمجھنا چاہیے کہ اس تعلیم میں صرف وہی باتیں داخل ہیں، جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ کسی ہتیار یا اوزار کے صدمہ یا ضرر سے جسم کو بچانے کے علاوہ دوسرے سببوں سے جو نقصان پہنچ سکتا ہے اُس سے بھی جسم کو محفوظ رکھنا لازم ہے۔ مثلاً بیماری اور موت جو قانون فزیالوجی[1] کے خلاف ورزی کا نتیجہ ہے۔ کامل معاشرت کے لئے صرف یہی امر ضروری نہیں ہے کہ اُن اسباب کو دفع کیا جائے جن سے یکایک زندگی کا خاتمہ ہو جاتا ہے بلکہ اُن بے عقلی کی حرکتوں اور نادانی کی عادتوں سے بھی جو آہستہ آہستہ کام تمام کرتی ہیں، بچنا چاہیے۔ چوں کہ صحت و طاقت کے بغیر تمام کاموں کا پورا کرنا کم و بیش محال ہے خواہ وہ کام دست کاری کے متعلق ہوں، خواہ فرائض والدین اور تمدن وغیرہ کے متعلق، اِس لئے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ "بلا واسطہ حفاظت نفس" کی یہ دوسری قسم بہ لحاظ عظمت و ضرورت کے صرف پہلی قسم سے کم تر درجہ پر ہے، اور جو علم اوس کے حاصل کرنے میں مدد و معاون ہو اُس کا درجہ بہت بلند ہونا چاہیے۔

مختلف کیفیتیں جو ہمکو محسوس ہوتی ہیں۔ ہمارے قدرتی بندے ہیں

یہ سچ ہے کہ اس خصوص میں بھی قدرت نے ہدایت کا سامان کسی قدر پہلے ہی مہیا کر دیا ہے۔ طرح طرح کے جسمانی احساس اور خواہشوں کے ذریعہ سے قدرت نے بڑی بڑی ضرورتوں کو پورا کرنے کی خاصی ذمہ داری اپنے اوپر لے لی ہے۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ خوراک کی احتیاج، سخت گرمی یا حد درجہ کی سردی کا محسوس ہونا ایسی اٹل تحریک ہمارے دل میں پیدا کرتا ہے، کہ اُس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اور اگر

---

[1] فزیالوجی وہ علم ہے جس میں حیوانات و نباتات کے اعضا اور اُن کے عمل اور طرز عمل سے بحث ہوتی ہے۔ مترجم

اس قسم کی تحریکوں کا حکم عادۃً اُسی وقت بجالائیں، جب کہ اُن کا عمل زیادہ قوی نہ ہو، تو نسبتۂ بہت کم خرابیاں پیدا ہونگی۔ اگر ہمیشہ اُسی وقت کام چھوڑ دیا جاے جبکہ وقت جسم یا دماغ کام کرتے کرتے تھک جائے۔ اگر بند ہوا سے حبس پیدا ہوتے ہی مکان میں ہوا پہنچانے کا ہمیشہ بندوبست کر دیا جائے، اگر بغیر بھوک کے کھانا نہ کھائیں اور بغیر پیاس کے پانی نہ پئیں، تو ایسی صورت میں شاذونادر ہی وقوع میں آئیگی کہ ہمارا نظام کام سے جواب دیدے۔ مگر زندگی کے قوانین سے لوگ اس قدر بے خبر ہیں کہ وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ یہ احساسات اُن کے قدرتی رہنما ہیں۔ اور اگر ایک مدت دراز تک اُن کے حکموں کی نافرمانی کرکے اُن کو واماندہ اور بیکار نہ بنا دیا جائے تو قابل اعتبار رہنما ہیں۔ پس اگرچہ قدرت الٰہی نے آفرینشِ عالم کی غرض وغایت کو پیش نظر رکھ کر صحت کی حفاظت کے لیے عمدہ رہبر بہم پہنچا دیے ہیں۔ تاہم لاعلمی اُن کو بہت کچھ بیکار اور نکما بنا دیتی ہے۔

علم فزیالوجی کی ناواقفیت بیماری کا باعث ہے اور بیماری کے نقصانات

اگر کسی شخص کو اس بات میں شک ہو کہ کامل معاشرت کی غرض سے علم فزیالوجی کے اصول سے باخبر ہونا کیا کچھ ضروری ہے، تو اُس کو چاہیے کہ اپنی چاروں طرف نظر ڈالے اور دیکھے، کہ کتنے ادھیڑ یا جوانی سے ڈھلے ہوئے عورت و مرد ایسے مل سکتے ہیں جو پورے تن درست ہوں۔ ایسی مثال تو کبھی کبھار دیکھنے میں آتی ہے کہ کوئی شخص بڑھاپے تک صحیح وسالم اور چاق چوبند رہے۔ مگر سخت بیماری، مزمن امراض، عام کمزوری، اور قبل از وقت ضعیفی کی مثالیں ساعت بساعت ہمارے مشاہدے میں آتی ہیں۔ مشکل ہی سے کوئی ایسا آدمی ملے گا جسے مدت العمر میں کوئی ایسا مرض لاحق نہ ہوا ہو کہ اگر اُس مرض کی بابت تھوڑی سی واقفیت ہوتی تو وہ اُس سے بچ سکتا ہے۔ کہیں گھٹیا کے بخار کی وجہ سے، جو بدن کو غفلت کے باعث کھلا رکھنے کا نتیجہ ہے، قلبی مرض پیدا ہو جاتا ہے۔ کہیں کثرت مطالعہ سے عم

عمر بھر کے لئے آنکھیں خراب ہو جاتی ہیں۔ کل ایک شخص کا ذکر کیا گیا تھا جس کا پاؤں مدت تک اس وجہ سے لنگ کرتا رہا کہ اوس کے گھٹنے میں خفیف سی چوٹ آگئی تھی۔ اور باوجود درد اور تکلیف کے اُس نے چلنا پھرنا ترک نہیں کیا تھا۔ اور آج ایک اور شخص کا حال ہم سے بیان کیا گیا ہے جس کو برسوں بستر بیماری پر اس وجہ سے پڑا رہنا پڑا کہ اُس کو یہ معلوم نہ تھا کہ اختلاج قلب کا مرض، جس میں وہ مبتلا ہے، دماغ سے بہت زیادہ کام لینے کا نتیجہ ہے۔ اس وقت ہم ایک ناقابل علاج صدمہ کا ذکر سنتے ہیں، جو زور آزمائی کے کسی احمقانہ کرتب کا نتیجہ ہے۔ اور پھر ایسے شخص کا حال سننے میں آتا ہے جس کا جسم **کثرت کار** سے، جو خواہ مخواہ بلا ضرورت اختیار کیا گیا تھا، پھر کبھی صحت یاب نہ ہوا۔ اور دائمی خفیف امراض تو جن کے ساتھ کمزوری بھی لگی رہتی ہے، ہر طرف دیکھنے میں آتے ہیں۔ تکلیف، تکان، افسردہ دلی، وقت اور روپیہ کی بربادی یہ سب بیماری کے نتیجے ہیں۔ ان کی تفصیل کو چھوڑ کر صرف اس بات پر ہی غور کرو کہ بیماری جمیع فرائض کے ادا کرنے میں کیا کچھ رکاوٹ اور **مزاحمت** پیدا کرتی ہے! بسا اوقات کام کرنا بالکل محال ہو جاتا ہے اور زیادہ دشوار تو ہمیشہ ہو جاتا ہے۔ مزاج میں چڑچڑاپن پیدا ہو جاتا ہے جو اولاد کی باقاعدہ تربیت کے لئے سم قاتل ہے۔ فرائض تمدن کا ادا کرنا تو ایک طرف رہا، تفریح و دلبستگی کے سامان وبال جان ہو جاتے ہیں۔ کیا یہ بات صاف ظاہر نہیں ہے کہ جسمانی گناہ، کسی قدر ہمارے آباو اجداد کے اور کسی قدر ہمارے اپنے جن سے یہ بیماری پیدا ہوتی ہے، اکمال معاشرت میں بہ نسبت کسی دوسری شے کے زیادہ تر خلل انداز ہوتے ہیں اور زندگانی بجائے اس کے کہ برکت و راحت کا موجب ہو، زیادہ تر وبال و مصیبت کا باعث ہو جاتی ہے؟

بیماری سے سخت نقصان بھی پہنچتا ہے

بیماری سے یہی نقصان نہیں ہیں جو اوپر بیان کئے گئے ہیں۔ علاوہ اس کے کہ زندگی اس طرح سے نہایت خراب اور تباہ ہو جاتی ہے، زندگی کا خاتمہ بھی جلد ہو جاتا

اس کی وجہ سے زندگی کا خاتمہ ہوجاتا ہے

ہے - یہ بات صحیح نہیں ہے، جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے، کہ کسی بیماری سے شفایاب ہونے کے بعد ہم بدستور سابق تن درست و توانا ہوجاتے ہیں - ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ اعضائے جسمانی کے باقاعدہ عمل میں فتور واقع ہو اور اس کے رفع ہونے کے بعد نظام بدن بالکل اُسی طرح قائم رہے، جیسا کہ پہلے تھا۔ بلکہ مستقل اور دیرپا نقصان پہنچتا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ نقصان فوراً محسوس نہ ہو، مگر ہوتا ضرور ہے۔ اور ایسی ہی ذرا ذرا سی اور باتوں سے جن کو قدرت اپنے سخت حساب کتاب میں کبھی نہیں چھوڑتی، یہ صدمہ بھی لامحالہ ہماری مدت عمر کو گھٹانے میں ہمارے برخلاف موثر ہوتا ہے۔ خفیف صدموں کے جمع ہونے سے یہ نتیجہ پیدا ہوتا ہے کہ جسم عموماً وقت سے بہت پہلے کمزور ہوجاتا اور اندر ہی اندر گھل جاتا ہے۔ اور اگر ہم اس بات کو یاد رکھیں کہ ہماری مدت عمر کا اوسط، عمر طبیعی سے کس قدر کم ہے تو ہم سمجھ سکتے ہیں کہ کیا کچھ نقصان عظیم ہورہا ہے، اخراب صحت کی وجہ سے مدت حیات میں جو بہت کچھ کمی ہوتی رہتی ہے، اگر اس بڑے آخری نقصان کو بھی اس میں شامل کرلیا جائے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ بالعموم نصف عمر ضائع و برباد جاتی ہے۔

قوانین صحت کی واقفیت کیوں ضروری ہے

پس وہ علم جو اس طرح نقصان صحت کو روکنے کی وجہ سے "بلا واسطہ حفاظت نفس" میں ممد و معاون ہو۔ اُس کی عظمت اوّل درجہ کی ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ ایسے علم کے حاصل کرلینے سے اس خرابی کا پورا پورا دفعیہ ہوسکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ تمدن کی موجودہ صورت میں لوگوں کی ضرورتیں ان کو اکثر اوقات خلاف ورزی پر مجبور کرتی ہیں۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اس قسم کی مجبوری نہ ہو تو بھی لوگوں کا میلان طبیعت برخلاف اُنکے اعتقاد کے اُن کو اکثر اوقات اس بات کی طرف لے جاتا ہے۔ کہ آیندہ سود و بہبود کو، موجودہ حالت و آرام پر قربان کردیتے ہیں۔ مگر ہم اس بات پر زور دیتے ہیں کہ صحیح علم اگر صحیح طور پر دل نشین کیا جائے تو اس کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ اور چونکہ قوانین صحت کی پوری طرح تعمیل کرنے سے پہلے ان کو بھی کچھ سمجھ لینا ضرور ہے اس لئے ہم اس بات پر بھی

زور دیتے ہیں کہ معقول معاشرت اختیار کرنے سے پہلے، خواہ وہ کبھی حاصل ہو، اس علم کو حاصل کرنا ضروری ہے۔ چونکہ قوی صحت اور اعلیٰ درجہ کی چستی و زندہ دلی پر بہ نسبت کسی دوسری شے کے زیادہ تر خوشی کا دار مدار ہے۔ اس لئے اس امر کی تعلیم کہ اُن کو کس طرح قایم رکھنا چاہیے، ایسی تعلیم ہے، جس کا درجہ بہ لحاظ عظمت و ضرورت کے اور کسی تعلیم سے کم نہیں ہے۔ اسی وجہ سے ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ علم **فزیالوجی** کا اس قدر نصاب جو اُس کے عام اصول، اور روزانہ برتاؤ سے اُن اصول کے تعلقات کو سمجھنے کے لئے درکار ہے، معقول تعلیم کا نہایت ہی ضروری جز ہے۔

دنیا کی عقل ایسی اوندھی ہے کہ غیر ضروری چیزوں کو ضروری چیزوں پر ترجیح دیجاتی ہے

تعجب ہے کہ ایسی موٹی سی بات کے بیان کرنے کی ضرورت ہو! اور اُس کی تائید و حمایت کی ضرورت ہو تو اور بھی زیادہ تعجب ہے! تاہم ایسے آدمیوں کی تعداد کچھ کم نہیں ہے، جو اس بات کو سُن کر ایک طرح کا تمسخر کریں گے۔ جن لوگوں کی زبان سے بجائے **اِفجینیا**[1] کے اِفجینیا نکل جاوے اور دوسرے لوگ اُس پر گرفت کریں تو وہ اپنی اس غلطی پر منفعل ہوتے ہیں۔ یا کسی افسانہ کے **نیم دیوتا**[2] کے جھوٹے کارناموں سے ناواقف ہونے کا اُن پر الزام لگایا جاوے تو وہ اس بات کو اپنی توہین سمجھ کر برا مانتے ہیں۔ وہی لوگ اس قسم کی باتوں سے کہ "**یوسٹاکین ٹیوب**[3] کہاں ہیں"؟

[1] یونان کے مشہور مصنف **یوری پڈیز** نے ایک ناٹک لکھا ہے جس کا موضوع ایک لڑکی مساۃ **افجینیا** کو قرار دیا گیا ہے اس کی نسبت بیان کیا گیا ہے کہ اُس کے باپ نے اپنی منت پوری کرنے کے لئے اپنی لڑکی کو **آرٹمس** دیوی کی بھینٹ چڑھا دیا تھا۔ مگر دیوی اُس کو قربان گاہ سے اٹھا کر شہر ٹارس میں لے گئی۔ اور وہاں یہ لڑکی اوس کے پجاریوں میں شامل ہو گئی۔ مترجم

[2] نیم دیوتا سے وہ فرضی سورما مراد ہے جس کا باپ دیوتا اور ماں انسان ہو۔ مترجم

[3] سولھویں صدی عیسوی میں **یوسٹاکی** اس نامی ایک مشہور طبیب اور علم تشریح الاجسام کا عالم اٹلی میں گزرا ہو۔ اُس نے اپنی تحقیقات میں دریافت کیا ہے کہ کان کے خلا سے لیکر منہ کے پچھلے حصے تک ہوا کی آمد و رفت کے لئے ایک پتلی سی نلی لگی ہوئی ہے۔ چونکہ اس نلی کو سب سے پہلے **یوسٹاکی** اس نے دریافت کیا تھا۔ اس لئے دریافت کنندہ کے نام پر اُس کا نام یوسٹاکین ٹیوب رکھدیا گیا ہے یعنی یوسٹاکی اس کی دریافت کی ہوئی نلی ٹیوب کے معنی نلی کے ہیں

"ریڑھ کی ہڈی کے مہروں کا عمل کیا ہے"؟ "نبض کی باقاعدہ شرح رفتار کیا ہے"؟ "پھیپھڑوں میں ہوا کیوں کر بھر جاتی ہے"؟ اپنی ناواقفیت کو تسلیم کرتے وقت ذرا بھی شرمندہ نہیں ہوتے۔ جس حالت میں کہ لوگ اس بات کے خواہش مند رہتے ہیں کہ ان کے لڑکے اب سے دو ہزار برس پہلے کے توہمات باطلہ میں طاق ہو جائیں، ان کو اس بات کی پرواہ نہیں رہے کہ ان کی اولاد کو خود اپنے اجسام کی بناوٹ اور ان کے افعال کی بھی کسی قدر تعلیم دی جائے، نہیں بلکہ ان کی خواہش یہی ہے کہ ان کو ایسی تعلیم نہ دی جاوے۔ مقررہ **دستور العمل** کا اثر کیا کچھ ہماری طبیعت پر غالب آگیا ہے! شائستی تعلیم نے کس زور و شور کے ساتھ مفید تعلیم کو پیچھے ڈال دیا ہے۔

علم معاشی کی عظمت مسلم ہے

ہم کو اس علم کی قدر و قیمت پر اصرار کرنے کی ضرورت نہیں ہے جو حصول معاش کو آسان کر دینے کی وجہ سے "بالواسطہ حفاظت نفس" میں مدد دیتا ہے۔ اس کو سب تسلیم کرتے ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ عوام الناس شاذ اسی علم کو حد سے زیادہ تعلیم کی غایت سمجھتے ہیں۔ مگر جب کہ ہر شخص اس مسئلہ کو کہ "جو تعلیم نوجوانوں کو زندگی کے کاروبار کے لائق بناتی ہے وہ بہت ضروری بلکہ سب سے زیادہ ضروری ہے" اجمالاً تسلیم کرنے کے لیے تیار ہے۔ شاذ ہی کوئی شخص دریافت کرتا ہو کہ کونسی تعلیم ان کو اس قابل بنا سکتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ لکھنے، پڑھنے اور حساب کے فوائد کو اچھی طرح سوچ سمجھ کر بچوں کو ان مضمونوں کی تعلیم دی جاتی ہے۔ مگر تقریباً ان ہی تینوں مضمونوں پر جن کا ہم نے نام لیا ہے اس تعلیم کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ ان کے سوا علم کا بڑا ذخیرہ جو حاصل کیا جاتا ہے اس کو صنعت و حرفت کے کاموں سے کچھ تعلق نہیں ہوتا۔ اور بہت سا علم جو صنعت و حرفت کے کاموں سے براہ راست تعلق رکھتا ہے اس سے قطع نظر کی جاتی ہے۔

زندگی کے تقریباً تمام

بعض ادنیٰ ترین جماعتوں کو چھوڑ کر خود غور کرو کہ تمام آدمی کس کام میں مصروف ہیں

کاموں میں سائنس کی ضرورت ہے

وہ تجارتی مال کے پیدا کرنے، تیار کرنے اور تقسیم کرنے میں مصروف ہیں اور بھلا تجارتی مال کے پیدا کرنے، تیار کرنے اور تقسیم کرنے کی لیاقت کس بات پر منحصر ہے؟ یہ بات اُن طریقوں کے استعمال پر منحصر ہے، جو مختلف قسم کے تجارتی مال کے لئے مناسب ہیں۔ یہ بات اُس کے طبعی، کیمیائی، اور حیاتی خواص پر جیسی کہ صورت ہو منحصر ہے یا یوں کہو کہ یہ بات سائنس پر منحصر ہے۔ یہ علم جس کو ہمارے مدرسوں کے نصاب میں نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ یہی علم اُن کاموں کو درستی کے ساتھ انجام دینے کی بنیاد ہے جن کے ذریعہ سے تمدنی زندگی ممکن ہے۔ اگرچہ اس محقق امر میں کسی کو مجال انکار نہیں ہے، تاہم لوگ عملاً اُس سے ناآشنا ہیں۔ اس قدر موانست ہی اُس سے بیگانگی کا باعث ہے۔ پس اپنی دلیل کو واجبی تقویت دینے کی غرض سے ہم کو لازم ہے کہ واقعات پر جلدی سے ایک نظر ڈال کر اس حقیقت کو ناظرین پر منکشف کر دیں۔

صنعت حرفت کے تمام کاموں [میں] حساب کی ضرورت ہے

سب سے زیادہ دقیق اور عقلی علم منطق ہے۔ جو سوداگر تجارتی مال کثرت سے پیدا کرتے یا تقسیم کرتے ہیں اُن کے کارخانوں کی کام یابی منطق کی باضابطہ ہدایت پر منحصر ہے۔ خواہ اُن کو اس بات کا علم ہو خواہ نہ ہو۔ مگر اس دقیق علم سے قطع نظر کر کے ہم سب سے پہلے علم ریاضی کو لیتے ہیں۔ اس علم کا سب سے زیادہ عام حصہ جس میں اعداد سے بحث ہوتی ہے۔ یعنی حساب، صنعت و حرفت کے تمام کاروبار میں رہنمائی کرتا ہے، خواہ اُس سے کارروائیوں کی درستی مقصود ہو، خواہ تخمینہ بنانا، خواہ تجارتی مال کا خریدنا فروخت کرنا، خواہ حساب کتاب رکھنا، عقلی علم کے اس حصہ کی قدر و قیمت پر زور دینے کی ضرورت نہیں ہے۔

فن تعمیر و نجاری و مساحت ریلوے کے تمام کاموں [میں] ہندسہ کی [ضرورت ہے]

اعلیٰ درجہ کے فنون تعمیر کے واسطے علم ریاضی کی خاص خاص شاخوں سے واقفیت بہم پہنچانی نہایت ہی ضروری ہے۔ دیہاتی نجار جو عملی قاعدوں سے اپنا کام چلاتا ہے بڑھیا برج کے معمار کی طرح، اُس کو بھی تعلقات مکانی کے قوانین سے ہر گھڑی

کام پڑتا ہے۔ پیمائش کرنے والا جو خریدی ہوئی زمین کی پیمائش کرتا ہے میر عمارت جو ایک عالی شان محل کا نقشہ تجویز کرتا ہے معمار جو مکان کی بنیاد رکھتا ہے راج جو پتھروں کو گھڑتا ہے۔ اور مختلف کاریگر جو کیل کانٹے یا پرزوں کو درستی کے ساتھ اپنی جگہہ پر بٹھا دیتے ہیں ان سب لوگوں کو اپنے اپنے کاموں میں حقائق علم ہندسہ سے ہدایت حاصل ہوتی ہے ریلوے بنانے کا انتظام شروع سے لے کر آخر تک علم ہندسہ کے ذریعہ سے عمل میں آتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس پلین[1] اور سکشن[2] کے تیار کرنے میں، لین نکالنے میں، پشتوں اور نالیوں وغیرہ کی پیمائش میں، پلوں، نالیوں، دریا یا وادی کے محراب نما پلوں، زمین دوز رستوں، اسٹیشنوں وغیرہ کے نقشے بنانے اور تعمیر کرنے میں علم ہندسہ سے کام لیا جاتا ہے۔ بندرگاہیں، لنگرگاہیں، سمندری بند، فن تعمیر و انجنیری کے مختلف کام کی جو سواحل بحر پر مثل جھالر کے واقع ہیں، اور ملک کے اندر جا بجا پھیلے ہوئے ہیں۔ نیز سرنگیں جو زمین کے اندر ہی اندر چلی جاتی ہیں۔ ان سب کی وہی کیفیت ہے۔ اور آج کل کسان کو بھی صحیح طور پر کھیت کی نالیاں بنانے کے واسطے ہموار سطح کا خیال رکھنا پڑتا ہے یا یوں کہو کہ اُس کو اصول علم ہندسہ کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔

اب اُن علموں کی طرف توجہ کرو جو عقلی و مادی دونوں حیثیتیں رکھتے ہیں۔ ان میں سے سب سے آسان علم یعنی جر ثقیل کے استعمال پر زمانہ حال کی صنعت کا دار

[1] کسی عمارت کی وغیرہ کے متوازی الافق یا نیچے کی سطح کے نقشے کو انگریزی میں پلین Plan کہتے ہیں۔ مترجم

[2] کسی عمارت وغیرہ کے ایسے نقشے کو جس سے اُس کی اندرونی حالت معلوم ہو جائے۔ انگریزی میں سکشن section کہتے ہیں۔ مترجم

ودار ہے۔ ہر ایک کل میں ڈنڈی[1]، پہیہ دُھری وغیرہ کے خواص کو تسلیم کیا جاتا ہے اور اس زمانہ میں تمام پیداوار کلوں ہی کی بدولت ہے۔ ذرا ایک گروہ نان کی سرگزشت کا کھوج لگاؤ۔ جس زمین سے یہ روٹی پیدا ہوئی ہے اُس کو کل سے بنے ہوئے کھپروں کے ذریعہ سے خشک کیا گیا تھا۔ کلوں ہی کے ذریعہ سے اس کی مٹی اُلٹ پلٹ کی گئی تھی۔ کلوں ہی کے ذریعہ سے گیہوں کاٹے، گاہے اور برسائے گئے تھے۔ کلوں ہی کے ذریعہ سے اُن کو پیسا اور چھانا گیا تھا۔ اور اگر آٹا گاسپورٹ[2] بھیجا گیا ہو تو ممکن ہے کہ کل ہی کے ذریعہ سے بسکٹ بنائے گئے ہوں۔ اب جس کمرہ میں تم بیٹھے ہو، اُس کے چاروں طرف نظر ڈالو۔ اگر یہ کمرہ حال کا بنا ہوا ہے تو اُس کی دیواروں کی اینٹیں غالباً کل کی بنی ہوئی ہونگی۔ کلوں ہی کے ذریعہ سے فرش کے تختوں کو چیر کر صاف کیا گیا تھا۔ کلوں ہی کے ذریعہ سے آتش دان کی الماری کے تختوں کو چیر کر جلا دی گئی تھی۔ کلوں ہی کے ذریعہ سے کاغذ کی جھالریں بنائی اور چھاپی گئی تھیں۔ عمدہ لکڑی کی پتلی تہ جو میز کے اوپر چڑھائی گئی ہے، کرسیوں کے مڑے ہوئے پائے، قالین، پردے یہ سب کلوں کا نتیجہ ہیں۔ تمہارے پہننے کے کپڑے، سادے، منقش یا چھپے ہوئے، کیا بالکل کل ہی کے بُنے ہوئے بلکہ سلے ہوئے نہیں ہیں؟ اور جو کتاب تم پڑھ رہے ہو کیا اُس کے اوراق ایک کل ہی کے ذریعہ سے نہیں بنے ہیں اور اس کے الفاظ دوسری کل کے ذریعہ سے نہیں چھپے

[1] مفرد آلات جن کو علم جر ثقیل کی اصطلاح میں قواے آلیہ کہتے ہیں چھ ہیں:- (۱) ڈنڈی (یعنی لوہے وغیرہ کی لمبی چھڑ) (۲) سطح مائل (۳) پہیہ دُھری (۴) پیچ (۵) چرخی (۶) خانہ۔ پیچیدہ سے پیچیدہ کل کے پرزے ان چھوٹی چیزوں سے باہر نہیں ہوتے۔ مترجم

[2] گاسپورٹ انگلستان کا ایک شہر ہے۔ لندن سے [illegible] میل جنوب و مغرب کی طرف واقع ہے صنعت و دستکاری کی وجہ سے مشہور ہے۔ مترجم

ہیں؟ اس پر اتنا اور اضافہ کر دو کہ ان چیزوں کی خشکی اور تری کی راہ ملک بہ ملک
پہنچا دینے کی وجہ سے بھی اس طرح ہم کلوں کے ممنون احسان ہیں۔ اب غور کرو کہ ان
مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے جس قدر اچھی یا بُری طرح **علم جرّثقیل** کو کام میں لاتے
ہیں اُسی قدر کامیابی یا ناکامی حاصل ہوتی ہے۔ جو انجینیر کاٹ کڑی اور مصالح کی قوت و
پائداری کا اندازہ صحیح طور پر نہیں کرتا۔ اُس کا بنایا ہوا پل ٹوٹ جاتا ہے۔ جو **صنّاع**
خراب کل سے کام لیتا ہے، وہ دوسرے صنّاع سے جس کی کل رگڑ اور حرکت و سکون
کی حالت میں کم گھستی ہے، کبھی سبقت نہیں لے جا سکتا۔ جو **جہاز بنانے والا** پرانے
نمونہ پر جہاز بناتا ہے، اُس کا جہاز اُس شخص کے جہاز سے پیچھے رہ جاتا ہے جو سمندری
موجوں کا لحاظ رکھ کر، اُس اُصول کے موافق جہاز بناتا ہے، جس کو علم جرّثقیل نے صحیح
قرار دیا ہے۔ چوں کہ ایک قوم کی قابلیت دوسری قوموں کے
کے مقابلہ میں اپنی حالت کو قایم و برقرار رکھنے کے لیے افراد
قوم کی ہنرمندی اور عملی قوت پر منحصر ہے۔ اس لیے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ قومی قسمت
کی کل جرّثقیل کی بدولت چلتی ہے۔

علم الحرارت علم مناظر و مرایا قوت برقی و مقناطیسی کے کرشمے

**علمِ طبیعات** جو دونوں حیثیتیں رکھنے والے علم کے اُن حصّوں سے لے کر جو پیسنے والی قوتوں
سے بحث کرتے ہیں اُن حصّوں تک پہنچ کر جن میں سالمات کی قوتوں سے بحث کی
جاتی ہے۔ مفید کاموں کے ایک وسیع سلسلہ تک ہماری رسائی ہوتی ہے۔ اس قسم
کے علموں کی بدولت جب کہ علوم مذکورہ بالا کو بھی ان کے ساتھ شامل کر دیا جائے۔
**دخانی انجن** بنایا گیا ہے جو لاکھوں کروڑوں مزدوروں کا کام کرتا ہے **علم طبیعات**
کے اُس حصّہ نے جس میں قوانین حرارت سے بحث ہوتی ہے۔ ہم کو سکھا دیا ہے کہ

---

لہ کسی شے کے ایسے چھوٹے سے چھوٹے ذروں کو جن کی مزید تقسیم ممکن نہ ہو انگریزی میں ایٹم atoms
اور عربی میں سالمات اور اجزاے لایتجزے بھی کہتے ہیں۔ مترجم

مختلف کارخانوں میں ایندھن کو کفایت شعاری کے ساتھ کیوں کر صرف کرنا چاہیئے؟
دھاتوں کی گلانے والی بھٹیوں میں ہوا کے سرد جھوکے کو گرم جھوکے میں تبدیل کرکے
اُن کی پیداوار کو کیوں کر بڑھانا چاہیئے؟ کانوں میں کیوں کر ہوا پہنچانی چاہیئے؟
قندیل امن کے استعمال سے کانوں کے اُڑ جانے کے صدمہ کو کیوں کر روکنا چاہیئے؟
اور مقیاس الحرارت کے ذریعے سے بہت سے بے شمار کاموں کا باضابطہ انتظام
کیوں کر کرنا چاہیئے؟ اس علم کا وہ حصہ جس کا موضوع روشنی ہے۔ اور جس کو
علم مناظرہ مرایا کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ بڈھوں اور ضعیف البصر آدمیوں
کو آنکھیں دیتا ہے خردبین کے ذریعہ سے امراض اور خراب چیزوں کی آمیزش کا کھوج
لگانے میں مدد دیتا ہے اور ترقی یافتہ روشنی[1] کے میناروں کے ذریعے سے جہازوں
کو تباہی سے محفوظ رکھتا ہے قوت برقی اور قوت مقناطیسی کی تحقیقاتوں نے
قطب نما کی بدولت بے شمار جانوں اور بے قیاس دولت کو بچایا ہے۔ بہت سے
فنون کو عکسی چھاپے کے ذریعہ سے مدد دی ہے۔ اور اب تار برقی کا ایک ایسا
وسیلہ بہم پہنچا دیا ہے۔ جس سے آیندہ چل کر تجارتی معاملات کا باضابطہ انتظام ہوگا۔
اور ملکوں میں راہ رسم اور تعلقات پیدا ہوں گے۔ باورچی خانہ کے ترقی یافتہ
کاروبار سے لے کر آلہ مشخص الصور[2] تک جو ملاقات کے کمرہ میں میز پر دھرا رہتا ہے
خانگی زندگی کی ذرا ذرا سی باتوں میں بھی علوم طبعی کی اعلیٰ شاخیں ہمارے آرام و آسایش

---

[1] بندرگاہ کے دروازہ پاس حل سمندر کے کسی مقام پر ایک بلند مینار بنایا جاتا ہے۔ اس مینار کے اوپر کے حصہ پر نہایت تیز روشنی کی جاتی ہے۔ تاکہ رات کے وقت ملاحوں کو جہازرانی میں رہنمائی ہو۔ انگریزی میں اس مینار کو لائٹ ہوس ( ) کہتے ہیں۔ ہم نے اس کا ترجمہ روشنی کا مینار کیا ہے مترجم

[2] آلہ مشخص الصور ترجمہ ہے سیٹریوسکوپ ( ) کا اس آلہ کے ذریعہ سے تصویروں کی شکلیں مجسم نظر آتی ہیں۔ مترجم۔

اور حفظ نفس کی بنیاد ہیں۔

بیشمار دستکاریوں میں علم کیمیا کے عجیب و غریب کرشمے

**علم کیمیا** کے کرشمے اس سے بھی زیادہ بے شمار ہیں۔ کپڑا دھونے والا، رنگنے والا، اور چھینٹیں چھاپنے والا، ان لوگوں کا کام جہاں تک کیمیائی قوانین کے موافق یا ناموافق ہو اسی قدر اچھا یا بُرا ہوتا ہے۔ تانبے، قلعی، جست، سیسے، چاندی، لوہے وغیرہ کے گلانے میں علم کیمیا ہی کی ہدایت درکار ہے۔ شکر صاف کرنا، گیس بنانا، **صابون** کو جوش دینا، بارود بنانا یہ سب کام اور علیٰ ہذا القیاس **شیشے** اور **چینی** کے کام، ایک حد تک علم کیمیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ بات کہ "غیر خمیر شیدہ بوزہ کو الکحل کے درجہ تک حرارت پہنچائی جائے تو وہ اپنی اصلی حالت پر قایم رہتا ہے یا تیزاب اور سرکہ بن جاتا ہے" ایک کیمیائی سوال ہے جس کے ساتھ کلال کا نفع یا نقصان وابستہ ہے۔ اور اگر بوزہ کشی کا کاروبار وسیع ہو تو وہ اپنے کارخانہ میں ایک کیمیاگر کو نوکر رکھ سکتا ہے۔ حقیقت میں آج کل شاید ہی کوئی کام ایسا ہو جس کے کسی نہ کسی حصّہ پر علم کیمیا کا تسلّط نہ ہو۔ نہیں، بلکہ اس زمانہ میں **زراعت** کو بھی کامیابی سے چلانے کے لئے علم کیمیا ہی کی رہنمائی درکار ہے۔ مختلف قسم کی کھاد اور مٹی کی تحلیل اس امر کی تشریح کہ وہ کس قسم کی پیداوار کے واسطے مناسب ہیں **نوسادر** تیار کرنے کے واسطے سنگ جراحت یا دیگر اشیا کا استعمال کرنا، **حیوانات کا فضلہ**، جو متحجر صورت میں زمین سے برآمد ہوتا ہے، اُس کو کام میں لانا، **مصنوعی کھادوں** کا تیار کرنا، یہ سب کچھ علم کیمیا کی برکت ہے جس سے واقفیت حاصل کرنی کسان کا فرض ہے دیا سلائی بنانے میں، غلیظ اور گندہ پانی کی **بدبو** دور کرنے میں، **عکسی تصویر** اُتارنے میں، بغیر خمیر کے **ڈبل روٹی** بنانے میں، **فضلہ** سے عطر نکالنے میں، غرض ہم دیکھتے ہیں کہ تمام دستکاریوں میں علم کیمیا کا اثر ہے۔ اور اسی وجہ سے یہ علم ہر ایک شخص کے لئے جس کو بالواسطہ یا بلاواسطہ دستکاریوں سے تعلق ہو ضروری ہے۔

علم ہیئت کے فوائد

مادی علوم میں سب سے پہلے ہم علم ہیئت کو لیتے ہیں۔ اس علم سے فن جہاز رانی نکلا ہے جس کی بدولت عظیم الشان بیرونی تجارت ہوتی ہے جس سے ہماری آبادی کا ایک بڑا حصہ پرورش پاتا ہے اور ہماری بہت سی ضروریات اور آرام و آسایش کی اکثر چیزیں مہیا ہوتی ہیں۔

علم طبقات الارض دستکاری میں کیونکر مدد دیتا ہے

علم طبقات الارض بھی ایسا علم ہے، جس کی واقفیت دستکاری کی کامیابی میں بہت کچھ مدد دیتی ہے۔ اب جب کہ لوہے کی خام دھات دولت کا بہت بڑا ذریعہ ہے اور سوال بڑا دلچسپ ہو گیا ہے، کہ پتھر کے کوئلے کا ذخیرہ کب تک قایم رہے گا اور ہمارے یہاں معدنیات کا کالج اور طبقات الارض کی تحقیقات کا سررشتہ قایم ہو گیا ہے تو اس بات پر مفصل بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ زمین کی بالائی سطح کا مطالعہ ہماری اصل بہبودی کے لئے ضروری ہے۔

علم بیالوجی کی فضیلت اور دستکاری سے اس کا تعلق

اب علم الحیات (بیالوجی[ل]) کو لو۔ کیا یہ علم بھی "بالواسطہ حفاظت نفس" کے ان کاموں سے بالذات تعلق نہیں رکھتا؟ فی الحقیقت اُن کاموں سے جن کو عموماً دستکاری کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، اس علم کو بہت کم تعلق ہے۔ مگر جو دستکاری سب سے زیادہ اہم ہے، یعنی خوراک حاصل کرنا۔ اس سے تو ایسا تعلق ہے کہ دونوں کا جدا ہونا محال ہے۔ چونکہ یہ بات ضرور ہے کہ زراعت کے طریقے نباتاتی اور حیوانی زندگی کے مظاہر قدرت کے مطابق ہوں، اس لئے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ان مظاہر قدرت کا علم زراعت کی معقول بنیاد ہے۔ علم بیالوجی کے مختلف حقایق اپنے ذاتی تجربہ سے کسانوں نے قایم کر لئے ہیں اور اُن پر عمل کرتے ہیں حالانکہ اب تک سائنس کی حیثیت سے اُن پر غور نہیں کیا گیا۔ مثلاً یہ کہ خاص کھادیں خاص پودوں کے واسطے

---

ل علم بیالوجی میں زندگی اور زندہ چیزوں یعنی حیوانات و نباتات کے حالات سے بحث ہوتی ہے اس کا اردو ترجمہ علم الحیات کیا گیا ہے۔ مترجم

مناسب ہیں" "بعض فعلین زمین کو دوسری فصلوں کے لئے ناقابل کر دیتی ہیں" "گھوڑے ادنیٰ خوراک پر عمدہ کام نہیں کر سکتے" "مویشیوں اور بھیڑوں کی خاص خاص بیماریاں خاص خاص حالتوں سے پیدا ہوتی ہیں" یہ سب باتیں اور وہ علم جو پودوں اور حیوانوں کی پرورش کے متعلق کاشتکار کو روزمرہ حاصل ہوتا رہتا ہے، علم بیالوجی کے واقعات کا ذخیرہ ہیں۔ اور اس معلومات کی وسعت پر اُس کی کامیابی کا زیادہ تر دارومدار ہے جبکہ ان واقعات سے۔ گو وہ قلیل غیر معین اور ابتدائی حالت میں ہوں۔ کاشتکار کو اس قدر ضروری مدد ملتی ہے، تو اب انصاف کرو کہ جب یہ واقعات قطعی، معین، اور مکمل ہو جائیں، اُس وقت اُن کی قدر و قیمت کیا کچھ ہوگی۔ درحقیقت ہم اب بھی اُن منافع کو دیکھ سکتے ہیں جو علم بیالوجی کی عقلی تعلیم سے روز بروز اُس کو حاصل ہوتے رہتے ہیں۔ یہ حقیقت کہ "حرارت غریزی کا پیدا ہونا خوراک کے خرچ ہو جانے پر دلالت کرتا ہے اور اسی وجہ سے حرارت کے نقصان کا روکنا زائد خوراک کی ضرورت کو روکتا ہے" محض قیاسی نتیجہ ہے۔ لیکن یہی نتیجہ مویشی کو موٹا تازہ بنانے میں آج کل رہنمائی کرتا ہے اور یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ مویشی کو گرم رکھنے سے چارہ کی کفایت ہوتی ہے اسی طرح مویشی کو مختلف قسم کی خوراک دینی مفید ہے۔ عالمانِ فزیالوجی کے تجربوں سے ثابت ہو گیا ہے کہ نہ صرف خوراک کی تبدیلی مفید ہے بلکہ ہر ایک کھانے میں مختلف اجزا کی آمیزش سے ہاضمہ میں سہولت ہوتی ہے۔ وہ مرض جو "سٹیگرز[1]" کے نام سے مشہور ہے، جس سے ہزاروں بھیڑیں ہر سال مرتی ہیں، ایک قسم کے کیڑے سے پیدا ہوتا ہے، جو دماغ پر دباؤ ڈالتا ہے اور اگر اس جانور کو کھوپڑی کی اُس ملایم جگہہ سے جو اُس کا نشیمن ہے باہر نکال دیا جائے، تو بھیڑ عموماً بچ جاتی ہے۔ یہ تحقیقات زراعت

[1] سٹیگرز۔ گھوڑوں اور دوسرے مویشیوں کی ایک بیماری ہے جس کی وجہ سے وہ لڑکھڑا کر یکایک گر پڑتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔ مترجم

پر علم بیالوجی کا ایک اور احسان ہے۔

علم المعاشرت کو صنعت و حرفت سے براہ راست تعلق ہے

ابھی ہم کو ایک اور علم کا ذکر کرنا باقی ہے جس کو دستکاری کی کامیابی سے براہ راست تعلق ہے یعنی علم المعاشرت۔ جو لوگ روزمرّہ اس بات پر نظر رکھتے ہیں کہ بازار میں روپیہ کی مانگ کس قدر ہے۔ مروجہ قیمتوں پر غور کرتے ہیں۔ غلّہ، روئی، شکر، اون، ریشم کی تخمینی پیداوار پر بحث کرتے ہیں۔ جنگ پیش آنے کے احتمالات کا موازنہ کرتے ہیں، اور ان واقعات مسلّمہ کی رو سے اپنے تجارتی کاروبار کا تصفیہ کرتے ہیں۔ وہ سب علم المعاشرت کے طالب علم ہیں گو ممکن ہے کہ وہ محض ذاتی تجربہ سے نہ کہ علمی اصول سے اُس کا مطالعہ کریں اور ٹھوکریں کھائیں۔ پھر بھی طالب علم ہیں۔ اگر صحیح نتیجے پر پہنچ گئے تو انعام حاصل کرلیا، ورنہ ناکام رہ کر منافع سے محروم رہے۔ نہ صرف بڑے بڑے دستکاروں اور سوداگروں کو بلکہ خردہ فروشوں کو بھی، ایسا کرنا چاہیے کہ اپنے مال کی رسد اور مانگ کا اندازہ قایم کرکے جو بہت سی باتوں پر منحصر ہے اور اثر معاشرت کے چند عام اصول کو چپ چاپ تسلیم کرنے کے بعد اپنے کاروبار کو چلائیں۔ اُن کی خوشحالی بہت کچھ اس امر پر منحصر ہے کہ وہ ایسے معاملات میں صحیح راے قایم کریں کہ آیندہ چل کر مال کی قیمت یک مشت فروخت کرنے کی صورت میں کیا ہوگی۔ اور مال کی نکاسی کی شرح کیا ہوگی۔ ظاہر ہے کہ جو شخص کسی جماعت کے پیچیدہ تجارتی کاروبار میں شریک ہو، اُس کو اُن قوانین کے سمجھنے سے گہرا تعلق ہے جن کے موافق اُن کاموں میں تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے۔

سائنس کی شاخوں کی ہر شخص کے ضروری ہے عدم واقفیت سے نقصان پیدا ہوتا ہے

پس جو لوگ تجارتی مال کے پیدا کرنے، خرید و فروخت کرنے، یا تقسیم کرنے میں مشغول ہیں۔ اُن سب کے لیے سائنس کی بعض شاخوں کی واقفیت نہایت ضروری ہے ہر شخص جس کو کسی قسم کی دستکاری سے بلا واسطہ یا بالواسطہ تعلق ہے (اور ایسے اشخاص بہت ہی کم ہیں جن کو کسی قسم کا تعلق نہ ہو) اُس کو کسی نہ کسی طرح ریاضی، طبعی اور

کیمیائی خواص اشیا رسے کام پڑتا ہے، بلکہ شاید علم بیالوجی سے بھی براہ راست تعلق ہو۔ اور علم المعاشرت سے تو یقیناً تعلق ہوتا ہے اس "بالواسطہ حفاظت نفس" میں جس کو "معقول روزی حاصل کرنا" کہتے ہیں کسی شخص کا کامیاب یا ناکامیاب ہونا بہت کچھ اس بات پر منحصر ہے کہ ان علموں میں سے ایک یا کئی علموں میں اس کو کس قدر واقفیت حاصل ہے، گو عقلی واقفیت نہ ہو عملی واقفیت ہی سہی۔ کیوں کہ جسے ہم کام سیکھنا کہتے ہیں وہ حقیقت میں اس سائنس کا سیکھنا ہے جو اس کام میں کام آتا ہے، اگرچہ شائد سائنس کے نام سے اس کی تعلیم نہ دی جاتی ہو۔ پس سائنس کے ابتدائی اصول کی تعلیم دو وجہ سے بڑی ضروری ہے اوّل اس وجہ سے کہ وہ ان سب کاموں کے لئے تیار کرتی ہے۔ اور دوسرے اس وجہ سے کہ عقلی علم عملی علم پر بے حد فوقیت رکھتا ہے۔ اس کے سوا سائنس کی تعلیم ہر شخص کے لئے نہ صرف اس وجہ سے ضروری ہے کہ وہ اُن کاموں اور اُن چیزوں کی ماہیت اور چون و چرا کو سمجھ سکے جن سے اوس کا تعلق اس وجہ سے ہے کہ وہ اُن کا بنانے والا یا تقسیم کرنے والا ہے بلکہ یہ تعلیم بسا اوقات اس وجہ سے بھی نہایت مہتم بالشان ہے کہ وہ دوسری مختلف چیزوں اور کاموں کی ماہیت اور چون و چرا کو سمجھ سکے۔ اس زمانہ میں جب کہ لوگ اہم کاروبار کو مشترکہ سرمایہ سے انجام دیتے ہیں، تقریباً ہر ایک آدمی جو مزدور سے اوپر کے درجہ کا ہے، اپنے پیشہ کے سوا کسی نہ کسی دوسرے پیشہ میں بطور حصہ دار کے تعلق رکھتا ہے۔ اور اس تعلق کے لحاظ سے اُس کا نفع یا نقصان اُن علوم کی واقفیت پر منحصر ہے جو اس دوسرے پیشے سے متعلق ہیں، لو! ایک کوئلہ کی کان کے کھودنے میں بہت سے حصہ دار اس وجہ سے تباہ و برباد ہوگئے کہ اُن کو معلوم نہ تھا کہ ایک خاص متحجر مادہ پرانے سرخ بالو پتھر کی تہ میں موجود تھا جس کے نیچے کوئلہ نہیں نکلتا۔ ایسے انجن بنانے کے لئے جو مقناطیسی اور برقی قوت کے ذریعے سے چل سکیں بے شمار کوششیں کی گئی ہیں، اس اُمید پر کہ بھاپ کی

ضرورت باقی نہ رہے۔ مگر جن لوگوں نے اس کام میں روپیہ لگایا تھا۔ اگر وہ قوتوں کی باہمی مناسبت اور مساوات کے عام قانون کو سمجھ لیتے تو شاید وہ اپنے ساہوکاروں ہی کے ہی کھاتے میں اپنے روپے کو محفوظ رکھتے۔ لوگوں کو روزمرّہ ایسی ایجادوں کے پورا کرنے میں مدد دینے کی ترغیب دیجاتی ہے۔ جن کا ہیچ اور ناکارہ ہونا سائنس کا ایک مبتدی بھی ثابت کرسکتا ہے شاید ہی کوئی ایسا مقام ہو جہاں کسی خیال محال کے پیچھے دولت کو برباد کرنے کی سرگزشت پیش نہ آئی ہو۔

آیندہ زمانے میں سائنس کی ناواقفیت سے اور بھی زیادہ نقصان پہنچیں گے

عدم واقفیت سائنس سے جب کہ پہلے ہی ایسے بڑے بڑے نقصان اکثر ہوتے رہتے ہیں، تو اُن لوگوں کو جو اب بھی سائنس سے جاہل رہیں گے، اور بھی زیادہ بڑے بڑے نقصان متواتر پیش آئیں گے۔ جوں جوں اشیاے تجارت کی پیداوار کے کاموں میں سائنس کا دخل زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ اور اہل حرفہ کی باہمی رقابت کا یقیناً یہی نتیجہ ہوتا ہے۔ اور جوں جوں مشترکہ سرمایہ کے کارخانے ملک میں پھیلتے جاتے ہیں جو یقیناً پھیلیں گے۔ اسی قدر سائنس کا علم ہر شخص کے لئے ناگزیر ہوتا جاتا ہے۔

سائنس کی تعلیم سے عام مدرسوں میں غفلت کی جاتی ہے پیشہ حرفہ کی عظمت اور سبھی علم کی مذمت

پس ہم دیکھتے ہیں کہ جس علم کو ہمارے مدرسوں کے نصاب میں تقریباً بالکل ہی نظرانداز کردیا جاتا ہے اُسی علم کا تعلق زندگی کے کاروبار میں تقریباً سب سے زیادہ ہے۔ اگر ایسا ہوتا کہ لوگ اپنی معمولی تعلیم ختم کرلنے کے بعد حتی المقدور کسی پیشہ کا علم حاصل کرنا شروع نہ کردیتے تو ہماری صنعت و حرفت اور دستکاریاں بند ہوجاتیں اور اگر اُن کا علم غیر سرکاری وسائل سے قرناً بعد قرنٍ اور نسلاً بعد نسلٍ جمع ہوکر شائع نہ ہوتا رہتا، تو یہ دستکاریاں صفحہ ہستی سے معدوم ہوجاتیں۔ اگر بجز اُس تعلیم کے جو عام مدرسوں میں دی جاتی ہے اور کسی قسم کی تعلیم نہ ہوتی تو اب انگلستان کی وہی حالت ہوتی جو فیوڈل سسٹم[1]

[1] ولیم اوّل شاہ انگلستان نے جو زیادہ تر "ولیم فاتح" کے نام سے مشہور ہے ہیسٹنگز کی لڑائی اور اپنے ملک کے شمالی حصہ کی بغاوت کے بعد انگریز امرا سے زمینیں چھین کر اپنے نارمن امرا کو اس شرط پر دیدی تھیں کہ جب کبھی جنگ کا موقع پیش آئے۔ بادشاہ کو فوج سے مدد دیں اور اُس کی طرف سے لڑیں۔ اس مشروط زمینداری کے انتظام کو فیوڈل سسٹم کہتے ہیں۔ ولیم اوّل نے ۱۰۶۶ء

کے زمانہ میں تھی۔ مظاہر قدرت کے قوانین کی روز افزوں واقفیت نے ہم کو بہ تدریج اس قابل بنا دیا ہے کہ موجودات قدرت کو اپنی ضرورتوں کے واسطے تسخیر کر سکتے ہیں اسی وجہ سے اس زمانہ میں معمولی مزدور کو وہ آرام مل رہا ہے جو چند صدیوں پہلے بادشاہوں کو نصیب نہ ہو سکتا تھا۔ اور یہ واقفیت کچھ اُن مقررہ وسائل کی بدولت حاصل نہیں ہوئی جن کی تعلیم ہمارے نوجوانوں کو دی جاتی ہے۔ جس ضروری علم کے ذریعہ سے یہ حیثیت قوم ہم نے موجودہ حالت تک ترقی کی ہے۔ جو علم اب ہماری تمام زندگی کی بنیاد ہے اُس علم کو کتابوں کے ذریعے سے نہیں، بلکہ اِدھر اُدھر سے سیکھا ہے، اور تعلیم کی معمولی درس گاہیں تو بجز اس کے کہ رسمی چیزوں کی بُری بھلی تعلیم دیں، کوئی مفید بات نہیں سکھاتیں۔

اب ہم انسانی کاموں کے تیسرے بڑے حصّہ کی طرف رجوع کرتے ہیں، یعنی وہ حصّہ جس کے واسطے مطلق تیاری نہیں کی جاتی۔ اگر کسی عجیب اتفاق سے تعلیمی کتابوں یا کالج کے امتحانی پرچوں کے سوا، زمانہ آیندہ کی بعید نسلوں تک ہماری کوئی یادگار نہ پہنچے، تو ہم خیال کر سکتے ہیں کہ اُس زمانہ میں جس شخص کو یادگار سلف کے قایم رکھنے کا شوق ہوگا وہ اس بات کو معلوم کرکے کس قدر ششدر اور حیران رہ جائے گا کہ اُن کتابوں اور پرچوں میں کوئی نشان اس بات کا موجود نہیں ہے جس سے اُس علم کے حاصل کرنے والوں کا صاحب اولاد ہونا خیال کیا جا سکے۔ ہمارا تو خیال یہ ہے کہ وہ یہ نتیجہ نکالے گا کہ "یہ نصاب تعلیم اُس زمانہ کے مجرد اور غیر متاہل لوگوں کے واسطے بنایا گیا ہوگا۔ میں دیکھتا ہوں کہ اس نصاب میں بہت سی چیزوں کے لیے کامل تیاری کا ذکر ہے۔ خصوصاً معدوم اقوام اور ہم عصر اقوام کی کتابیں پڑھنے کا (جس سے حقیقت میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن لوگوں کے پاس اپنی زبان میں پڑھنے کے لایق کتابیں بہت کم تھیں) مگر تربیت اولاد کا ذکر کہیں نام کو بھی نہیں ملتا۔ ایسا تو ہو نہیں سکتا تھا

کہ وہ اپنی بیہودگی سے اس اہم ترین ذمہ داری کی تربیت کو نظرانداز کر دیتے ہیں۔ صریحاً یہ نصاب کسی فرقہ رُہبان کا نصاب تعلیم ہے"۔

کیا یہ سخت متحیر کرنے والا واقعہ نہیں ہے کہ گو اولاد کی حیات و ممات اور اس کی اخلاقی بہبودی و تباہی اُس کی تربیت ہی پر منحصر ہے۔ تاہم اُن لوگوں کو جو عن قریب ماں یا باپ بننے والے ہیں، تربیت اولاد کی بابت کبھی ایک حرف تک نہیں بتایا جاتا؟ کیا یہ بات ہولناک نہیں ہے کہ نئی نسل کی قسمت کو نامعقول رسم و رواج، طبعی میلان، اور اٹکل پچو وہم و گمان پر چھوڑ دیا جائے جس کے ساتھ جاہل اناؤں کی رائیں اور بڑی بوڑھیوں کے متعصبانہ صلاح و مشورے شامل ہوں؟ اگر کوئی سوداگر جس کو حساب کتاب اور بہی کھاتے سے کچھ واقفیت نہ ہو اپنا کاروبار شروع کرے تو ہم اس کی حماقت پر شور و شغب برپا کریں گے اور بربادی بخش اور تباہ کن نتائج کی توقع رکھیں گے۔ یا اگر کوئی شخص علم تشریح الابدان کے مطالعہ سے پہلے جراحی عمل شروع کر دے تو ہم اُس کی بے باکی و شوخ چشمی پر حیران رہ جائیں گے۔ اور اس کے مریضوں پر رحم کریں گے۔ لیکن اگر والدین تربیت اولاد کے مشکل کام کو شروع کر دیں، بغیر اس کے کہ انہوں نے جسمانی، اخلاقی، یا عقلی اُصول پر ذرا بھی غور کیا ہو جن اصول پر کہ ان کو کاربند ہونا چاہیے، تو ہم کو نہ تو ایسا کرنے والوں پر تعجب آتا ہے اور نہ اُن کی مظلوم اولاد پر رحم آتا ہے۔

اولاد کی بساط تربیت سے والدین کی غفلت اور اسکے مضر نتائج

ہزارہا بچے جو والدین کی غفلت سے مرجاتے ہیں، اگر اس تعداد میں اُن لاکھوں بچوں کو بھی شامل کر لیا جائے جو بچ جاتے ہیں مگر ضعیف القوےٰ اور نحیف الجثہ رہتے ہیں۔ اور اُن کروڑوں بچوں کو بھی جن کے قوےٰ ایسے مضبوط نہیں ہوتے جیسے ہونے چاہئیں، تو تم اُس آفت کا کسی قدر تصور کر سکو گے جو قوانین زندگی سے جاہل والدین کے ہاتھوں اولاد کو بھگتنی پڑتی ہے۔ ذرا غور تو کرو کہ جو

غذا بچوں کو دی جاتی ہے، اُس کا اثر ہر گھڑی اُن پر پڑتا رہتا ہے جس کا نقصان یا نفع
تمام عمر قایم رہتا ہے۔ اور اس بات پر بھی دھیان کرو کہ غلطی کی ہیں راہوں کے
مقابلہ میں سیدھا رستہ ایک ہی ہوتا ہے۔ اور تم کو اس بات کا کچھ نہ کچھ تصوّر ضرور پیدا
ہوجاے گا کہ ان غافلانہ اور اُلٹی سیدھی تدبیروں سے جو عام طور پر رائج ہیں،
قریب قریب ہر ایک جگہہ کیسا نقصان عظیم ہو رہا ہے۔ کیا اس امر کا فیصلہ کر دیا جاتا ہے
کہ لڑکے کو مہین نا پائیدار اور ناکافی لباس پہنایا جاے گا اور اُس کو اِدھر اُدھر
کھیلتے پھرنے کی اجازت دی جاے گی، درآں حالیکہ سردی سے اُس کے ہاتھ
پاؤں سُرخ ہوگئے ہوں؟ اس بات کا اثر اُس کی تمام آیندہ زندگی پر ہوتا ہے یا تو وہ
بیمار رہتا ہے یا نشو و نما میں خلل واقع ہوتا ہے یا کام کرنے کی قوّت میں کمی ہوجاتی ہے
یا سنِ بلوغ کو پہنچ کر جسمانی قوت جیسی کہ چاہیے حاصل نہیں ہوتی اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ
باتیں کامیابی اور خوشی میں سدِّراہ ہوتی ہیں۔ کیا بچّوں کو اس بات کی سزا دی جاتی
ہے کہ اُن کو ہمیشہ ایک ہی طرح کی یا کم مقوی خوراک دی جاے؟ جب وہ جوان
ہوں گے تو اُن کی انتہائی جسمانی طاقت اور قابلیت میں اس وجہ سے ضرور کم و بیش
فتور واقع ہوگا۔ کیا اُن کو شور و غل کے کھیل کود سے منع کیا جاتا ہے۔ یا (اس وجہ سے
کہ اُن کے بدن پر اس قدر کافی لباس نہیں ہوتا کہ وہ کھُلی ہوا میں چلنے پھرنے کی برداشت
کر سکیں) سردی کے موسم میں اُن کو گھر میں مقید رکھا جاتا ہے؟ وہ یقیناً صحت اور
طاقت کے اُس درجہ سے گرے ہوے رہیں گے جس درجہ تک بغیر اس قسم کی روک
ٹوک کے پہنچ سکتے تھے۔ جب لڑکے اور لڑکیاں بڑے ہوکر بھی بیمار اور کمزور رہتے ہیں
تو والدین اس بات کو عموماً بدنصیبی یا قہرِ الٰہی سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور ایک بے ڈھنگی
روش کے موافق جس کا عام رواج ہے فرض کر لیتے ہیں کہ یہ مصیبتیں بغیر اسباب کے
پیش آتی ہیں۔ یا یہ کہ اُن کے اسباب فوق العادة ہیں۔ مگر یہ بات ہرگز نہیں ہے

ہاں بے شک بعض صورتوں میں موروثی اسباب ہوتے ہیں لیکن اکثر صورتوں میں احمقانہ تدبیریں ہی ان مصیبتوں کا باعث ہوتی ہیں۔ اس تمام دُکھ درد اس کمزوری، اس افسردگی، اور اس مصیبت کے ذمّہ دار عموماً خود والدین ہوتے ہیں۔ اُنھوں نے اولاد کی جانوں کو ہر گھڑی اپنے قابو میں رکھنے کا ٹھیکہ لے لیا ہے۔ اُنھوں نے بے دردانہ لاپرواہی سے زندگی کے اُن علموں کا علم حاصل کرنے میں غفلت کی ہے جن پر اُن کے حکم و امتناع کا اثر برابر پڑتا رہتا ہے۔ علم فزیالوجی کے سیدھے سادے قوانین سے محض نابلد ہونے کی وجہ سے سال بہ سال اپنے بچوں کے قوائے کو تحلیل کر رہے ہیں اور اس طرح سے نہ صرف اپنی اولاد بلکہ اُن کی نسلوں پر بھی بیماری اور قبل از وقت موت کا ستم ڈھا رہے ہیں۔

بچوں کی اخلاقی تربیت میں والدین کی غفلت اور اس کے مضر نتائج

جب ہم جسمانی تربیت سے اخلاقی تربیت کی طرف رجوع کرتے ہیں تو یہاں بھی والدین کی جہالت اور اس جہالت کی مضرت اسی قدر موجود ہے۔ نوجوان ماں اور اُس کے دایہ خانہ کے قانون پر غور کرو۔ چند ہی سال پہلے وہ مدرسہ میں تعلیم پاتی تھی، جہاں اُس کے حافظہ میں لفظوں۔ ناموں اور تاریخوں کو کوٹ کوٹ کر بھرا گیا تھا، اور اُس کے قوائے متفکرہ سے شائد ذرا بھی کام نہیں لیا گیا تھا۔ جہاں اُس کو اُن قاعدوں کا ذرا بھی تصوّر نہیں دلایا گیا تھا جن کے موافق بچّے کے کھُلنے والے دل کی تربیت ہونی چاہیئے۔ اور جہاں اُس کی تعلیم و تربیت نے اُس کو بالکل اس قابل نہیں بنایا کہ وہ بطور خود تربیت اولاد کے قاعدوں پر غور کر سکے۔ درمیانی عمر موسیقی کی مشق میں، نقش و نگار اور بیل بوٹے کاڑھنے میں، قصے پڑھنے میں، جلسوں اور دعوتوں میں شریک ہونے میں گزر گئے۔ مادرانہ فرائض کی اہم ذمہ داریوں کا خیال اب تک اُس کو نہیں دلایا گیا، اور اُس سنجیدہ عقلی تعلیم میں

سے شاید ہی کچھ تعلیم حاصل ہوئی ہو جو ایسی ذمہ داریوں کے لیے کسی قدر تیار کرتی ہے۔ لو! دیکھو اب ایک انسانی ہستی کی غور و پرداخت کا اہتمام اُس کو سونپا گیا ہے جس کے قوائے جسمانی و عقلی روز بروز نشو و نما پاتے ہیں۔ لو اور سنو! (اس پر طرّہ یہ کہ) وہ اُن امور سے جاہل مطلق ہے جن سے اُس کو کام پڑتا ہے۔ اُس نے ایسے کام کرنے کا قصد کیا ہے جو نہایت ہی پورے علم کی مدد سے بھی صرف ادھورے طور پر انجام پذیر ہو سکتا ہے۔ اُس کو کچھ معلوم نہیں ہے کہ جذبات طبیعت کی کیا کیفیت ہے؟ کس ترتیب سے وہ نشو و نما پاتے ہیں؟ ان کے فرائض و افعال کیا ہیں؟ اُن کا ٹھیک استعمال کہاں ختم ہوتا ہے اور بُرا استعمال کہاں سے شروع ہو جاتا ہے؟ وہ یہ خیال کرتی ہے کہ بعض جذبات سراسر خراب ہیں، حالانکہ یہ بات اُن میں سے کسی ایک کی نسبت بھی صحیح نہیں ہے اور بعض جذبات اچھے ہیں، خواہ کتنی ہی دور تک اُن کو پہنچا دیا جائے۔ حالانکہ یہ بات بھی کسی جذبہ کی نسبت درست نہیں ہے۔ پھر جس طرح وہ اُس جسم کی ساخت سے ناواقف ہے جس سے اُس کو کام پڑتا ہے، بالکل اسی طرح اُن اثرات سے بھی بے بہرہ ہے، جو خاص خاص علاج معالجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ اُن آفت ناک نتائج سے بڑھ کر جن کو ہر گھڑی پیدا ہوتے ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں، قطعی و یقینی بات اور کیا ہو سکتی ہے؟ چوں کہ ماں کیفیات نفس اور اُن کے اسباب و نتائج سے بھی بے خبر ہوتی ہے اس لیے نفسی امور میں اُس کی دست اندازی اکثر اوقات مضر ہوتی ہے اگر وہ اس قسم کے دخل در معقولات سے بالکل علیحدہ رہے تو زیادہ مناسب ہے۔ بچے کے ہر ایک فعل کو جو بالکل باقاعدہ اور مفید ہے وہ ہمیشہ روکتی ہے اور اس طرح سے بچے کی خوشی اور فائدہ کو گھٹاتی ہے اپنے اور اُس کے مزاج کو نقصان پہنچاتی ہے، اور باہمی تنفر و بیگانگی پیدا کرتی ہے۔ جن کاموں کو تقویت دینی مناسب سمجھتی ہے، اُن کو دھمکی یا رشوت سے یا تحسین و آفرین

کی خواہش کو بھڑکا کر پورا کرتی ہے، اور جب تک بچے کا ظاہری رویّہ درست ہے، اُس وقت تک اس بات کا خیال نہیں کرتی کہ اندرونی محرک یا نیت کیا ہے۔ پس اس قسم کی تربیت سے بجائے نیک خیالات کے ریاکاری خوف اور خود غرضی بچے کی طبیعت میں پیدا ہو جاتی ہے۔ سچ بولنے کی تاکید کرتے وقت وہ ہمیشہ جھوٹ کا نمونہ بچے کے سامنے اس طرح پیش کرتی ہے کہ طرح طرح کی سزاؤں سے اُس کو ڈراتی اور دھمکاتی ہے، مگر سزا کبھی نہیں دیتی۔ ضبط نفس کی تاکید کرتے وقت اپنے چھوٹے بچّوں کو غصہ سے ہر گھڑی ایسے کاموں پر ڈانٹ ڈپٹ بتاتی ہے جو اُس کے مستحق نہیں ہیں۔ یہ بات کبھی اُس کے وہم و گمان میں بھی نہیں آتی کہ دنیا کی طرح دایہ خانہ میں بھی وہی تربیت درحقیقت فائدہ مند ہے جس میں تمام نیک و بد کاموں پر قدرتی جزا و سزا دی جائے۔ یعنی ایسی جزا و سزا جس سے وہی راحت یا رنج حاصل ہو جو لازمی طور پر ایسے کاموں سے حاصل ہونا چاہئے۔ چوں کہ وہ نفسی معلومات سے بالکل عاری ہے۔ اور ہرگز اس لایق نہیں کہ اپنے بچوں کی نفسی کیفیات کا کھوج لگا کر اپنے طرز عمل کی بطور خود ہدایت کر سکے اس لئے جو بات بے سوچے سمجھے یکایک اُس کے ذہن میں آ گئی وہی اُس کا قانون ہے۔ جو اس کی اور باتوں سے متناقض اور بچوں کے لئے مضرت رساں ہوتا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اگر نوخیز طبیعتیں جو قوم کے اخلاقی رجحان کو اختیار کرنے پر بدرجہ غایت مائل ہوتی ہیں، اس قسم کے معمولی اثروں پر غالب نہ آ جایا کریں تو یہ "قانون" عموماً بچّوں کی بربادی و تباہی کا باعث ہوتا۔

عقلی تربیت کے اصول سے والدین اور معلم کی ناواقفی اور اس سے مضر نتائج

اب عقلی تربیت پر غور کرو۔ کیا اس کا انتظام بھی ایسا ہی خراب نہیں ہے؟ مان لو کہ عقل کا ظہور خاص قوانین کے موافق ہوتا ہے۔ مان لو کہ بچے کی عقل کی ترقی بھی خاص قوانین کے موافق ہوتی ہے تو پھر اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ ان قوانین کی

واقفیت کے بغیر ٹھیک ٹھیک تعلیم و تربیت نہیں ہو سکتی۔ یہ قیاس محال ہے کہ ہم تحصیل علم یعنی ذہن میں تصورات پیدا اور جمع کرنے کے عمل کو، عمل کی ماہیت کے بغیر، باقاعدہ بنا سکتے ہیں۔ پس جیسی تعلیم ہونی چاہیے، اُس میں اور آج کل کی تعلیم میں، جب کہ والدین شاذونادر اور بہت ہی کم معلّم سائی کالوجی[1] سے واقف ہیں، کس قدر زمین آسمان کا فرق ہے۔ غرض کہ تعلیم کا مقررہ نظام، کیا بہ لحاظ مضمون اور کیا بہ لحاظ طرز تعلیم نہایت ناقص اور قابل افسوس ہے۔ حقیقی واقعات کی تعلیم سے روکا جاتا ہے، اور غلط واقعات کو غلط طریقہ اور غلط ترتیب سے زبردستی دماغ میں بھر دیا جاتا ہے۔ تعلیم کے اُس عام محدود خیال کے موافق جو تعلیم کو کتابی علم تک محدود رکھتا ہے والدین کئی سال پہلے ہی ابتدائی کتابیں ننھے بچّوں کے ہاتھوں میں زبردستی دیدیتے ہیں جس سے اُن کو بڑا نقصان پہنچتا ہے۔ معلم اس حقیقت کو نہیں سمجھتے کہ کتابوں کا کام تعلیم کی تکمیل ہے اور جب کہ بلا واسطہ وسائل سے کام نہ چل سکے تو کتابیں تحصیل علم کا بالواسطہ وسیلہ ہیں یعنی کتابیں دوسرے لوگوں کی مدد سے اُن چیزوں کے دیکھنے کا آلہ ہیں، جن کو ہم بطور خود نہیں دیکھ سکتے اور یہ حضرات مقدم اور ضروری باتوں کو چھوڑ کر دوسرے درجہ کی اور کم ضروری باتیں بتانے کے شایق رہتے ہیں۔ وہ اُس قدرتی تعلیم کی بے حد قدر و قیمت کو نہیں پہچانتے جو ابتدائی عمر میں حاصل ہوتی رہتی ہے اور اس بات کو نہیں سمجھتے کہ بچے کی بے چین قوت مشاہدہ کو نظر انداز کرنے یا دبانے کی بجائے مستعدی سے اُس کو مدد دینی چاہیے۔ اور جہاں تک ممکن ہو اُس قوت کو صحیح اور کامل بنانا چاہیے وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اُس کی آنکھوں اور خیالات کو ایسی چیزوں میں مصروف رکھا جائے جو بچپن میں اُس کے لئے ناقابل فہم اور ناگوار

---

[1] سائی کالوجی جس کو عربی میں "علم النفس و القویٰ" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ وہ علم ہے جس میں نفس ناطقہ کی قوتوں اور اُس کے افعال سے عالمانہ اور باقاعدہ طور پر بحث کی جاتی ہے۔ مترجم

خاطر ہوتی ہیں۔ چوں کہ استادوں کے دل و دماغ پر اس توہم کا قبضہ ہوتا ہے جس
کی وجہ سے علم کو چھوڑ کر علم کی تصویروں کی پرستش کی جاتی ہے۔ اس لئے وہ اس
بات کو نہیں دیکھتے کہ جس وقت بچے کو گھر، بازار، اور کھیت کی چیزوں اور کاموں سے
ذرا زیادہ واقفیت حاصل ہو جائے، صرف اُس وقت معلومات کے نئے ذریعے جو
کتابوں سے حاصل ہوتے ہیں، اُس کے سامنے پیش کرنے چاہئیں۔ اور یہ بات نہ
صرف اس وجہ سے اختیار کرنی چاہیے کہ بلاواسطہ علم بالواسطہ علم سے بہت زیادہ قیمت
رکھتا ہے، بلکہ اس وجہ سے بھی کہ اوّل ہی سے چیزوں کا تجربہ جس قدر زیادہ ہوگا
اسی قدر صحت و درستی سے کتابی الفاظ کا مطلب خیالات میں ادا ہو سکے گا۔ اب
غور کرو کہ اس رسمی تعلیم کو جو وقت سے بہت پہلے شروع ہو جاتی ہے۔ اس طرح
جاری رکھا جاتا ہے کہ عقلی نشو و نما کے قوانین تقریباً نظر انداز ہو جاتے ہیں۔ عقلی
ترقی لازمی طور پر مادیات سے مجردات تک یعنی خارجی چیزوں سے
شروع ہو کر ذہنی چیزوں تک پہنچنی چاہیے۔ مگر اس اصول کو فراموش
کر کے نہایت دقیق علوم، مثلاً صرف و نحو کی تعلیم جو بہت پیچھے ہونی چاہیے، بالکل
بچپن ہی میں شروع کرادی جاتی ہے۔ جغرافیہ ملکی جو بچے کے لئے مردہ اور
بے لطف مضمون ہے اور جس کو عمرانیات کا ایک تتمہ سمجھنا چاہیے، اس کی تعلیم تو
قبل از وقت شروع کرادی جاتی ہے۔ مگر جغرافیہ طبیعی جو بچے کی سمجھ میں آسکتا
ہے اور نسبتاً دلچسپ ہے، اُس سے بہت کچھ چشم پوشی کی جاتی ہے اور تقریباً
ہر ایک مضمون تعلیم کی ترتیب بے اصول اور بے قاعدہ ہے۔ حدود، قواعد
اور اصول، بجائے اس کے کہ مثالوں سے اُن کی توضیح کی جائے جو کہ
قدرتی ترتیب ہے، پہلے بتائے جاتے ہیں۔ پھر ان سب سے بڑھ کر آفت
رٹنے یعنی روح معنی کو حروف پر قربان کر دینے کا طریقہ ہے۔ اب اس کے نتائج

پر غور کرو کہ کچھ تو ابتدائی روک ٹوک اور کتابوں پر زبردستی توجہ کرانے سے بچوں کا ذہن خلاف فطرت کند ہو جاتا ہے اور کچھ اس وجہ سے کہ بچوں کی طبیعت میں انتشار پیدا ہو جاتا ہے کیوں کہ جن مضمونوں کو وہ سمجھ نہیں سکتے، اُن کی تعلیم پہلے ہی شروع کرا دی جاتی ہے اور ہر ایک مضمون میں اُصول کلیہ اُن واقعات سے پہلے ہی بتا دیے جاتے ہیں، جن سے وہ اصول نکلتے ہیں۔ کچھ اس وجہ سے بھی کہ موجودہ طریقہ تعلیم طالب علم کو بالکل کاہل اور مجہول بنا دیتا ہے کہ دوسروں کے خیالات کو بیٹھا حاصل کیا کرے اور اُس کو ایسی ہدایت نہیں کرتا کہ خود تحقیقات کے لیے کھڑا ہو جائے اور اپنا معلم آپ ہو۔ اور کچھ اس وجہ سے کہ قوائے عقلیہ سے حد سے زیادہ کام لیا جاتا ہے، ایسے شخص بہت ہی کم نکلتے ہیں جو کماحقہٗ لائق و فائق ہوں۔ ایک دفعہ امتحانات پاس کرنے کے بعد کتابوں کو اُٹھا کر بالائے طاق رکھ دیتے ہیں۔ چوں کہ علم بے قاعدہ طور پر حاصل کیا جاتا ہے اُس کا بہت سا حصہ جلد حافظہ سے نکل جاتا ہے، جو کچھ باقی رہ جاتا ہے وہ زیادہ تر بے مصرف ہوتا ہے، کیوں کہ علم سے عملی کام لینے کے فن کو ترقی نہیں دی جاتی اور صحیح مشاہدہ یا آزادانہ غور و فکر کی قوت بہت ہی کم حاصل ہوتی ہے۔ ان تمام باتوں کے علاوہ علم حاصل کردہ کا بہت سا حصہ نسبتہً کم وقعت ہوتا ہے اور معلومات کے اُس وسیع ذخیرہ کو جس کی قدر و قیمت نہایت ہی اعلیٰ درجہ کی ہے، بالکل پس پشت ڈال دیا جاتا ہے۔

جسمانی، اخلاقی اور عقلی تعلیم کا نہایت ناقص ہونا اور والدین کو اس کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت

پس ہم دیکھتے ہیں کہ یہ نتائج تجربہ کے بغیر یا برہانِ لمّی کے ذریعے سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ بچوں کی جسمانی، اخلاقی اور عقلی تعلیم اس درجہ ناقص ہے کہ اُس سے خوف معلوم ہوتا ہے۔ یہ بات زیادہ تر اس وجہ سے ہے کہ والدین اُس علم سے بالکل کورے ہیں جس کی بدولت یہ تربیت ٹھیک ٹھیک ہو سکتی ہے۔ جب کسی نہایت ہی پیچیدہ مسئلہ کو ایسے لوگ حل کرنے پر آمادہ ہوں، جنھوں نے اُن اُصول پر شاید ہی کبھی دھیان

کیا ہو، جن پر اُس مسئلہ کا حل منحصر ہے، تو ہم کیا خاک توقع رکھ سکتے ہیں؟ جوتا بنانے
یا مکان تعمیر کرنے کے واسطے۔ جہاز یا انجن چلانے کے انتظام کے واسطے مدّت تک
کام سیکھنے اور شاگردی کرنے کی ضرورت ہے۔ پھر کیا انسان کی جسمانی اور روحانی
قوتوں کی ترقی نسبتہً ایسا آسان کام ہے کہ ہر شخص بغیر کسی تیاری کے اُس کا اہتمام وانتظام
کرسکتا ہے؟ اگر یہ بات نہیں ہے، اگر یہ کام **قدرت** کے تمام کاموں میں سوائے
ایک کے سب سے زیادہ پیچیدہ ہے اور اُس کو پوری طرح انجام دینا نہایت ہی
مشکل ہے، تو کیا ایسے کام کے واسطے کوئی بندوبست نہ کرنا دیوانگی نہیں ہے؟ بہتر یہ
ہے کہ آرایشی اور نمایشی کاموں کو قربان کردیا جائے، بہ نسبت اس بات کے کہ
اس نہایت ہی اہم تعلیم کو نظر انداز کیا جائے۔ جب باپ اُن غلط اصولوں پر عمل کرکے
جن کو بغیر جانچ پڑتال کے اُس نے اختیار کرلیا ہے، بیٹوں کو اپنے سے بیگانہ بنالیتا
ہے اور اپنے سخت برتاؤ سے اُن کو بغاوت پر آمادہ کردیتا ہے یا اُن کو تباہ و برباد اور
اپنے تئیں حقیر و مصیبت زدہ کردیتا ہے۔ اُس وقت وہ اس بات پر غور کرسکتا ہے
کہ علم اخلاق اور آداب تمدن کا مطالعہ کرنا ضروری تھا، بلا سے ایسکلس[1] کا حال
کچھ معلوم نہ ہوتا تو نہ سہی۔ جب ماں اپنے پہلوٹی کے بچہ پر جو لال بخار کے اثر سے
ہلاک ہوا ہے گریہ وزاری کرتی ہے، جب کہ شاید کسی صاف دل طبیب نے اُس کے
گمان کو پختہ کردیا ہے کہ اگر بچہ کے قوائے کثرت مطالعہ سے ضعیف نہ ہوجاتے تو وہ بچ
جاتا جب کہ وہ رنج اور پشیمانی دونوں تکلیفوں سے ملول اور اداس ہوتی ہے، اُس وقت
اُس کو اس بات سے کچھ تسلی نہیں ہوسکتی، کہ وہ ڈینٹی[2] کی اصل تصنیفات کو پڑھ سکتی ہے

[1] ایسکلس ایک قدیم یونانی شاعر کا نام ہے جو غم انگیز نظمیں لکھنے کی وجہ سے مشہور ہے۔ ۵۲۵ قبل مسیح میں پیدا ہوا اور ۴۵۶ قبل مسیح میں فوت ہوا۔ مترجم

[2] ڈینٹی۔ اٹلی کا ایک شاعر ہے ۱۲۶۵ء میں پیدا اور ۱۳۲۱ء میں فوت ہوا۔ مترجم

تربیت اولاد کے لئے قوانین زندگی کی واقفیت لازم ہے اور اس امر کی توضیح

پس ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی کاروبار کے تیسرے بڑے حصے (تربیت اولاد) کا باقاعدہ انتظام کرنے کے لئے قوانین زندگی کا علم ایک ضروری چیز ہے۔ علم فزیالوجی (تشریحات) کے اصول اوّلیہ اور علم سائیکالوجی (نفسیات) کے ابتدائی حقائق کی کسی قدر واقفیت، بچوں کی باقاعدہ پرورش اور تربیت کے واسطے لازمی ہے۔ کچھ شک نہیں کہ اکثر آدمی اس بیان کو پڑھ کر ہنسیں گے۔ اُن کے نزدیک یہ بات بیہودہ ہوگی کہ والدین سے عموماً ایسے دقیق مضامین کا علم حاصل کرنے کی توقع رکھی جائے۔ اگر ہم یہ تجویز پیش کرتے ہیں ہر ایک ماں باپ کو ان مضمونوں سے کامل واقفیت بہم پہنچانی چاہیئے، تو البتہ اس رائے کی بیہودگی صاف ظاہر تھی۔ مگر ہم ایسا نہیں کرتے صرف عام اصول مع اُن تمثیلوں کے جو اُن کے سمجھنے کے لئے درکار ہوں، کافی ہیں اور ان اصول کی تعلیم تھوڑے سے عرصہ میں دی جاسکتی ہے۔ اگر عقلی اور مدلل طور پر نہیں تو بطور گُر کے بلا دلیل ہی سہی، بہر کیف واقعات مندرجہ ذیل میں کسی شخص کو اعتراض کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔

(۱) بچوں کے نفس اور جسم کی ترقی خاص قوانین کی تابع ہے۔

(۲) جب تک والدین اُن قوانین کی کسی حد تک پابندی نہ کریں، بچوں کی موت یقینی ہے۔

(۳) جب تک اُن قوانین کی بہت کچھ پابندی نہ کی جائے، سخت جسمانی اور عقلی نقائص کا پیدا ہو جانا لازمی نتیجہ ہے۔

(۴) جب اُن کی پوری پابندی کی جاتی ہے تو پورا کمال حاصل ہوتا ہے۔

اب غور کرو کہ جو لوگ ایک نہ ایک دن ماں باپ بننے والے ہیں۔ کیا اُن سب کو لازم نہیں ہے کہ ذرا شوق کے ساتھ ان قوانین کو سیکھنے کی کوشش کریں۔

فرائض تمدن کی تعلیم مدرسوں میں صرف برائے نام رہ جاتی ہے

فرائض والدین کو چھوڑ کر اب ہم کو قومی فرائض کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔ یہاں ہم کو اس تحقیقات کی ضرورت ہے کہ کون سا علم انسان کو ان فرائض کے پورا کرنے کے قابل بناتا ہے۔ اس سلسلہ میں ہم یہ اعتراض نہیں کر سکتے کہ رائج نصاب میں اس علم کی ضرورت کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے، نہیں بلکہ ہمارے مدرسوں میں بعض ایسے مضامین کی تعلیم ضرور داخل ہے، جن کو ملکی اور مجلسی فرائض سے کم از کم برائے نام تعلق ہے اور ان میں صرف تاریخ ایسا مضمون ہے جس کو خاص امتیاز حاصل ہے۔

معمولی علم تاریخ جو مدرسوں میں پڑھایا جاتا ہے محض ناکارہ اور ہیچ ہے

مگر جیسا کہ پہلے اشارۃً بیان کیا گیا ہے تاریخی معلومات، جو عموماً تاریخ کے نام سے حاصل کی جاتی ہے، ہدایت و رہنمائی کے اعتبار سے تقریباً بے کار اور فضول ہوتی ہیں مدرسوں کی تاریخوں میں شاذونادر، اور مبسوط تاریخیں جو بڑے آدمیوں کے واسطے لکھی گئی ہیں۔ ان میں بہت کم ایسے واقعات درج ہوتے ہیں جن میں سیاسی معاملات کے صحیح اصول کو صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہو۔ بادشاہوں کی سوانح عمریاں (اور ہمارے بچوں کو تاریخ کی تعلیم سے اس کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہوتا) علم تمدن پر بہت ہی کم روشنی ڈالتی ہیں۔ درباری سازشوں، منصوبوں، عزل وغصب اور جملہ اشخاص متعلقہ کے حالات کی واقفیت قومی ترقی کے اسباب کی توضیح میں بہت کم مدد دیتی ہے۔ تاریخوں میں ہم عموماً اس قسم کی باتیں پڑھتے ہیں کہ فلاں خرخشہ، اقتدار و تسلط کی غرض سے پیش آیا۔ دونوں طرف کی فوجیں میدان جنگ میں خوب جم کر لڑیں۔ سپہ سالاروں اور اُن کے بڑے بڑے ماتحتوں کے یہ یہ نام تھے۔ ہر ایک کے پاس اتنے ہزار سوار اور پیادے اور اتنی توپیں تھیں۔ اس ترتیب سے اُنہوں نے اپنی فوجوں کو میدان جنگ میں صف آرا کیا تھا۔ فلاں فلاں طریق سے آمنے سامنے آئے، حملہ کیا اور پسپا ہوئے۔ دن کے فلاں حصے میں فلاں مصیبتیں پیش آئیں۔ اور

فلاں حصے میں یہ یہ فائدے حاصل ہوئے۔ ایک خاص وقت میں فلاں مشہور سردار
کام آیا۔ ایک اور موقع پر کسی خاص رجمنٹ کا دسواں حصّہ ضائع ہو گیا۔ انقلابات گوناگوں
کے بعد فلاں فوج فتح یاب ہوئی۔ اور ہر طرف سے اتنے آدمی مقتول و مجروح ہوئے
اور اس قدر آدمیوں کو فتح مندوں نے گرفتار کیا۔ اب بتاؤ کہ ایک واقعہ کی ذرا ذرا سی
باتیں جو جمع کی گئی ہیں، ان میں سے کون سی بات تمدّنی حیثیت سے تم کو اپنے طرزِ عمل
کا فیصلہ کرنے میں مدد دیتی ہے؟ بالفرض تم نے نہ صرف "دنیا کی فیصلہ کن پندرہ
لڑائیاں" بلکہ اُن تمام لڑائیوں کا حال پڑھ لیا، جو تاریخ میں مذکور ہیں۔ بھلا اس علم
سے (پارلیمنٹ کے) آیندہ انتخاب کے موقع پر تمہاری رائے میں کیا وقعت پیدا
ہو جائیگی؟ مگر تم کہتے ہو کہ یہ واقعات ہیں اور دلچسپ واقعات ہیں۔ بلاشبہ یہ
واقعات ہیں (کم سے کم وہ حصّہ جو کلّاً یا جزاً۔ جھوٹ اور بناوٹ نہیں ہے) مگر اس
سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ وہ واقعات قابلِ قدر ہیں۔ مصنوعی اور فاسد رائے کی بدولت
اکثر اوقات ناکارہ چیزوں کو ظاہری قدر و قیمت حاصل ہو جاتی ہے مثلاً جس شخص کے
دماغ میں گلِ لالہ کا خبط سمایا ہوا ہو، اگر اُس کو کسی نادر پھول کے برابر سونا تول دیا جاے
تو بھی اُس پھول کو اپنے پاس سے جدا نہیں کرے گا، اسی طرح ایک شخص پُرانی چینی کے
ایک بدصورت ٹکڑے کو، جس میں بال آگیا ہے، اپنے پاس رکھنا نہایت ضروری
سمجھتا ہے دنیا میں ایسے آدمی بھی ہیں جو مشہور قاتلوں کی لاشوں یا اُن کی کسی
یادگار کو گراں قیمت پر خرید کر بطور تبرک کے اپنے پاس رکھتے ہیں۔ مگر کیا اس سے
یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ ایک شخص کا مذاق قیمت اشیاء کا معیار ہو سکتا ہے؟ اگر نہیں تو
یہ بات ضرور تسلیم کرنی چاہیے کہ بعض قسم کے تاریخی واقعات کا شوق اُن کی قدر و
قیمت کا ثبوت نہیں ہے اور جس کسوٹی پر دوسرے واقعات کی قیمت کو پرکھتے ہیں۔
اُسی کسوٹی پر ان تاریخی واقعات کی قیمت کو بھی پرکھنا چاہیے۔ یعنی یہ سوال کرنا چاہیے

کہ وہ کیا کام آسکتے ہیں؟ اگر کوئی شخص تم سے کہے کہ کل تمہارے پڑوسی کی بلی نے بچے دیے ہیں تو تم کہوگے کہ یہ اطلاع فضول ہے۔ اگرچہ یہ بھی ایک واقعہ ہے مگر تم اس کو ایک فضول اور بے معنی واقعہ کہوگے۔ ایسا واقعہ جس کا اثر تمہاری زندگی کے کاموں پر مطلق نہیں ہوسکتا، ایسا واقعہ جو کامل معاشرت کا علم حاصل کرنے میں مدد نہیں دے سکتا، اچھا، اسی معیار کو تاریخی واقعات کے کثیر المقدار ذخیرے پر عاید کرو۔ اور تم اُسی نتیجہ پر پہنچ جاؤگے۔ یہ ایسے واقعات نکلیں گے کہ ان سے مفید نتائج حاصل نہیں ہوسکتے۔ یعنی ایسے واقعات جو ترتیب نہیں دیے جاسکتے اور اسی وجہ سے چال چلن کے اصول قایم کرنے میں جو واقعات کا اصلی مقصد ہے کچھ کارآمد نہیں ہوتے۔ اگر تم چاہو تو دل بہلانے کی خاطر اُن کو پڑھ لو، مگر اپنے دل کو اس بات سے نہ پھسلاؤ کہ یہ واقعات مفید ہیں۔

تاریخی کتابوں میں کس کس قسم کے واقعات درج ہونے چاہئیں

جس علم کو حقیقت میں تاریخ کہنا چاہیے اوس کو تاریخی کتابوں میں تقریباً چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اب مورخوں نے ذرا معتد بہ مقدار میں ایسے واقعات درج کرنے شروع کیے ہیں جو حقیقت میں قیمتی اور مفید ہیں۔ جس طرح قدیم زمانے میں بادشاہ سب کچھ ہوتا تھا اور رعیت ہیچ تھی، اسی طرح قدیم تواریخ کی تصویر بادشاہ کے کارناموں ہی سے معمور ہوتی ہے۔ اور قومی زندگی اس تصویر کا محض ایک تاریک حصہ ہوتا ہے جو گمنامی کی حالت میں پڑا رہتا ہے۔ آج کل کے زمانہ میں جب کہ قومی بہبودی کا خیال بہ نسبت والیان سلطنت کی بہبودی کے زیادہ غالب ہوتا جاتا ہے، مورخین نے اجتماعی ترقی کے واقعات کی طرف توجہ کرنی شروع کی ہے، پس جس بات کا جاننا ضروریات سے ہے وہ قوم کی خصوصیات اور عادات واطوار کی تاریخ ہے۔ ہم کو اُن تمام واقعات کی ضرورت ہے جو اس امر کے سمجھنے میں مدد دیتے ہیں کہ قوم نے کس طرح ترقی کی، اور وہ کس طرح قوم بن گئی؟ بے شک ان واقعات کے ضمن میں

ہم کو سلطنت کا حال بھی معلوم کرنا چاہیئے، اور جہاں تک ممکن ہو اس میں ارکان سلطنت کے متعلق غپ شپ اور بے سروپا باتیں کم ہونی چاہئیں۔ اور سلطنت کی ترکیب و ساخت اس کے اصول و آئین، تعصبات، یاد دستانہ تعلقات، عمال کی بدذاتی و رشوت ستانی وغیرہ امور کا بیان، جہاں تک ممکن ہو، زیادہ ہونا چاہیئے۔ اور اس بیان میں نہ صرف مرکزی حکومت کی ماہیت اور اس کے کاموں کا تذکرہ ہونا چاہیئے بلکہ لوکل یا مقامی انتظامات یہاں تک کہ ان کی چھوٹی سے چھوٹی شاخوں کا بھی ذکر کرنا چاہیئے۔ اس کے پہلو بہ پہلو کلیسا کی حکومت کا بیان ہونا چاہیئے یعنی اس کا نظم و نسق، اس کی حالت عمل، اس کا اقتدار، اور سلطنت کے ساتھ اس کے تعلقات اس کے سوا مذہبی رسوم، عقائد، اور مذہبی خیالات۔ نہ صرف ایسی رسوم اور خیالات جن کو لوگ برائے نام مانتے ہوں۔ بلکہ وہ بھی جن کو در اصل مانا جاتا ہے۔ اور جن پر عمل کیا جاتا ہے یہ سب باتیں بتانی چاہئیں۔ ساتھ میں ہم کو اس بات سے آگاہی ہونی چاہیئے کہ ایک جماعت کو دوسری جماعت پر کیا اقتدار حاصل تھا۔ جیسا کہ مجلسی آداب، القاب، اور طرز خطاب سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہ بھی جاننا چاہیئے کہ ان کے سوا اور کیا کیا دستور تھے جو عوام الناس کی خانگی اور بیرونی طرز معاشرت میں رہنمائی کرتے تھے یا جو زن و مرد اور والدین و اولاد کے باہمی تعلقات سے متعلق تھے۔ زیادہ مشہور افسانوں سے لے کر ان معمولی افسون اور ٹوٹکوں تک جو عام طور پر رائج ہوں۔ مذہبی توہمات بھی ظاہر کرنے چاہئیں۔ اس کے بعد انتظام صنعت و حرفت کا ایک خاکہ کھینچنا چاہیے جس سے یہ بات ظاہر ہو جائے کہ محنت کی تقسیم کس حد تک کی گئی تھی؟ تجارت کا انتظام کیسا تھا؟ خاص خاص ذاتوں یا جماعتوں کے ذریعہ سے ہوتا تھا، یا اور کسی طرح؟ آقا اور ملازم کے درمیان کس قسم کے تعلقات تھے؟ تجارتی مال کی تقسیم کے ذرائع کیا تھے؟ آمد و رفت کے وسائل کیا تھے؟ لین دین میں کس قسم کے روپیہ کا چلن تھا۔

ان سب باتوں کے ساتھ ہی فنون دست کاری کا حال بحیثیت فن بیان کرنا چاہیے اور مصنوعات کی نوعیت و خوبی بالذکر کرنا چاہیے۔ اس کے علاوہ قوم کے مختلف درجوں کی عقلی حالت کی تصویر دکھانی چاہیے۔ اس میں صرف یہی بیان نہ ہونا چاہیے کہ کس قسم کی اور کس قدر تعلیم دی جاتی تھی۔ بلکہ یہ بھی بتانا چاہیے کہ اس زمانہ میں سائنس میں کس قدر ترقی ہوئی تھی؛ اور لوگوں کا طرز عمل بالعموم کس قسم کا تھا؟ یہ بھی ذکر کرنا چاہیے کہ احساس حسن جو فن تعمیر، بت تراشی، مصوری، لباس، موسیقی، شاعری اور افسانہ نگاری سے ظاہر ہوتا ہے۔ کس درجہ تک پہونچ گیا تھا؟ لوگوں کی روزانہ معاشرت، اُن کی خوراک، مکان اور تفریح طبع کے سامان کا تذکرہ بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ اور ان باتوں کے سلسلہ میں کل طبقوں کی نظری اور عملی دونوں قسم کی اخلاقی حالت کا نقشہ بھی کھینچنا چاہیے تاکہ جو کچھ ہم نے اوپر بیان کیا ہے وہ ایک سلک میں وابستہ ہو جائے۔ یہ حالت اون کے قوانین و عادات، ضرب الامثال اور دیگر افعال سے اخذ کی جاسکتی ہے۔ ان واقعات کو اس قدر اختصار کے ساتھ، کہ صحت وصفائی میں فرق پیدا نہ ہو، بیان کرنا چاہیے۔ اور اُن کو اس طرح ترتیب وار جمع کرنا چاہیے کہ وہ بحیثیت مجموعی سمجھ میں آسکیں اور ایسے معلوم ہوں کہ گویا ایک بڑی کل کے اجزا ہیں اور قدرتی طور پر ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہیں۔ مقصد یہ ہونا چاہیے کہ اُن کو اس طرح پیش کیا جائے کہ لوگ اُن کی باہمی مناسبت کا جلدی سے کھوج لگا سکیں تاکہ اُن کو معلوم ہو جائے کہ کون کون سے تمدنی واقعات لازم و ملزوم ہیں، اسی طرح عہد بعہد کے واقعات کا نقشہ بھی کھینچکر ایسا التزام رکھنا چاہیے جس سے صاف ظاہر ہو جائے کہ ہر ایک اعتقاد، آئین، رسم و رواج، اور انتظام میں کس طرح تبدیلی واقع ہوئی۔ تمدن کی ایک مجموعی حالت نے ترقی کر کے دوسری حالت کیوں کر اختیار کی۔ زمانہ سلف کے متعلق یہی معلومات اس قسم کی ہے

جو ایک باشندۂ شہر کو اپنے چال چلن کی ہدایت کے لئے مفید ہو سکتی ہے، عملی قدر و قیمت صرف اُسی تاریخ کی ہے جس میں علم المعاشرت کو واضح طور پر بیان کیا گیا ہو۔ اور مورخ کا سب سے اعلیٰ فرض یہ ہی کہ قوموں کی سوانح عمری اس طرح بیان کرے کہ اُن کی تمدنی معاشرت کے باہمی مقابلہ کا سامان بہم پہنچ سکے تاکہ آیندہ کے واسطے اُن اصلی قوانین کا تصفیہ ہو جائے، جن کے مطابق تمدنی واقعات پیش آتے ہیں۔

اب غور کرو کہ بالفرض اس واقعی مفید تاریخی معلومات کا ایک کافی ذخیرہ حاصل کر بھی لیا جائے، تو جب تک اُس کی کنجی موجود نہ ہو وہ نسبتہً کم فائدہ مند ہوتا ہے اور اُس کی کنجی صرف سائنس ہے۔ اگر بیالوجی (حیاتیات) اور سائیکالوجی (نفسیات) کے اصول کلیہ موجود نہ ہوں تو اُمور معاشرت کی معقول تشریح محال ہی فطرت انسانی کے متعلق جس قدر تھوڑے بہت عملی نتیجے لوگ حاصل کر لیتے ہیں۔ سہل ترین واقعات تمدن کو بھی اسی قدر سمجھ سکتے ہیں۔ مثلاً کسی شئے کی رسد و طلب کا باہمی تعلق، پس جب کہ علم المعاشرت کی بالکل ابتدائی باتیں بھی اُس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتیں، جب تک اس بات کا کسی قدر علم نہ ہو کہ لوگوں کا خیال احساس اور فعل خاص صورتوں میں عموماً کس طرح عمل کرتا ہے۔ تو یہ بات صاف ظاہر ہی کہ علم المعاشرت کا وسیع علم تو اس وقت تک حاصل ہی نہیں ہو سکتا جب تک کہ انسان اور اُس کی کل جسمانی اور عقلی قوتوں سے کافی واقفیت نہ ہو۔ اگر اس امر پر اصولی حیثیت سے غور کیا جائے تو یہ نتیجہ بالکل بدیہی ہے:۔

مسئلہ قوم افراد کا مجموعہ ہے۔ جو کچھ قوم میں ہوتا ہے افراد کے مشترک فعال سے ہوتا ہے اسی وجہ سے قومی امور کا عقدہ صرف افراد کے افعال سے حل ہوتا ہے۔ مگر افراد کے افعال اُن کی فطرت کے قوانین پر

منحصر ہیں، اور جب تک ان قوانین کو نہ سمجھ لیں، اُن کے افعال سمجھ میں نہیں آسکتے لیکن ان قوانین کا تجزیہ کر کے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ نفس اور جسم کے عام قوانین سے ماخوذ ہیں، پس نتیجہ یہ نکلا کہ حیاتیات اور نفسیات دونوں علم المعاشرت کی توضیح و تشریح کے لئے نہایت ضروری ہیں۔

یا اگر ان نتائج کو اور بھی زیادہ سیدھی سادی طرح بیان کیا جائے تو یوں کہیں گے:

تمام تمدنی واقعات حیات کے واقعات ہیں۔ حیات کے نہایت پیچیدہ مظاہر ہیں، ضرور ہے کہ یہ واقعات قوانین حیات کے موافق ہوں اور وہ صرف اس وقت سمجھ میں آسکتے ہیں جبکہ قوانین حیات سمجھ میں آجائیں۔

پس انسانی کاروبار کے اس چوتھے حصّے کا انتظام بھی پہلے حصّوں کی طرح سائنس ہی پر منحصر ہے۔ تعلیمی نصاب میں عام طور پر جس علم کی تعلیم دی جاتی ہے، اس کا بہت تھوڑا حصہ امورِ معاشرت میں کسی شخص کی رہنمائی کے لئے کارآمد ہو سکتا ہے۔ صرف تاریخ کا تھوڑا سا حصّہ جو وہ پڑھتا ہے عملی قدر و قیمت رکھتا ہے۔ مگر وہ اس تھوڑے سے حصّہ کو بھی مناسب طور پر استعمال کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ وہ نہ صرف علم معاشرت کے مواد کا محتاج ہوتا ہے جو تمدنی زندگی کے لئے ضروری ہے بلکہ اس علم کا تصوّر بھی اس کے ذہن میں نہیں ہوتا۔ حیاتی و نباتی علوم کے کلیات سے بھی بے بہرہ ہوتا ہے جو دیگر علوم کے لئے بمنزلہ آلہ کے ہیں۔ اور جن کے بغیر علم معاشرت سے بھی چنداں مدد نہیں مل سکتی۔

تفریح طبع اور ترتیب مذاق کی عظمت و ضرورت

اب ہم انسانی زندگی کے باقی ماندہ حصّے کی طرف آتے ہیں، جس میں اوقات فرصت کی تفریح اور آرام و آسائش شامل ہیں۔ اِس بات پر غور کرنے کے بعد کہ

حفاظت نفس، حصول معاش، ادائے فرائض والدین، اور انسان کے اجتماعی و سیاسی طرز عمل کا باقاعدہ انتظام کرنے کے لئے کس قسم کی تربیت ہم کو سب سے زیادہ لائق بناتی ہے اب ہم کو اس بات پر غور کرنا چاہئے کہ ان متفرق مقاصد کے لئے جو ان میں داخل نہیں ہیں یعنی موجودات قدرت، علم ادب اور ہر قسم کے فنون لطیفہ سے حظ اٹھانے کے لئے کون سی تربیت ہمیں نہایت عمدہ طور پر لائق بناتی ہے چونکہ جن کاموں کا تعلق انسانی بہبودی کے ساتھ زیادہ قوی ہے ہم نے ان کاموں کے بعد حظ نفس کے کاموں کو رکھا ہے، اور ہر ایک چیز کو اس کی اصلی اور واقعی قیمت کے معیار پر پرکھا ہے، اس لئے شاید کوئی شخص یہ نتیجہ نکالے کہ ہم ان کم ضروری کاموں کو حقیر سمجھنے پر مائل ہیں۔ مگر اس سے زیادہ کوئی غلطی نہیں ہو سکتی ہمارے نزدیک علم حسن کی تربیت اور اوس کے لطف کی قدر و قیمت کچھ کم نہیں ہے مصوری، بت تراشی، موسیقی، شاعری کے بغیر اور ہر قسم کے قدرتی حسن سے جو جذبات طبیعت میں پیدا ہوتے ہیں ان کے بغیر زندگی کا آدھا لطف جاتا رہتا۔ مذاق کی تربیت اور اوس سے لطف اٹھانے کو غیر ضروری سمجھنا تو کجا ہم کو یقین ہے کہ آج کل کی نسبت آیندہ زمانہ میں انسانی زندگی کا زیادہ تر حصہ اس میں صرف ہوا کرے گا۔ جب قدرت کی قوتیں انسان کے فائدہ کے لئے پوری طرح مسخر ہو جائیں گی جب پیداوار کے وسائل کمال کے درجہ پر پہنچ جائیں گے۔ جب محنت میں انتہا درجہ کی کفایت ہو جائیگی جب تعلیم کا ایسا انتظام ہو جائے گا کہ زیادہ ضروری کاموں کی تیاری بنسبتہ سرعت کے ساتھ ہو سکے گی اور اسی وجہ سے جب لوگوں کو بہت زیادہ فرصت ملنے لگے گی اس وقت قدرت اور صنعت انسانی کے حسن سے لطف اٹھانے کا خیال سب کے دلوں میں بہت زیادہ پیدا ہو جائیگا۔

علم حسن کی تربیت اور مشاغل تفریح کا اعلیٰ درجہ کیا ہے؟

مگر اس امر کو قبول کرنا کہ علم حسن کی تربیت انسانی خوشی میں بہت کچھ ممد و معاون ہے۔ ایک الگ بات ہے۔ اور اس امر کو تسلیم کرنا کہ وہ انسانی خوشی کی ایک لازمی شرط ہے دوسری بات ہے۔ یہ تربیت کیسی ہی ضروری کیوں نہ ہو۔ تاہم تربیت کی اُن قسموں کو جو روزانہ فرائض سے براہ راست تعلق رکھتی ہیں۔ اس تربیت پر ضرور فوقیت حاصل ہونی چاہیے۔ علم ادب اور فنون لطیفہ کا وجود جیسا کہ ہم پہلے اشارتاً بیان کر چکے ہیں اُن کاموں پر منحصر ہے جن کی وجہ سے شخصی اور اجتماعی زندگی وجود پذیر ہوتی ہے اور یہ بات صاف ظاہر ہے کہ جس چیز کا وجود کسی دوسری چیز پر منحصر ہوتا ہے وہ اُس دوسری چیز سے ضرور متاخر ہوتی ہے جس پر اُس کا وجود منحصر ہے۔ باغبان پھول کی خاطر پودا لگاتا ہے۔ اور جڑ اور پتوں کی قدر خاص کر اس وجہ سے کرتا ہے کہ وہ پھول کے پیدا کرنے کا ذریعہ ہیں۔ اگرچہ اصل مقصد پھول کی پیداوار سے ہے۔ اور پھول ایسی چیز ہے کہ باقی سب چیزیں اُس کی تابع ہیں۔ مگر باغبان سمجھتا ہے کہ جڑ اور پتے بذات خود پھول سے بھی زیادہ ضروری ہیں۔ کیونکہ پھول کا نشوونما اُن ہی پر منحصر ہے۔ وہ تن درست پودے کی پرورش میں نہایت احتیاط کرتا ہے اور جانتا ہے کہ اگر پھول حاصل کرنے کے خیال میں پودے سے غفلت کی جائے تو یہ بات نادانی ہے۔ معاملہ زیر بحث میں بھی یہی صورت ہے۔ فن تعمیر، بت تراشی، مصوری، موسیقی اور شاعری کو درحقیقت تمدنی معاشرت کے پھول سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اگر ہم فرض بھی کر لیں کہ یہ فن اعلیٰ درجہ کی قدر و قیمت رکھتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ جس تمدنی معاشرت کی بدولت پیدا ہوئے ہیں۔ خود اُس معاشرت ہی پر غالب آجائیں اگرچہ یہ دعویٰ مشکل سے کیا جا سکتا ہے۔ تاہم یہ بات ماننی پڑے گی کہ صحت بخش تمدنی معاشرت کا حاصل کرنا سب سے مقدم خیال ہونا چاہیے اور جو تربیت اس میں ممد و معاون ہو

اس کا درجہ سب سے اعلیٰ ہونا چاہئے۔

موجودہ نظام تعلیم کا ایک بڑا نقص ہے

اور یہاں ہم کو اپنے نظام تعلیم کا نقص صاف طور پر نظر آتا ہے وہ پھول کی خاطر پودے سے غفلت کرتا ہے۔ نفاست و لطافت کے خیال میں وہ اصل شے کو بھول جاتا ہے۔ مروّجہ نظام تعلیم اُس علم کی بالکل تعلیم نہیں دیتا جو حفاظت نفس میں مدو معاون ہے جس علم سے حصول معاش میں سہولت پیدا ہوتی ہے اُس کے محض ابتدائی اصول بتا دیتا ہے اور اُس کے بڑے حصّہ کو چھوڑ دیتا ہے تاکہ ہر شخص اپنی آیندہ زندگی میں جس طرح چاہئے اُس کو حاصل کرے فرائض والدین کے ادا کرنے کے لئے مطلق بندوبست نہیں کرتا۔ اور فرائض تمدّن کے لئے واقعات کا ایک ذخیرہ مہیا کردیتا ہے جن میں سے اکثر واقعات تو غیر متعلق ہوتے ہیں۔ اور باقی ماندہ واقعات کی کنجی اُس کے پاس نہیں ہوتی (ان ضروری باتوں سے تو یہ غفلت!) مگر جس بات میں زیب و زینت۔ ٹیپ ٹاپ اور نام و نمود ہو اُس کی تعلیم میں سرگرمی ظاہر کرتا ہے۔ اگرچہ ہم اس بات کو پوری طرح تسلیم کرلیں کہ زمانہ حال کی زبانوں کی وسیع واقفیت ایک قابل قدر وصف ہے۔ جو مطالعہ۔ گفتگو اور سفر کے ذریعہ ہی ایک طرح کا کمال پیدا کرنے میں مدد دیتا ہے۔ تاہم یہ ہرگز لازم نہیں آتا کہ نہایت ضروری علم کو کھو کر اس وصعت کا حاصل کرنا مناسب ہے۔ اگر ہم اس بات کو صحیح فرض کرلیں کہ علم ادب اور السنہ قدیمہ کی تعلیم۔ انشاپردازی کی لطافت و نفاست اور صحت و درستی میں مدد دیتی ہے۔ تب بھی ہم کہہ سکتے ہیں کہ عظمت و ضرورت کے لحاظ سے انشاپردازی کی خوبی کو اصول تربیت اولاد کی واقفیت سے کچھ نسبت نہیں ہے مان لو کہ کسی مردہ زبان میں لکھی ہوئی نظم کے پڑھنے سے مذاق کو ترقی ہوتی ہے تاہم اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ مذاق کی ترقی قدر و قیمت میں قوانین صحت کی واقفیت

کے برابر ہے۔ ہنرمندی وخوش سلیقگی۔ فنون لطیفہ، علم فصاحت و بلاغت، شاعری اور وہ تمام فنون جن کو ہم تمدن کے پھول سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ بالکل اُس تعلیم و تربیت کے تابع رہنے چاہئیں جس پر تمدن کی بنیاد ہے، جس طرح زندگی کا زمانۂ فرصت ان کاموں میں صرف ہوتا ہے اُسی طرح تعلیم کا زمانۂ فرصت اُن میں صرف ہونا چاہیے۔

علم حسن اور مشاغل تفریح کے لئے بھی سائنس کی ضرورت ہے

علم حسن کے اصلی درجہ کو اس طرح سے تسلیم کرنے اور یہ بات قرار دینے کے بعد کہ گو اس قسم کی تربیت شروع ہی سے تعلیم کا جز ہونی چاہیے۔ تاہم یہ تربیت بالاستقلال نہیں۔ بلکہ اس حیثیت سے ہونی چاہیے کہ دوسرے علوم میں مدد و معاون ہو۔ اب ہم کو یہ دریافت کرنا ہے کہ اس مقصد کے لئے کون سا علم سب سے زیادہ کارآمد ہے؟ زندگی کے اس باقی ماندہ شغل کے واسطے کون سا علم سب سے زیادہ مناسب ہے؟ اس سوال کا جواب بھی وہی ہے جو اس سے پہلے دیا جا چکا ہے گو یہ بیان خلاف توقع ہو۔ مگر ہے صحیح۔ کہ ہر ایک اعلیٰ درجہ کا فن سائنس پر مبنی ہے۔ بغیر سائنس کے نہ تو کامل ایجاد پیدا کی جا سکتی ہے اور نہ اُس کی پوری قدر ہی ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے کہ بہت سے اعلیٰ درجہ کی مشہور صنّاعوں کو سائنس کی واقفیت باعتبار ان محدود اصطلاحی معنوں کے نہ ہو جو عام طور پر لوگوں میں مشہور ہیں۔ مگر چونکہ یہ صنّاع دقیق نظر سے مشاہدہ کرنے والے ہوتے ہیں۔ اس لئے اُن عملی نتائج کا ذخیرہ ہمیشہ اُن کے قبضہ میں رہتا ہے جو ادنیٰ درجہ کی سائنس ہے اور وہ عادۃً درجۂ کمال سے بہت گرے ہوئے رہتے ہیں۔ اس کی وجہ کسی قدر یہ ہے کہ اُن کے تجربوں کے نتیجے قلیل اور نادرست ہوتے ہیں۔ یہ بات کہ سائنس بالضرور فنون لطیفہ کی بنیاد ہے برہان لمّی کے ذریعے سے ثابت ہے

جب کہ ہم اس بات کو یاد رکھیں کہ تمام کیفیات نفسی یا واقعات طبیعی اُسی قدر عمدہ ہوتے ہیں۔ ہم کو ابھی معلوم ہو جائے گا کہ یہ نتیجہ جو برہان لمّی سے ثابت ہے تجربہ کے مطابق ہے۔

فن بت تراشی کے لئے سائنس اور اصول جرثقیل کی واقفیت درکار ہے

جو نوجوان بت تراشی کے پیشہ کے لئے تیاری کرتے ہیں۔ اُن کو انسانی جسم کے رگ پٹھوں۔ اُن کی تقسیم اُن کے باہمی تعلق اور اُن کی حرکات سے ضرور واقفیت پیدا کرنی چاہیے۔ یہ سائنس کا ایک حصّہ ہے۔ اور اُس کا حاصل کرنا ان بہت سی غلطیوں کے روکنے کے واسطے ضروری ہے جو اس علم کے نہ جاننے والے بُت تراش کر بیٹھتے ہیں۔ اصول جرثقیل کا علم بھی ضروری ہے اور چوں کہ بت تراش عموماً اس علم سے ناواقف ہوتے ہیں اس لئے جرثقیل کے متعلق اکثر اوقات غلطیاں کرتے ہیں۔ اس بات کو ایک مثال کے ذریعہ سے سمجھ لو۔ بت کی مضبوطی کے لئے ضرور ہے کہ مرکز ثقل سے جو عمود ڈالا جائے جس کو خط السّمت کہتے ہیں۔ عماد کے قاعدہ کے اندر واقع ہو اور اسی وجہ سے ایسا ہوتا ہے کہ جب کوئی شخص اُس حالت میں کھڑا ہوتا ہے۔ جو "قیام الرّاحت[1]" کے نام سے مشہور ہے۔ جس میں ایک ٹانگ سیدھی تنی رہتی ہے۔ اور دوسری ذرا ڈھیلی اور خم کھائے ہوئے ہوتی ہے، تو خط السّمت سیدھی تنی ہوئی ٹانگ کے پاؤں کے اندر واقع ہوتا ہے۔ مگر جو بت تراش مسئلہ توازن[2] سے ناواقف ہیں۔ وہ حالت قیام کی اس وضع کو عموماً اس طرح ظاہر کرتے ہیں کہ خط السّمت دونوں پاؤں کے بیچ میں واقع ہوتا ہے متحرک

[1] یہ ترجمہ ہے سٹینڈنگ ایٹ ایز Standing at ease کا قواعد کے وقت سپاہیوں کے کھڑے ہونے کی ایک خاص وضع کا نام ہے۔ مترجم

[2] توازن ترجمہ ہے ایکوی لیبرئم Equilibrium کا یعنی ہر طرف سے وزن کا برابر ہونا۔ مترجم

شئے کی قوت کے قانون کی ناواقفیت سے بھی اس قسم کی غلطیاں سرزد ہوتی ہیں۔ مثلاً ڈسکا بولس[1] کی مورت پر غور کرو جس کو لوگ حیرت سے دیکھتے ہیں۔ اس مورت کو جب کہ وہ اپنی جگہ پر قایم ہے ہاتھ سے پتھر چھوٹتے کے ساتھ ہی آگے کی طرف لامحالہ جھک جانا چاہیے۔

فن مصوری میں سائنس کی درحقیقت نہایت ہی ضرورت ہے۔

مصوری میں سائنس کی واقفیت کی ضرورت۔ اگر عقلی واقفیت نہ ہو تو عملی ہی سہی۔ اور بھی زیادہ نمایاں طور پر ظاہر ہے۔ اہل چین کی تصویریں بے ڈول اور بے ہنگم کیوں ہوتی ہیں؟ اس کی وجہ یہی ہے کہ مصور۔ صورتوں کے قوانین کا بالکل لحاظ نہیں رکھتے۔ تصویر اتارتے وقت مختلف چیزوں کے فاصلوں اور ان کی چھٹائی بڑائی کا خیال واجبی طور پر نہیں رکھتے۔ اور تصویر کے روشن اور تاریک حصّہ کو باقاعدہ رنگ وروغن لگانے کے اصول سے ناواقف ہوتے ہیں۔ نیچے کی بنائی ہوئی تصویروں میں اور کیا عیب ہوتا ہے۔ سوائے اس کے کہ اسی طرح ان میں بھی اصلیت نہیں ہوتی۔ تصویر میں اصلیت کا موجود نہ ہونا زیادہ تر اس قاعدے کی ناواقفیت کا نتیجہ ہے جس کے موافق چیزوں کی صورتیں مختلف حالتوں میں مختلف ہوتی ہیں؟ ذرا ان کتابوں اور لکچروں ہی کو یاد کرو جن کے ذریعہ سے طلبہ کو تعلیم دیجاتی ہے یا رسکن[2]

[1] ڈسکا بولس اس پہلوان کو کہتے ہیں۔ جو چکی کے پاٹ کی شکل کے گول بھاری پتھروں یا دھات کے ٹکڑوں کو طاقت آزمائی اور کسرت کے لئے پھینکتا ہے۔ قدیم زمانے کا ایک بت بھی اسی نام سے مشہور ہے جس کی تصویر اس طرح بنائی گئی تھی کہ اس کے ہاتھ میں ایک بھاری قرص ہے اور وہ اس کو پھینکنا چاہتا ہے۔ اس بت کی کئی نقلیں یا تصویریں اب تک محفوظ ہیں۔ مترجم

[2] جان رسکن۔ انگلستان کا باشندہ اور انیسویں صدی عیسوی کا ایک مشہور مصنف ہے جس نے مختلف فنون اور خاص کر فن مصوری میں کتابیں لکھی ہیں۔ ۱۸۱۹ء میں پیدا ہوا تھا۔ مترجم

کی تنقید پر غور کر دیا اُن تصویروں کو دیکھو جو اُس زمانے سے پہلے کی بنی ہوئی ہیں جب کہ رافائیل[۵] نے اپنے اصول مصوّری کا رواج دیا تھا۔ اور تم کو معلوم ہو جائے گا کہ مصوّری کی ترقی اُس علم کی ترقی پر دلالت کرتی ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قدرتی امور کے نتائج کس طرح پیدا ہوتے ہیں کیسی ہی محنت اور مصروفیت سے کسی چیز کا مشاہدہ کیا جائے اگر اُس مشاہدہ میں سائنس سے مدد نہ لی جائے تو غلطی سے نہیں بچ سکتے۔ ہر ایک مصوّر اس بات کو تسلیم کرے گا کہ جب تک یہ معلوم نہ ہو کہ خاص خاص حالتوں میں کون کون سی صورتیں پیدا ہونی چاہئیں۔ اُس وقت تک اُن صورتوں میں اکثر تمیز نہیں ہو سکتی اور اس امر کا معلوم کرنا کہ کون کون سی صورتیں پیدا ہونی چاہئیں بجائے خود صورتوں کے سائنس یا علم الصوَر سے واقفیت پیدا کرنا ہے۔ مسٹر جے لوئس اگرچہ ہوشیار مصوّر ہے مگر سائنس کی ناواقفیت کی وجہ سے تصویر بناتے وقت جالی دار کھڑکی کے سایہ کو سامنے کی دیوار پر صاف طور پر نمایاں لکیروں میں ظاہر کرتا ہے۔ اگر اُس کو سایہ کے قانون سے واقفیت ہوتی کہ سایہ روشنی کے ساتھ نامعلوم طور پر کس طرح مل جاتا ہے تو وہ ایسا نہ کرتا۔ مسٹر ونزنی ٹ یہ دیکھ کر کہ بعض بال دار سطحوں پر خاص قسم کی روشنی پڑنے سے روشنی کی شعاعیں خاص طرح کے رنگ پیدا کرتی ہیں (یعنی بالوں میں سے گزرتے وقت روشنی کی انحراف و انتشار سے مختلف رنگ پیدا ہوتے ہیں) بال دار سطح کی تصویر بنانے میں یہ غلطی کرتا ہے کہ اُن رنگوں کو ایسی سطحوں پر اور ایسی حالتوں میں ظاہر کرتا ہے جہاں وہ واقع نہیں ہو سکتے۔

فنِ موسیقی میں سائنس کی ضرورت درکار ہے

یہ کہنا کہ موسیقی میں بھی سائنس کی مدد درکار ہے۔ اور بھی زیادہ حیرت و استعجاب

---

[۵] رافائیل۔ اٹلی کا ایک مصور تھا ۱۴۸۳ء میں پیدا ہوا تھا اور ۱۵۲۰ء میں انتقال کیا۔ مترجم

کا باعث ہوگا۔ تاہم یہ بات ثابت ہوسکتی ہے کہ موسیقی۔ جذبات کی قدرتی زبان کی ہوبہو تصویر ہے۔ اور اسی وجہ سے جہاں تک کہ موسیقی اس قدرتی زبان کے موافق ہوگی۔ اسی قدر اچھی یا بُری ہوگی۔ آواز کے طرح طرح کے اُتار چڑھاؤ جو مختلف قسم اور مختلف شدت کے جذبات کے ساتھ ساتھ پیدا ہوتے ہیں، وہ بیج ہیں جن سے علم موسیقی نے نشوونما پایا ہے یہ ثابت ہوسکتا ہے کہ آواز کا اُتار چڑھاؤ اور سُر کا ہلکا یا مدہم ہونا ایک اتفاقی اور اندھا دھند بات نہیں ہے بلکہ بعض عام اور قوی الاثر اصول پر منحصر ہے۔ اور سُروں کا با اثر ہونا اسی اصول پر منحصر ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ نغمہ کے اجزا اور وہ راگنیاں جو اُن سے پیدا ہوتی ہیں صرف اُس وقت مؤثر ہوسکتی ہیں جب کہ وہ ان عام اُصول کے مطابق ہوں۔ یہاں اس بات کی مناسب تشریح مشکل ہے۔ مگر شاید مثال کے طور پر ان کثیر التعداد ذلیل اور نکمّے گیتوں کا ذکر کردینا کافی ہوگا جو اپنے موذی اثر سے محفلوں میں سامعین کے عیش کو منغص کردیتے ہیں۔ یہ گیت ایسی تصانیف ہیں جن کی سائنس ممانعت کرتا ہے۔ اس قسم کے گیت سائنس کے گناہ گار ہیں۔ اس وجہ سے کہ وہ علم موسیقی میں ایسے خیالات بہم پہنچاتے ہیں جو جذبات طبیعت کے اس قدر موافق نہیں ہیں کہ اُن سے موسیقی کا مقصد حاصل ہوسکے۔ اور اس وجہ سے بھی سائنس کے گناہ گار ہیں کہ وہ ایسے اجزائے موسیقی کو استعمال کرتے ہیں جن کو اُن خیالات سے قدرتی تعلق نہیں ہے جو اُن اجزا سے ظاہر ہوتے ہیں گو وہ خیالات جذبات طبیعت کے موافق ہوں۔ یہ گیت اس وجہ سے خراب ہیں کہ ان میں اصلیت نہیں ہے اور یہ کہنا کہ ان میں اصلیت نہیں ہے یہی معنی رکھتا ہے کہ وہ سائنس کے خلاف ہیں۔

موسیقی کی طرح شاعری میں بھی قدرتی جذبات کا

**شاعری پر بھی یہی بات صادق آتی ہے۔** موسیقی کی طرح شاعری کی جڑ بھی قدرتی طرز بیان ہے جو گہرے وجدان و تاثر سے پیدا ہوتا ہے۔ اشعار کی موزونیت

لحاظ رکھنا لازم ہے

اُن کے مؤثر اور کثیر استعارات و اغراقات، اُن کی پُرزور تقلیب یہ سب چیزیں پرجوش تقریر کے مبالغہ آمیز خط و خال ہیں۔ پس نظم کی عمدگی کے لیے یہ بات ضرور ہے کہ اُن قوی العمل عصبی قوانین پر توجہ کی جائے۔ جن کی پابندی پرجوش تقریر میں مد نظر رہتی ہے۔ پرجوش تقریر کی خصوصیتوں کو آپس میں متحد کرنے اور زور دار بنانے کے لیے تناسب کا لحاظ رکھنا لازم ہے اور شاعری کے ہتھیاروں کو بے روک ٹوک استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ بلکہ جہاں خیالات میں جوش بہت کم ہو وہاں شاعرانہ طرز بیان کو کمی کے ساتھ استعمال کرنا چاہیے جس قدر جوش زیادہ ہوتا جائے اُسی قدر آزادی سے اس طرز بیان کو اختیار کرنا چاہیے۔ اور جہاں کہیں یہ جوش درجہ غایت پہنچ جائے وہاں اس طرز کو بھی صد درجہ تک پہنچانا چاہیے۔ اگر ان اصول کی بالکل مخالفت کی جائے گی تو نتیجہ یہ ہوگا کہ شاعری میں صرف لفّاظی اور زٹل قافیہ کے سوا اور کچھ باقی نہ رہے گا۔ ان اصولوں کا کافی لحاظ نہ رکھنا اُس قسم کی شاعری میں دیکھا جاتا ہے جس میں پند و نصیحت کا بیان ہوتا ہے اور چوں کہ ان قوانین کی شاذ و نادر ہی پوری طرح پابندی کی جاتی ہے اس لیے شاعری کا بہت سا حصہ شاعری کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔

ہر ایک صناع کو علم سائیکالوجی کی واقفیت ضروری ہے

یہی بات نہیں کہ ہر ایک صاحب فن اپنا کام اُس وقت تک صحیح طور پر نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ اُن چیزوں کے قوانین کو نہ سمجھ لے جن کو وہ بناتا ہے بلکہ اُس کو یہ بھی سمجھ لینا لازم ہے کہ اُس کی صنعت کی مختلف خصوصیتوں کا اثر ناظرین یا سامعین کے دلوں پر کیا پڑے گا؟ اور یہ سوال علم سائیکالوجی (نفسیات) سے متعلق ہے کسی صنعت کا اثر جو دل پر ہوتا ہے۔ وہ صریحاً اُن لوگوں کی ذہنی حالت پر منحصر ہے جن کے سامنے اُس صنعت کو پیش کیا جاتا ہے اور چوں کہ انسان کی ذہنی حالتوں میں

بعض خصوصیتیں مشترک ہیں، اس لئے ایسے عام اصول ضرور نکلیں گے جن کے موافق ہی مصنوعات کو تیار کرنے سے کامیابی ہو سکتی ہے۔ صناع ان عام اصول کو پوری طرح اس وقت تک نہیں سمجھ سکتا۔ اور نہ اُن کو استعمال کر سکتا ہے۔ جب تک کہ اُس بات کو نہ سمجھ لے کہ وہ اصول قوانین نفس سے کس طرح مستنبط ہوتے ہیں۔ یہ سوال کرنا کہ آیا فلاں تصویر کی بناوٹ عمدہ ہے یا نہیں، اصل میں اس بات کا سوال کرنا ہی کہ ناظرین کے ادراکات اور تاثرات پر اُس تصویر کا کیسا اثر پڑتا ہے؟ یہ سوال کرنا کہ آیا فلاں ناٹک عمدہ طور پر تیار کیا گیا ہے یا نہیں، اس بات کا سوال کرنا ہے کہ آیا اُس کے اجزا کو موقع و محل کے لحاظ سے اس طرح ترتیب دیا گیا ہے یا نہیں کہ حاضرین محفل کی توجہ پوری طرح قایم رہے۔ اور کسی خاص قسم کے جذبات پر زیادہ بار نہ پڑے نظم یا افسانہ کے بڑے بڑے حصّوں کی ترتیب اور ایک ہی جملہ کی بندش الفاظ سے جو اثر پیدا ہوتا ہے اُس کی خوبی اس بات پر منحصر ہے کہ پڑھنے والے کے جوش اور تاثر سے ہنرمندی اور سلیقہ کے ساتھ کام لیا جائے۔ ہر ایک صناع اپنی تعلیم کے زمانہ میں اور ختم تعلیم کے بعد جب کہ وہ اپنے کاروبار میں مصروف ہوتا ہی ایسے اصول کا ذخیرہ جمع کرتا رہتا ہے جن کے ذریعہ سے اس کا کام باقاعدہ چلتا ہے۔ اگر تم اُن اصول کی جڑ کا کھوج لگاؤ تو وہ یقیناً اُصول نفسیات تک تمہاری رہنمائی کریں گے اور جب کوئی صناع نفسیات کے اِن اصولوں کو اور اُن کے مختلف نتائج کو سمجھ لیتا ہے اُسی وقت ان کے موافق کام کر سکتا ہے۔

کسی فن کی تکمیل کے لئے قدرتی لیاقت اور سائنس کی واقفیت دونوں ضروری

ہم ایک لمحہ کے لئے بھی اس بات کا یقین نہیں کرتے کہ سائنس کسی شخص کو صناع یا صاحب فن بنا سکتا ہے اگرچہ ہم اس امر پر زور دیتے ہیں کہ ہر ایک صناع کو نفسیات و طبیعات کے بڑے بڑے قوانین سمجھ لینے چاہئیں لیکن ہم اس بات سے مطلق بحث

ضروری ہیں

نہیں کرستے کہ ان قوانین کی واقفیت قدرتی ملکہ کی جگہہ کام دے سکتی ہے، نہ صرف شاعر بلکہ ہر قسم کا صاحب فن پیدا ہوتا ہے بنتا نہیں۔ بیان بالا سے ہمارا مطلب صرف اتنا ہے کہ خلقی قابلیت باضابطہ علم کی مدد سے مستغنی نہیں ہوسکتی۔ قدرتی ذکاوت بہت کچھ کرسکتی ہے۔ مگر سب کچھ نہیں کرسکتی۔ جب فطرتی جوہر کا ازدواج سائنس کے ساتھ ہوتا ہے تب کہیں اعلیٰ ترین نتائج پیدا ہوسکتے ہیں۔

سائنس، جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے کسی صنعت میں پورا کمال حاصل کرنے کے لئے ہی ضروری نہیں ہے۔ بلکہ فنون لطیفہ کو پوری طرح سمجھنے کے لئے بھی درکار ہے۔ کسی تصویر کی خوبیوں کو معلوم کرنے کی لیاقت بچے کی نسبت بڑے آدمی میں کیوں زیادہ ہوتی ہے؟ اس کی وجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ قدرت اور زندگی کے واقعات، جو تصویر میں ظاہر کئے جاتے ہیں، بڑے آدمی کو اُن کا علم بہت زیادہ ہوتا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ ایک مہذب شریف آدمی ایک دہقان کی نسبت عمدہ نظم سے زیادہ لطف اُٹھاتا ہے؟ صرف یہ وجہ ہے کہ اُس کو مختلف اشیا اور حرکات سے بہت زیادہ واقفیت ہوتی ہے۔ اور اسی واقفیت کی بدولت نظم میں اس کو بہت سی باتیں نظر آتی ہیں جو دہقان کو نظر نہیں آسکتیں۔ اور اگر تصویروں کی خوبیوں کو سمجھنے سے پہلے اصل چیزوں سے جن کی وہ تصویریں ہیں، کچھ نہ کچھ واقفیت حاصل کرنی ضروری ہے۔ جیسا کہ بیان مذکور سے صاف ظاہر ہے تو اُس سے یہ بات لازم آتی ہے کہ تصویر کی پوری خوبی اُسی وقت سمجھ میں آسکتی ہے جب کہ اصل چیزوں کو پوری طرح سمجھ لیا جائے حقیقت یہ ہے کہ کسی صنعت کے کام میں جس قدر زیادہ خوشی حاصل ہوتی ہے اور جو لوگ اس اصلیت سے بے بہرہ ہیں وہ اُس خوشی سے محروم رہتے

ہیں۔ کوئی صناع کسی خاص کام میں حقایق اصلیہ کو جس قدر زیادہ ظاہر کرتا ہے اُسی قدر زیادہ طبیعتوں کو اوس کام کی طرف مائل کر لیتا ہے، اُسی قدر زیادہ خیالات اُس کام کو دیکھکر دل میں پیدا ہوتے ہیں اور اُسی قدر زیادہ لطف حاصل ہوتا ہے مگر اس لطف کے حاصل کرنے کے واسطے یہ بات ضرور ہے کہ صناع نے اپنی صنعت میں جن حقیقتوں کا اظہار کیا ہے، دیکھنے والا، سننے والا اور پڑھنے والا اُن کو جانتا ہو اور ان حقیقتوں کا جاننا گویا اُن کی حد تک سائنس سے واقف ہونا ہے۔

سائنس بجائے خود شاعری۔

اب ایک بڑے معاملہ کو جو اور بھی زیادہ ضروری ہے ہم کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے یعنی یہ بات کہ سائنس نہ صرف بت تراشی، مصوری، موسیقی، اور شاعری کی بنیاد ہے بلکہ سائنس بجائے خود شاعری ہے۔ یہ خیال جو عام طور پر مشہور ہے کہ سائنس اور شاعری ایک دوسرے کے مخالف ہیں ایک دھوکا ہے۔ یہ بات حقیقت میں سچ ہے کہ ادراک اور جذبہ جو شعور یا نفس کی دو مختلف حالتیں ہیں، ایک دوسرے کو خارج کرنا چاہتی ہیں، اور بے شک یہ بھی سچ ہے کہ حد اعتدال سے بڑھ کر قواے متفکرہ کا عمل جذبات کو مردہ کر دیتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس جذبات کا عمل، اعتدال سے زیادہ ہو تو قواے متفکرہ کو مردہ کر دیتا ہے۔ درحقیقت اس معنی میں تو سب قسم کی قوتیں ایک دوسرے سے متناقص ہیں مگر یہ بات کہ سائنس کے واقعات شاعری کے منافی ہیں۔ یا بعبارت دیگر "سائنس کی تحصیل لازمی طور پر تخیل احساس اور حسن کے خلاف واقع ہوتی" ہرگز صحیح نہیں ہے۔ برعکس اس کے سائنس شاعری کی اُس اقلیم کو ہمارے سامنے بے نقاب کر دیتی ہے جو سائنس سے ناواقف لوگوں کی نگاہ میں بالکل چٹیل میدان ہے۔ جو لوگ سائنس کی تحقیقات میں مصروف ہیں وہ ہمیشہ اس بات کو ثابت کر دیتے ہیں کہ وہ بہ نسبت دوسرے لوگوں کے اپنے مضامین

کی شاعری کا لطف کم نہیں بلکہ زیادہ خوبی و صفائی کے ساتھ اُٹھاتے ہیں جو شخص ہیو ملر[1] کی تصانیف علم طبقات الارض میں غور و خوض کرے۔ یا مسٹر لوئس کی کتاب سی سائڈ سٹڈیز (تحقیقات بحری) کا مطالعہ کرے اُس کو ضرور معلوم ہو جائے گا کہ سائنس شاعری کے جوش کو سرد نہیں کرتا۔ بلکہ اور زیادہ بڑھاتا ہے اور جو شخص گیٹے[2] کی سوانح عمری پر غور کرے گا اُس کو یہ بات ضرور معلوم ہو جائے گی کہ شاعر اور سائنس کا عالم ایک ہی وقت میں یکساں مستعدی سے کام کر سکتا ہے۔ کیا یہ بات درحقیقت بیہودہ اور قریب قریب ناپاک اعتقاد نہیں ہے کہ جس قدر زیادہ کوئی شخص قدرت کا مطالعہ کرے گا اُسی قدر کم اُس کی توقیر کرے گا؟ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ پانی کا قطرہ جو عام لوگوں کی نظر میں صرف پانی کا قطرہ ہے ماہر علم طبعیات کی نظر میں اس کی وقعت کچھ کم ہو جائے گی جو اس بات کو جانتا ہے کہ اُس قطرہ کے ذرات ایک قوت کے ذریعے سے وابستہ ہیں اور اگر وہ قوت یکایک زائل ہو جائے تو اُس سے بجلی کی چمک پیدا ہو گی؟ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ جس شئے کو ایک ناواقف آدمی بے پروائی سے برف کا گالا سمجھتا ہے اگر اُس کے عجیب و غریب گونا گوں، پاکیزہ، برفانی، شفاف اور بلور نما اوراق کو کوئی شخص خردبین کے ذریعے سے دیکھے گا تو اُس کے دل میں اعلیٰ درجہ کے خیالات کا تسلسل پیدا نہ ہو گا؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ ایک گول چٹان کا پتھر جس پر متوازی خطوط کے نشانات کھدے ہوئے ہیں جاہل آدمی کے دل میں اُسی قدر شاعرانہ خیالات پیدا کرتا ہے جس قدر کہ عالم ارضیات کے دل

[1] ہیو ملر سکاٹ لینڈ کا باشندہ تھا۔ اُس نے جی آلوجی (علم طبقات الارض) میں کتابیں تصنیف کی ہیں ۱۸۰۲ء میں پیدا ہوا تھا اور ۱۸۵۶ء میں فوت ہوا۔ مترجم

[2] گیٹے ملک جرمنی کا ایک مصنف تھا ۱۷۴۹ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۳۲ء میں انتقال کیا۔ مترجم

ہیں جو اس بات کو جانتا ہے کہ دس لاکھ برس پہلے ایک برف کا ٹیلا اس چٹان پر بہتا ہوا گزرا تھا؟ اصل بات یہ ہے کہ جو لوگ کبھی سائنس کے مشاغل میں مصروف نہیں ہوئے وہ شاعری کے بہت بڑے حصے سے جو اُن کے گردوپیش موجود ہے بالکل محروم اور اندھے ہیں جس شخص نے جوانی کے زمانہ میں پودوں اور کیڑوں کو جمع نہ کیا ہو وہ اس دل چسپی کی آدھی قدر بھی نہیں جانتا۔ جو گلی کوچوں اور خاردار جھاڑی کی قطاروں سے حاصل ہو سکتی ہے۔ جس شخص نے معدنی اشیائے متحجرہ کی کبھی تلاش نہ کی ہو اس کو اُن شاعرانہ خیالات کا تصوّر بہت کم ہو سکتا ہے جو ان مقامات میں پیدا ہوتے ہیں جہاں یہ خزانے زمین کے اندر پائے جاتے ہیں جس شخص نے سمندر کے کنارے پر خردبین کے ذریعہ سے آبی جانوروں کی حرص کا معائنہ نہ کیا ہو۔ ابھی اس کو یہ بات سیکھنی ہے کہ سمندر کے کنارے پر سب سے اعلیٰ درجہ کی پرلطف چیزیں کون سی ہیں حقیقت میں اس امر کا دیکھنا افسوس ناک ہے کہ لوگ خفیف باتوں میں اپنے تئیں مصروف رکھتے ہیں اور نہایت عظیم الشان مظاہر قدرت کی طرف سے غافل اور لاپرواہ ہیں۔ گنبد افلاک کی عمارت کو سمجھنے کی پروا نہیں کرتے مگر میری[1] ملکہ سکاٹ لینڈ کی سازشوں کی بابت ذلیل بحث و مباحثہ میں گہری دل چسپی لیتے ہیں! یونانی غزل پر عالمانہ نکتہ چینی کرتے ہیں اور اُس عظیم الشان مثنوی کو جو خدائے تعالےٰ نے اپنے دست قدرت سے طبقات الارض پر لکھی ہے نظر اٹھا کر نہیں دیکھتے اور اُس کے پاس سے کترا کر نکل جاتے ہیں۔

[1] میری سٹوارٹ سکاٹ لینڈ کی ملکہ تھی ۱۵۴۲ء میں پیدا ہوئی تھی۔ اس پر الزبتھ ملکہ انگلستان کے قتل کی سازش کا الزام لگایا گیا تھا۔ چنانچہ بعد تحقیقات جرم ثابت ہوگیا اور ۱۵۸۷ء میں اُس کا سر قلم کیا گیا۔ مترجم

پس ہم دیکھتے ہیں کہ سائنس کی تعلیم انسانی کاروبار کے اِس آخری حصہّ کے لئے
بھی مناسب سامان مہیا کرتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ علم حسن عموماً لازمی طور پر سائنس کے
اصول پر مبنی ہے۔ اوران ہی اصول کی واقفیت کی بدولت اُس کو پوری کامیابی کے
ساتھ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر ایک فن کی تنقید اوراوس کی خوبیوں کی
پوری قدر کرنے کے لئے چیزوں کی ماہیت کا علم یا دوسرے لفظوں میں یوں کہو کہ
سائنس کا علم ضروری ہے۔ اور ہم صرف اتنی بات نہیں دیکھتے کہ سائنس تمام قسم کے
فنون اور شاعری کی سہیلی ہے بلکہ یہ بات بھی دیکھتے ہیں کہ اگر صحیح طور پر خیال کیا جائے
تو سائنس بجائے خود شاعری ہے۔

تربیت کے اعتبار سے مختلف علموں کی اضافی قدر وقیمت

یہاں تک ہم نے اس سوال پر بحث کی ہے کہ عملی ہدایت کی غرض سے خاص
خاص علموں کی قدر وقیمت کیا ہے؟ اب ہم کو ذہنی تربیت کی غرض سے مختلف
علموں کی اضافی قدر وقیمت کی بابت رائے قایم کرنی ہے۔ ہم مجبور ہیں کہ مضمون کے
اس حصّہ پر نسبتہً اختصار کے ساتھ بحث کریں اور خوش قسمتی سے اُس پر طویل بحث کی
ضرورت بھی نہیں ہے۔ جب ہم کو یہ بات معلوم ہو گئی کہ ایک خاص مقصد کے واسطے
کون سی چیز سب سے عمدہ ہے تو ہم کو ضمناً یہ بھی معلوم ہو گیا کہ دوسرے مقصد کے لئے
سب سے عمدہ چیز کیا ہے؟ ہم کو بالکل یقین رکھنا چاہئے کہ جو امور چال چلن کی اصلاح
کے لئے نہایت مفید ہیں اُن کے علم سے عقلی مشق ضرور حاصل ہوتی ہے۔ جو قواے
عقلی کو مضبوط بنانے کے لئے نہایت مناسب ہے۔ اگر معلومات حاصل کرنے کے
واسطے ایک قسم کی تربیت درکار ہوتی اور عقلی مشق کے لئے دوسری قسم کی تربیت درکار
ہوتی تو یہ بات قدرت کے حسن انتظام کے بالکل خلاف ہوتی۔ تمام موجودات قدرت
میں ہم ہر جگہہ اس بات کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ قوتیں اُن ہی فرایض کو پورا کرنے کی بدولت

نشو و نما پاتی ہیں جن کا پورا کرنا اُن کا کام ہے۔ نہ کہ اُن مصنوعی ورزشوں کو پورا کرنے کی بدولت جو اُن کو ادائے فرائض کے قابل بنانے کی غرض سے تجویز کی گئی ہیں۔ امریکہ کے سرخ فام وحشی باشندے میں حیوانات کا عملی تعاقب کرنے کی بدولت ایسی پھُرتی اور چالاکی پیدا ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے اُس کو شکار پکڑنے میں کامیابی ہوتی ہے اور اپنی زندگی کے مختلف کاروبار کی بدولت اُس کی جسمانی قوتوں میں ایسا عمدہ موازنہ اور تناسب پیدا ہو جاتا ہے کہ ورزش اور کسرت سے کبھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ دشمن اور شکار کا کھوج لگانے میں عرصہ دراز کی مشق و مہارت کے بعد جو کمال اُس وحشی آدمی نے حاصل کیا ہے اوس میں ادراک کی ایسی تیزی مخفی ہوتی ہے کہ عقل کی مصنوعی تربیت سے ہرگز پیدا نہیں ہو سکتی۔ یہی بات تمام حالتوں پر صادق آتی ہے۔ جنوبی افریقہ کا خانہ بدوش وحشی آدمی دور کی اُن چیزوں کی شناخت کرنے میں جن کا اُس کو تعاقب کرنا یا جن سے اُس کو بچنا پڑتا ہے۔ عادۃً مصروف رہتا ہے، اس لئے اُس کی نظر اس قدر تیز ہو جاتی ہے کہ دوسرا شخص بغیر دوربین کے اتنی دور کی چیزوں کو نہیں دیکھ سکتا۔ اس وحشی آدمی سے لے کر اُس محاسب تک جو روزانہ مشق کی بدولت ہندسوں کی کئی کئی سطروں کو ایک ساتھ جوڑ سکتا ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ ایک فطرتی جوہر میں اعلیٰ درجہ کی قوت اُن فرایض کو پورا کرنے سے پیدا ہوتی ہے جو زندگی کی مختلف حالتوں میں پورے کرنے پڑتے ہیں۔ اور برہانِ لِمّی کے ذریعے ہم اس بات کا یقین کر سکتے ہیں کہ یہی قانون ہر قسم کی تعلیم پر صادق آتا ہے، جو تعلیم ہدایت کی غرض سے نہایت قیمتی ہے وہی تعلیم فِی وَقتٍ وَّاحِدٍ تربیت کی غرض سے بھی نہایت قیمتی ہے۔ آؤ اس امر کی شہادت پر غور کریں۔

معمولی نصاب تعلیم میں زبانوں کی تعلیم پر جو اس قدر زور دیا گیا ہے اُس کا زبان اور

سائنس کی تعلیم کا مقابلہ زبان کی تعلیم کی طرح سائنس کی تعلیم سے بھی قوت حافظہ کو ترقی ہوتی ہے

ایک فائدہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اُس سے حافظہ قوی ہوتا ہے۔ یہ فائدہ مطالعہ الفاظ کے ساتھ مخصوص سمجھا جاتا ہے۔ مگر سچ یہ ہے کہ حافظہ کی مشق کے لئے سائنس اس سے بہت زیادہ وسیع میدان مہیا کرتا ہے، نظام شمسی کا پورا حال یاد کرلینا کوئی آسان کام نہیں ہے، کہکشاں کی بناوٹ کے متعلق جو باتیں اب تک معلوم ہوئی ہیں اُن کا یاد کرنا اور بھی زیادہ مشکل ہے مرکب مادّی چیزوں کی تعداد جس میں علم کیمیا روزمرہ اضافہ کرتا رہتا ہے، اس قدر زیادہ ہے کہ پروفیسروں کے سوا کوئی شخص اُن کو شمار نہیں کرسکتا۔ اور رسالمات کی ترکیب اوران تمام مرکبات کے تعلقات کا یاد رکھنا۔ تاوقتیکہ تمام عمر علم کیمیا ہی کے مطالعہ میں صرف نہ کی جائے قریب قریب ناممکن کے ہے۔ زمین کی بالائی سطح پر مظاہر قدرت کا ایک وافر ذخیرہ نظر آتا ہے اور زمین کے مدفون طبقوں میں مظاہر قدرت کا اور بھی زیادہ ذخیرہ موجود ہے، ان میں وہ مضمون بھرا ہوا ہے جس پر عبور حاصل کرنے کے لئے طبقات الارض کے طالب علم کو برسوں محنت کرنی پڑتی ہے، طبعیات کے بڑے بڑے عنوانات مثلاً آواز۔ حرارت۔ روشنی اور قوت برقی میں بے شمار واقعات ایسے موجود ہیں جن سے ہر وہ شخص، جو اُن کو سیکھنے کا قصد رکھتا ہے دنگ رہ جاتا ہے۔ اور جب ہم اُس سائنس کی طرف رجوع کرتے ہیں جس میں جسمانی اعضا اور اُن کے افعال سے بحث ہوتی ہے، اس وقت قوت حافظہ کی کشش و کوشش جو اس سائنس کے واسطے درکار ہے، بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ صرف علم تشریح الاجسام انسانی میں رگ پٹھوں، ہڈیوں وغیرہ کی تفصیل اس قدر زیادہ ہے کہ نوجوان سرجن کو مستقل طور پر یہ سب چیزیں ذہن میں محفوظ رکھنے کے لئے عموماً چھ مرتبہ اُن کو از بر یاد کرنا پڑتا ہے پودوں کی نوعیں، جیسا کہ عالمان نباتات نے بیان کیا ہے، تقریباً تین لاکھ بیس ہزار

تک پہنچتی ہیں اور جان داروں کی طرح طرح کی صورتیں جن سے حیوانات کے عالم کو کام پڑتا ہے اُن کا اندازہ تخمیناً بیس لاکھ تک کیا گیا ہے۔ عالمان سائنس کے سامنے واقعات کا ایسا وسیع ذخیرہ موجود ہے کہ وہ عمل تقسیم در تقسیم ہی کے ذریعہ سے اُن پر بحث کر سکتے ہیں۔ ہر شخص اپنی خاص شاخ کے مفصل علم کے علاوہ متعلقہ شاخوں کی صرف عام واقفیت رکھتا ہے اور شاید بعض دیگر شاخوں کے ابتدائی اصول سے بھی واقف ہوتا ہے۔ پس اگر نہایت معمولی حد تک بھی سائنس کی تحصیل کی جاوے۔ تب بھی یقیناً حافظہ کے لئے کافی مشق بہم پہنچ سکتی ہے۔ کم از کم اتنا تو ضرور کہہ سکتے ہیں کہ **سائنس سے قوت حافظہ کی تربیت ایسی ہی عمدہ ہو سکتی ہے جیسی زبان سے۔**

قوت حافظہ کی نوعیت کے لحاظ سے سائنس کو زبان پر بیحد فوقیت ہے سائنس سے حافظہ اور عقل دونوں کو ترقی ہوتی ہے

اب اس بات پر غور کرو کہ محض حافظہ کی تربیت کے لئے سائنس اگر زبان سے بہتر نہیں ہے تو اُس کے برابر تو ضرور ہے۔ تاہم سائنس جس قسم کے حافظہ کی تربیت کرتی ہے، اُس کے اعتبار سے سائنس کو زبان پر بے حد فوقیت حاصل ہے زبان کی تحصیل میں جو تصورات ذہن میں قایم کئے جاتے ہیں اُن کا تعلق ایسے واقعات سے ہوتا ہے جو زیادہ تر عارضی و اتفاقی ہوتے ہیں۔ حالانکہ سائنس کی تحصیل میں یہ بات ہے کہ جو تصوّرات ذہن میں قایم کئے جاتے ہیں اُن کا تعلق ایسے واقعات سے ہوتا ہے جو اکثر لازمی و ضروری ہوتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ الفاظ کی تعلقات اپنے معنوں کے ساتھ ایک اعتبار سے قدرتی ہیں اور ایک خاص حد تک ان تعلقات کی اصلیت کا کھوج بھی لگایا جا سکتا ہے۔ اگرچہ بنیاد تک اُس کا کھوج شاذ و نادر ہی ملتا ہے اور اس اصلیت کا کھوج لگانے کے قوانین مثل سائنس (علم النفس) کی ایک شاخ ہیں جس کو علم اللسان کہتے ہیں۔ مگر چونکہ اس بات میں کسی شخص کو کلام

نہ ہوگا کہ زبان کی تحصیل میں، جیسا کہ معمولاً رواج ہے لفظوں اور اُن کے معنوں میں قدرتی تعلقات کا عموماً کھوج نہیں لگایا جاتا۔ اور اُن کے قوانین کی تشریح نہیں کی جاتی۔ پس اس بات کو ضرور تسلیم کرنا چاہیے کہ الفاظ و معانی کو عموماً اس طرح یاد کرلیا جاتا ہے کہ گویا اُن میں اتفاقی و عارضی تعلقات ہیں۔ برعکس اس کے جو تعلقات سائنس سے معلوم ہوتے ہیں وہ سببی تعلقات ہوتے ہیں اور اگر مناسب طور پر اُن کی تعلیم دی جاوے تو طالب علم اُن تعلقات کو ایسا ہی سمجھتا ہے۔ پس زبان غیر معقول تعلقات سے آگاہ کرتی ہے سائنس معقول تعلقات سے آگاہ کرتی ہے۔ زبان محض حافظہ کی تربیت کرتی ہے تو سائنس حافظہ اور سمجھ دونوں کی تربیت کرتی ہے۔

سائنس کی تعلیم سے قوت فیصلہ کو ترقی ہوتی ہے اور اس اعتبار سے اُس کو زبان کی تعلیم پر بڑی فوقیت ہے

پھر اس امر کو بھی مدنظر رکھو کہ سائنس کو زبان پر اس حیثیت سے کہ وہ تربیت کا وسیلہ ہے۔ ایک بڑی فوقیت یہ بھی ہے کہ وہ قوت فیصلہ کو ترقی دیتا ہے عقلی تعلیم کی سب سے زیادہ عام خرابی قوت فیصلہ کا نقص ہے۔ جیسا کہ پروفیسر فراڈے[1] نے اپنے لکچر میں جو رائل انسٹیٹیوشن (درسگاہ شاہی) میں عقلی تعلیم پر دیا گیا تھا عمدہ طور پر بیان کیا ہے لکچرار موصوف بیان کرتے ہیں کہ "لوگ عام طور پر نہ صرف قوت فیصلہ کی تعلیم کے لحاظ سے جاہل ہیں بلکہ اس جہالت سے بھی جاہل ہیں اور جہل مرکب میں پڑے ہوئے ہیں"۔ پروفیسر موصوف اس حالت کو جس سبب سے منسوب کرتے ہیں وہ سائنس کی تعلیم کا نہ ہونا ہے۔ اُن کے نتیجہ کی صداقت ظاہر ہے۔ گرد و پیش کی اشیا واقعات اور نتائج کی بابت صحیح رائے قایم کرنی اُسی صورت میں ممکن ہے جب کہ ہم کو

[1] پروفیسر فراڈے انگلستان کا باشندہ تھا کیمیا اور علم حیوانات کا عالم تھا۔ ۱۷۹۱ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۶۷ء میں انتقال کیا۔ مترجم

یہ معلوم ہو کہ گرد و پیش کے قدرتی مظاہر کس طرح ایک دوسرے پر منحصر ہیں؟ الفاظ کے معنوں سے خواہ کتنی ہی واقفیت کیوں نہ ہو، یہ واقفیت **علل و معلولات** کی بابت صحیح نتائج نکالنے کی ذمہ داری نہیں کرتی۔ صحیح رائے قایم کرنے کی قوت صرف اس طرح حاصل ہو سکتی ہے کہ واقعات موجودہ سے نتائج نکالنے اور پھر مشاہدہ اور تجربہ سے اُن نتائج کی تصدیق کرنے کی عادت ڈالی جائے اور سائنس کے بے شمار فوائد میں سے ایک فائدہ یہ ہے کہ اُس سے اس قسم کی عادت لامحالہ پیدا ہو جاتی ہے۔

عقلی تربیت کے علاوہ اخلاقی تربیت کے لئے بھی سائنس نہایت مفید ہے

مگر سائنس نہ صرف عقلی تربیت بلکہ **اخلاقی تربیت** کے لئے بھی نہایت عمدہ ہے زبانوں کی تحصیل کا میلان اگر کچھ ہے تو یہ ہے کہ تحکم کی ناواجب عزت جو پہلے ہی لوں میں موجود ہوتی ہے اور بھی زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ معلّم یا لغت کہتا ہے کہ "ان لفظوں کے یہ معنی ہیں"۔ گریمر (صرف و نحو) کہتی ہے کہ "اس صورت کے لئے فلاں فلاں قاعدہ ہے" ان تحکمانہ اقوال کو بے چون وچرا تسلیم کیا جاتا ہے۔ طالب علم کی طبیعت کا ہمیشہ یہ ڈھنگ رہتا ہے کہ وہ تحکمانہ تعلیم کے آگے سر تسلیم خم کرتا ہے اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جو اصول قائم کئے جائیں اُن کو بلا تحقیق قبول کر لینے کا میلان پیدا ہوتا ہے مگر سائنس کی تعلیم سے نفس کی جو حالت پیدا ہوتی ہے وہ اس سے بالکل مختلف ہی سائنس ہمیشہ شخصی عقل کی طرف رجوع کرتی ہے اُس کی حقیقتوں کو محض تحکماً نہیں مانا جاتا۔ بلکہ سب لوگ آزاد ہیں کہ اُن حقیقتوں کی جانچ کریں نہیں، بلکہ بہت سی صورتوں میں طالب علم پر تقاضا کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے نتائج پر غور و خوض کرے۔ سائنس کی تحقیقات میں ہر ایک بات کو فیصلہ کے لئے اُس کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ اُس سے یہ نہیں کہا جاتا کہ اُس تحقیقات کو خواہ مخواہ تسلیم کرے جب تک کہ اُس کا سچ ہونا بچشم خود نہ دیکھ لے۔ اور جب وہ صحیح طور پر نتائج نکالتا ہے اور قدرت اپنی یک رنگی اور

باقاعدگی سے اُن کی تصدیق کرنی ہے تو اُس کو اپنی قوتوں پر، جو اس طرح تجربہ کرنے سے پیدا ہوتی ہیں، زیادہ وثوق ہوجاتا ہے۔ یہ سب باتیں اُس آزادی کا سرچشمہ ہیں جو خصلت کا نہایت عمدہ جوہر ہے، سائنس کی تعلیم سے صرف اتنا ہی اخلاقی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ اگر سائنس کا مطالعہ تا بہ مقدور اصلی تحقیقات کی شکل میں جاری رکھا جائے اور ہمیشہ ایسا ہی ہونا چاہئے تو وہ استقلال اور راستبازی کو بھی ترقی دیتا ہے جیسا کہ پروفیسر ٹنڈل[۱] تحقیقات استقرائی کی بابت لکھتے ہیں:۔

پروفیسر ٹنڈل کی رائے تحقیقات استقرائی کے متعلق۔

"اس تحقیقات سے لئے ہمارا نہ محنت درکار ہے۔ اس بابت کی ضرورت ہے کہ موجودات قدرت میں جو حقیقتیں ظاہر ہوں اُن کو عاجزی اور راستبازی سے قبول کیا جائے۔ کامیابی کی پہلی شرط یہی ہے کہ ان کو ایمانداری سے تسلیم کیا جائے اور جو خیالات پہلے سے دماغ میں سمائے ہوئے ہوں۔ اگر وہ امر واقعی کے خلاف ثابت ہوں تو اُن کو یکقلم ترک کرنے کے لئے رضامند اور مستعد رہیں۔ خواہ وہ خیالات کیسے ہی عزیز کیوں نہوں یقین جانو کہ سائنس کا سچا خادم اپنے ذاتی تجربہ میں خود بینی کو ترک کردیتا ہے۔ یہ خصلت بجائے خود عمدہ ہے مگر دنیا کبھی اس کا ذکر سننا نہیں چاہتی"۔

سائنس کی تعلیم سے مذہبی تعلیم بھی حاصل ہوتی ہے۔

آخر میں ہم کو یہ بیان کرنا ہے اور کچھ شک نہیں کہ یہ بیان حیرت و استعجاب کا موجب ہوگا کہ ہماری معمولی تعلیم پر سائنس کی تعلیم اس وجہ سے بھی فایق ہے کہ اُس سے مذہبی تعلیم حاصل ہوتی ہے۔ درحقیقت الفاظ سائنس اور مذہب کو یہاں اُن کے معمولی محدود معنوں میں نہیں بلکہ اُن کے نہایت ہی اعلیٰ اور وسیع معنوں میں ہم نے

[۱] پروفیسر ٹنڈل برطانیہ کلاں کا رہنے والا تھا۔ زمانہ حال میں تم ٹینی کا مشہور و معروف عالم گزرا ہے ۱۸۲۰ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۹۳ء میں انتقال کیا۔ مترجم

استعمال کیا ہے۔ بے شک سائنس اُن توہمات کی دشمن ہے جو مذہب کے نام
سے مشہور ہیں۔ نہ کہ اصلی و حقیقی مذہب کی۔ جس کو یہ توہمات محض پوشیدہ
کر دیتے ہیں۔ اس میں بھی شک نہیں کہ بہت سی سائنس جو رائج ہے اس میں
لامذہبی کی روح غالب ہے۔ مگر نہ اُس سچے سائنس میں جو سطح سے گزر
کر تہ تک پہنچ گئی ہے۔

پروفیسر ہکسلی کی رائے سچے سائنس اور سچے مذہب کی نسبت

پروفیسر ہکسلی[1] نے حال ہی میں اپنے لکچروں کے سلسلہ کے اختتام پر بیان کیا تھا۔

"سچی سائنس اور سچا مذہب توام بھائی ہیں ان کی باہمی جدائی یقیناً
دونوں کی موت ہے سائنس میں جس قدر مذہبی روح ہوگی ٹھیک اسی نسبت
سے وہ ترقی کرے گی اور جہاں تک سائنس کی گہرائی اور مضبوطی پر مذہب
کی بنیاد قایم ہوگی۔ ٹھیک اسی مناسبت سے مذہب سرسبز ہوگا حکمائے
جو بڑے بڑے کام کئے ہیں محض اُن کی عقل و ذکاوت کا ثمرہ نہیں ہیں بلکہ
زیادہ تر اس بات کا ثمرہ ہیں کہ مذہبی جوش نے جو ان کی طبیعت میں نمایاں
طور پر پایا جاتا تھا ان کی عقل کو سیدھے رستہ پر ڈال دیا تھا علمی حقایق زیادہ
تر اُن کے صبر۔ اُن کی محنت۔ اُن کی راست بازی اور اُن کی نفس کشی
کی بدولت منکشف ہوئے ہیں۔ نہ کہ ان کی منطقی ذکاوت کی بدولت۔"

سائنس بے دینی کی تعلیم نہیں دیتا بلکہ سائنس سے غفلت کرنی بے دینی ہے

اکثر لوگوں کا یہ خیال کہ سائنس لامذہبی اور بے دینی کی تعلیم دیتا ہے محض
غلط ہے۔ سائنس کا لامذہبی کی تعلیم دینا تو ایک طرف خود سائنس سے غفلت کرنی
بے دینی ہے۔ مخلوقات الٰہی جو ہمارے گرد و پیش موجود ہے اُس کا مطالعہ نہ کرنا بے دینی

[1] پروفیسر ہکسلی۔ انگلستان کا باشندہ اور حیوانات کا عالم تھا۔ ۱۸۲۵ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۹۵ء میں
فوت ہوا۔ مترجم

ہے۔ ایک ادنیٰ مثال سے اس بات کو سمجھ لو۔ فرض کرو کہ بعض لوگ روزمرّہ کسی مصنف کی تعریفوں کے پل باندھا کریں۔ فرض کرو کہ مصنف کی جس قدر تعریفیں کی جائیں اُن کا مضمون ہمیشہ یہی ہو کہ اُس کی تصانیف کی حکمت و دانائی عظمت و جلالت اور خوبی و لطافت کا اعتراف کیا جاسے۔ فرض کرو کہ جو لوگ اس طرح اُس کی کتابوں کی صفت و ثنا متواتر بیان کرتے رہتے ہیں۔ وہ اُن کتابوں کی صرف بیرونی صورت دیکھنے پر قناعت کریں اور اُن کا مضمون سمجھنے کی کوشش تو الگ رہی۔ کبھی اُن کو کھول کر بھی نہ دیکھیں۔ بھلا ایسے آدمیوں کی تعریفوں کی (جو "تحسین ناشناس" کا مصداق ہیں) ہم کو کیا قدر کرنی چاہئے؟ اُن کی صداقت و راست بازی کی نسبت ہم کو کیا خیال کرنا چاہئے؟ تاہم اگر چھوٹی چیزوں کا بڑی چیزوں کے ساتھ مقابلہ کیا جاسے تو ہم کو معلوم ہوجانے گا کہ موجودات عالم اور اُس کی علّت (خدائے تعالےٰ) کی نسبت بھی بنی نوع انسان کا طرزِ عمل عموماً اسی قسم کا ہے نہیں بلکہ اس سے بھی بدتر ہے۔ فقط اتنی ہی بات نہیں کہ وہ بغیر مطالعہ کے اُن چیزوں کے پاس سے کترا کر نکل جاتے ہیں جن کو وہ روزمرّہ نہایت عجیب و غریب بتاتے ہیں۔ بلکہ جو لوگ قدرت کے مشاہدہ میں اپنا وقت صرف کرتے ہیں اکثر اوقات اُن پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ وہ فعل عبث میں اوقات ضائع کرتے ہیں اور جو لوگ ان عجائبات میں علمی ذوق و شوق ظاہر کرتے ہیں اُن کو واقعی حقیر سمجھتے ہیں۔ پس ہم مکرر بیان کرتے ہیں کہ سائنس نہیں بلکہ سائنس سے غفلت کرنی بے دینی ہے[1]۔ سائنس کی محبت خاموش عبادت ہے یعنی جن چیزوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے اُن کی عظمت کو اور کنایۃً اُن کی

[1] قرآن شریف میں سینکڑوں مقامات پر کائنات کا اور مخلوقات سے خدائے تعالےٰ کی ہستی اور اُسکی قدرت پر استدلال کیا گیا ہے اور انسان کو جابجا اس امر کی ہدایت کی گئی ہے کہ وہ مظاہر قدرت کا بغور مطالعہ کرکے خدائے تعالیٰ کی عظمت و جلالت کو سمجھے۔ مثلاً سورۂ آل عمران میں ہے: (بقیہ نوٹ صفحہ ۱۱۷ پر)

علّت (خدائے تعالےٰ) کی عظمت کو چپ چاپ تسلیم کرنا ہے۔ یہ صرف زبانی بندگی نہیں
ہے بلکہ ایسی بندگی ہے جو افعال سے ظاہر ہوتی ہے۔ یہ ایسی اطاعت نہیں ہے جس میں
صرف اقرار باللسان ہو بلکہ ایسی اطاعت ہے جس میں تصدیق بالجنان اور عمل بالارکان
بھی شامل ہیں اور اس کا ثبوت وقت۔ غور و فکر اور محنت کو قربان کرنے سے ملتا ہے۔

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱۶ (۱) ان فی
خلق السموٰت والارض واختلاف الیل
والنہار لاٰیٰت لاولی الالباب ۙ الذین
یذکرون اللہ قیاما وقعودا وعلیٰ
جنوبھم ویتفکرون فی خلق السموٰت
والارض ج ربنا ما خلقت ھٰذا باطلا ج
سبحانک فقنا عذاب النار (سورہ آل عمران آیۃ ۱۸۸-۱۹۱)

آسمان اور زمین کی بناوٹ اور رات اور دن کے ردّ و
بدل میں عقلمندوں کے لئے قدرت الٰہی کی نشانیاں موجود
ہیں۔ جو کھڑے، بیٹھے اور لیٹے خدا کو یاد کرتے ہیں۔ اور
آسمان و زمین کی ساخت میں غور کرتے ہیں (اور بے
اختیار یوں اُٹھتے ہیں کہ) اے ہمارے پروردگار، تو نے
اس عالم کو بے فائدہ نہیں بنایا۔ تیری ذات پاک ہے ہم کو
عذاب دوزخ سے بچائیو۔

سورہ نحل میں ہے

(۲) ھو الذی انزل من السماء ماء لکم
منه شراب ومنه شجر فیه تسیمون ینبت
لکم به الزرع والزیتون والنخیل والاعناب
ومن کل الثمرات ان فی ذٰلک لاٰیة لقوم
یتفکرون و سخر لکم الیل والنہار
والشمس والقمر والنجوم مسخرات
بامرہ ان فی ذٰلک لاٰیٰت لقوم یعقلون

(سورہ نحل - آیت ۱۰-۱۲)

وہی قادر مطلق ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا جسمیں
سے کچھ تمہارے پینے کا ہے اور اُسی سے درخت پرورش پاتے
ہیں جنہیں مویشیوں کو کھلاتے ہو۔ اُسی پانی سے خدا تمہارے
لئے کھیتی اور زیتون اور کھجور اور انگور اور ہر طرح کے پھل پیدا
کرتا ہے۔ جو لوگ غور و فکر سے کام لیتے ہیں۔ ان کے لئے اس
میں قدرت خداوندی کا ایک نشان ہے۔ اور اُسی نے رات
اور دن اور سورج اور چاند کو تمہارا تابع کر رکھا ہے اور ستارے
بھی اُسی کے حکم سے تمہارے فرماں بردار ہیں عقل والوں کے لئے
ان چیزوں میں قدرت خدا کی بہت سی نشانیاں ہیں۔

سائنس کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس سے قوانین قدرت پر وثوق اور اُنکی فرماں برداری کی ترغیب پیدا ہوتی ہے

سچی سائنس صرف اسی وجہ سے خالص مذہبی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ اس وجہ سے بھی کہ قدرت کی ہر ایک چیز میں جو اتحا د عمل پایا جاتا ہے اوس کے لئے سائنس ہمارے دلوں میں عظمت پیدا کرتی ہے اور خدا کا پختہ اعتقاد جماتی ہے - سائنس داں کو منظا ہر قدرت کے غیر متغیّر تعلقات کا علّت و معلول کے لازوال علاقہ کا - نیک و بد نتائج کے لزوم کا کامل یقین ہو جاتا ہے - سماعی اعتقاد جزا و سزا کی بجائے رجس کو حاصل کرتے یا جس سے بچنے کی باوجود نافرمانی اور سرکشی کے لوگ بے فائدہ توقع رکھتے ہیں) وہ یہ بات دیکھتا ہے کہ ایک مقررہ آئین کے موافق جزا و سزا ملتی رہتی ہے اور نافرمانی کے بدنتائج اٹل ہوتے ہیں، وہ دیکھتا ہے کہ جن قوانین کی ہم کو فرماں برداری کرنی چاہیئے وہ نامہربان بھی ہیں اور مہربان بھی، وہ دیکھتا ہے کہ اُن قوانین کی پابندی سے ہر شئے کی رفتار ہمیشہ زیادہ تر کمال اور اعلیٰ تر خوشی کی طرف رجوع کرتی ہے - یہی وجہ ہے کہ وہ ہمیشہ اُن قوانین پر زور دیتا ہے - اور جب اُن کی طرف سے بے پروائی کی جاتی ہے تو اُس کو غصّہ آتا ہے اور اس طرح چیزوں کے ازلی و ابدی اصول اور اُن کی تعمیل کی ضرورت کا اقرار کرکے حقیقت میں اپنے تئیں مذہبی آدمی ثابت کرتا ہے -

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱۷) شیخ سعدیؒ قرآن شریف کے اسی مضمون کو اس طرح بیان کیا ہے ؎

| | |
|---|---|
| ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کارند | تا تو نانے بکف آری و بغفلت نہ خوری |
| ہمہ از بہر تو سرگشتہ و فرماں بردار | شرط انصاف نباشد کہ تو فرماں نبری |

قرآن شریف میں سینکڑوں آیتیں اس مضمون کی موجود ہیں - جن کو ہم بخوف طوالت اس مختصر نوٹ میں درج نہیں کر سکتے - جن سے ثابت ہے کہ خدائے تعالےٰ نے موجوداتِ قدرت کا علم (یعنی سائنس) کے حاصل کرنے کی انسان کو کس قدر تاکید کی ہے - پس مصنف کا یہ قول کہ "سائنس سے غفلت کرنی بے دینی ہے" بجائے خود درست ہے - مترجم

آخر میں ہم سائنس کی ایک اور مذہبی ہیئت دکھاتے ہیں۔ وہ یہ کہ زندگی کے رازہائے سربستہ کے ساتھ ہم کو جو تعلق ہے اُس تعلق کا اور خود اپنے نفس کا صحیح تصوّر سائنس ہی کی بدولت حاصل ہوسکتا ہے، سائنس اُن تمام باتوں کو بتاتا ہے جن کا جاننا ممکن ہے اور ساتھ میں اُس حد کو بتاتا ہے جس سے آگے کا حال ہم کو کچھ نہیں معلوم ہوسکتا۔ سائنس ہم کو بطور اعتقاد کے یہ بات نہیں سکھاتا کہ علت العلل کی ماہیت کا سمجھنا محال ہے بلکہ ہر طرف اُس سرحد پر پہنچا کر جس سے آگے قدم رکھنے کی مجال نہیں۔ اس امر کے محال ہونے کو کھلّم کھلّا ہم سے تسلیم کرا لیتا ہے۔ سائنس اس بات کو برائے العین مشاہدہ کرا دیتا ہے اور کسی دوسرے طریقہ سے یہ بات حاصل نہیں ہوسکتی۔ کہ اُس ہستی کے آگے جو عقل انسانی سے بالاتر ہے، عقل انسانی قاصر و عاجز ہے۔ سماعی روایات اور لوگوں کی اسناد کی طرف اُس کی روش شاید متکبرانہ ہو۔ مگر اُس پردۂ اسرار کے آگے جس میں قادر علی الاطلاق چھپا ہوا ہے اور جس میں کوئی شخص باریاب نہیں ہوسکتا۔ اُس کی روش عاجزانہ ہی ہے[1]

سائنس اس امر کو تسلیم کرتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی حقیقت کا سمجھنا نہ صرف عقل انسانی بلکہ خیال و قیاس سے بھی بالاتر ہے۔

| اگر یک سرِ موئے برتر پرم | | فروغِ تجلّی بسوزد پرم | |
|---|---|---|---|

پس سائنس کا کبر بھی سچا ہے اور انکسار بھی سچّا۔ سائنس کا صرف سچا عالم (اور اس لقب سے ہماری مراد اُس شخص سے نہیں ہے جو صرف فاصلوں کا اندازہ کرتا ہے یا مرکبات کی تحلیل کرتا ہے، یا چیزوں کی نوعیں مقرر کرتا ہے بلکہ ہماری مراد اُس شخص سے ہی جو ادنیٰ حقیقتوں کے ذریعہ سے اعلیٰ حقیقتوں کا اور آخر کار اعلیٰ ترین حقیقتوں کا سُراغ لگاتا ہی) ہاں صرف سائنس کا سچا عالم حقیقت میں یہ بات سمجھ سکتا ہی کہ قادر مطلق کی قدرت جو سب چیزوں پر حاوی ہی نہ صرف انسانی علم، بلکہ انسانی خیال و

[1] موقع اور محل کی مناسبت سے یہ اشعار ترجمہ میں بڑھا دیے گئے ہیں۔ مترجم

قیاس سے بھی کس قدر برتر ہے اور کائنات، حیات اور ادراک اُسی قدرت کے کرشمے ہیں! سُبْحَانَهٗ مَا اَعْظَمَ شَانَهٗ [۱]

| | |
|---|---|
| اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم | وز ہر چہ گفتہ اند و شنیدیم و خواندہ ایم |
| دفتر تمام گشت و بپایاں رسید عمر | ما ہمچناں در اوّل وصفِ تو ماندہ ایم |

پس ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ تربیت اور نیز ہدایت کے اعتبار سے سائنس کی قدر و قیمت سب سے بڑھ کر ہے۔ بہرحال چیزوں کے معنے یاد کرنا لفظوں کے معنے یاد کرنے سے بہتر ہے۔ کیا باعتبار عقلی و اخلاقی تربیت کے اور کیا بہ لحاظ مذہبی تربیت کے گرد و پیش کے مظاہر قدرت کا مطالعہ صرف و نحو اور لغت کے مطالعہ پر بعید فوقیت رکھتا ہے۔

اس باب کی عنوان پر جو سوال درج کیا گیا ہے اس کا جواب کہ "سب سے زیادہ قیمتی علم سائنس ہے"

پس اس مضمون کے شروع میں جو سوال ہم نے کیا تھا کہ "کون سا علم سب سے زیادہ قیمتی ہے"؟ اس کا یہی ایک جواب ہے کہ "سائنس"۔ تمام بیانات پر عدالت کا حکم ناطق یہی ہے "بلاواسطہ حفاظت نفس"، یعنی زندگی اور صحت کو قائم رکھنے کے لئے سب سے زیادہ قیمتی علم سائنس ہے "بالواسطہ حفاظت نفس" کے لئے جس کو ہم حصول معاش کہتے ہیں سب سے زیادہ قیمتی علم سائنس ہے۔ فرایض والدین کے باقاعدہ ادا کرنے کے لئے مناسب ہدایت صرف سائنس سے حاصل ہوتی ہے۔ گزشتہ و موجودہ قومی زندگی جس کے بغیر کوئی باشندہ شہر دستی سے اپنے چال چلن کا انتظام نہیں کر سکتا۔ اُس کو کھولنے کے لئے جس کنجی کی ضرورت ہے وہ سائنس ہی ہے علیٰ ہٰذا القیاس ہر قسم کے فن کی پوری پوری تکمیل اور اس سے موجودہ لطف اُٹھانا۔ اس مقصد کے واسطے بھی سائنس ہی ہم کو تیار کرتا ہے

[۱] موقع اور محل کی مناسبت سے یہ اشعار ترجمہ میں بڑھا دیے گئے ہیں۔ مترجم

اور عقلی و اخلاقی و مذہبی تربیت کی غرض سے بھی سب سے زیادہ موثر مطالعہ سائنس ہے۔ جو سوال پہلے پہل نہایت پریشان کرنے والا معلوم ہوتا تھا دوران تحقیقات میں نسبتہً آسان ہوگیا ہے۔ اب ہم کو اس بات کا اندازہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ مختلف قسم کے انسانی مشاغل کی عظمت کس قدر ہے اور کس کس قسم کی تعلیم اُن مشاغل کے واسطے ہم کو لائق بناتی ہے۔ کیوں کہ ہم دیکھتے ہیں کہ سائنس کا مطالعہ اپنے نہایت ہی وسیع معنوں میں اُن تمام مشاغل کے لئے نہایت عمدہ طور پر تیار کرتا ہے ہم کو مختلف علموں کے دعووں کا فیصلہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ کون سے علم کی قدر وقیمت زیادہ ہے، گو رسمی و اعتباری ہو۔ اور کون سے علم کی قدر وقیمت کم ہے۔ گو اصلی و واقعی ہو۔ کیوں کہ ہم نے تحقیق کرلیا ہے کہ جو علم دیگر اعتبارات سے سب سے زیادہ قیمتی ثابت ہوچکا ہے اُس کی اصلی و ذاتی قدر وقیمت بھی سب سے زیادہ ہے۔ اُس کی قدر وقیمت لوگوں کی رائے پر منحصر نہیں ہے بلکہ ایسی مستقل اور معین ہے جیسا کہ انسان کا تعلق گرد و پیش کی دنیا سے۔ چوں کہ حقایق سائنس ضروری اور ابدی ہیں اس لئے تمام سائنس تمام نوع انسان سے ابد تک تعلق رکھتی ہے۔ آج کل اور نہایت ہی بعید آیندہ زمانہ میں بھی لوگوں کے چال چلن کے باضابطہ انتظام کے لئے سائنس کی عظمت ضرور بے حد و حساب رہے گی تاکہ وہ جسمانی عقلی اور تمدنی حیثیت سے علم المعاشرت کو سمجھ سکیں اور باقی تمام سائنس کو اس حیثیت سے سمجھ سکیں کہ وہ علم المعاشرت کی کنجی ہے۔

ہرچند سائنس کے فوائد مسلم ہیں مگر لوگ اب بھی اس کی طرف سے [illegible] ہیں

اگرچہ سائنس کے مطالعہ کی عظمت ہر قسم کے مطالعہ سے بہت ہی زیادہ فوقیت رکھتی ہے۔ تاہم اس زمانہ میں کہ لوگوں کو اپنی تعلیم پر بڑا ناز ہے۔ سائنس کی تعلیم پر سب سے کم توجہ کی جاتی ہے۔ حالاں کہ اگر سائنس نہ ہوتی تو جس چیز کو ہم تہذیب کہتے ہیں اُس کا کہیں وجود ہی نہ ہوتا۔ اس پر بھی ہماری تعلیم میں، جس کو ہم مہذب تعلیم کہتے ہیں سائنس

کا عنصر اس قدر کم ہے کہ گویا نہ ہونے کے برابر ہے۔ اگرچہ سائنس ہی کی ترقی کی بدولت یہ بات ہے کہ جہاں کسی زمانہ میں صرف ہزاروں آدمیوں کو خوراک مل سکتی تھی اب لکھوکھا آدمی پرورش پاتے ہیں تاہم ان لکھوکھا آدمیوں میں سے صرف چند[1] ہزار آدمی اُس تعلیم کا کسی قدر ادب و لحاظ کرتے ہیں جس نے اُن کی زندگی کو ممکن کر دیا ہے۔ اگرچہ اشیا کی خواص و

[1] انگلستان جیسے چھوٹے سے ملک میں جس کی مردم شماری صرف سوا تین کروڑ ہے۔ اور یہ مردم شماری صوبہ جات متحدہ آگرہ و اودھ کی مردم شماری سے بھی بقدر ایک ثلث کے کم ہے۔ بقول مصنف اگر چند ہزار آدمی سائنس کی تعلیم کی طرف متوجہ اور اُس کے قدر کرنے والے موجود ہیں۔ تو یہ تعداد کچھ کم نہیں ہے۔ انگلستان کی موجودہ ترقی کا حال سب کو معلوم ہے۔ عیاں را چہ بیاں۔ مگر مصنف اس ترقی کو کافی نہ سمجھ کر اپنی قوم کو آگے قدم بڑھانے کی ترغیب دیتا ہے۔ وائے برحال ہندوستان۔ جہاں تیس کروڑ باشندوں میں سے کئی ہزار تو کجا کئی سو آدمی بھی ایسے نہیں نکلیں گے جنھوں نے سائنس کی معمولی ہی تعلیم حاصل کی ہو، اور اگر سائنس کے عملی پہلو کو لیا جائے تو یہ تعداد صفر سے متجاوز نہ ہوگی۔ ہمارے ملک میں سائنس کی علمی و عملی تعلیم حاصل کرنے کی ضرورت نہایت شدید ہے اور ابنائے ملک کی ایک معتدبہ تعداد کو اس طرف ضرور توجہ کرنی چاہیے۔ اگر یہ فرض کفایہ ادا نہ کیا گیا تو تمام اہل ملک خدائے تعالیٰ کے سامنے گنہگار ٹھیریں گے کہ اُنھوں نے اپنی خداداد قابلیتوں کو معطل کر دیا۔ اور ملک کو اُن سے فائدہ نہ پہنچایا۔ قحط کے متواتر دوروں سے آئے دن لاکھوں آدمی بھوکوں مرتے ہیں اور کروڑوں آدمیوں کو پیٹ بھر کر روٹی میسر نہیں ہوتی۔ اگر ہندوستان میں سائنس کی علمی و عملی ترقی ہو، جابجا صنعت و حرفت کے مختلف کارخانے کھل جائیں تو ملک کا افلاس بہت کچھ دور ہو سکتا ہے۔ ہمارے ہموطنوں نے تعلیم کا بڑا مقصد یہ سمجھ رکھا ہے کہ بی اے یا ایم اے کی ڈگری حاصل کر کے سرکاری نوکری حاصل کر لیں۔ اول تو نوکری ہی غلامی ہے دوسرے اُس کا دائرہ اُسی نسبت سے روز بروز تنگ ہو جاتا ہے جس نسبت سے کہ تعلیم یافتوں کی تعداد میں ترقی ہوتی جاتی ہے۔ پس ضرور ہے کہ اس بھیڑیا چال کو روکا جائے۔ میری اس رائے سے کسی کو اختلاف نہ ہوگا کہ موجودہ تعلیم ملک میں مفلسوں کی تعداد کو ترقی دے رہی ہے۔ اس کا انسداد

(باقی ۲۳ پر)

تعلقات کے روز افزوں علم (سائنس) نے قبائل خانہ بدوش کی حالت میں اتنی ہی تبدیلی پیدا نہیں کی کہ وہ ترقی کرکے متمدن اور کثیر الافراد قومیں بن گئے۔ بلکہ ان قوموں کے بے شمار لوگوں کو ایسا عیش وآرام بہم پہنچا دیا ہے جو اُن کے قلیل التعداد ننگے پھرنے والے آباؤ اجداد کے وہم وگمان میں بھی کبھی نہ آیا تھا اور نہ وہ اُن کا یقین کرسکتے تھے تاہم ہماری اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیمی درسگاہوں میں اب کہیں اس قسم کے علم کی وقعت کو ایک طرح کی بے دلی کے ساتھ تسلیم کرنے لگے ہیں۔ مظاہر قدرت کے غیر متبدل لوازم وملزومات اور نتایج سے آہستہ آہستہ واقفیت حاصل کرنے اور غیر متغیر قوانین کے قایم کرنے کی بدولت ہم کو نہایت ہی سخت توہمات سے نجات ملی ہے اگر سائنس نہ ہوتا تو ہم اب تک چیزوں کی پرستش کرتے رہتے یا سینکڑوں بیلوں کی قربانیوں سے شیطانی دیوتاؤں کو خوش کیا کرتے۔ سائنس جس نے اشیاء کی نسبت نہایت ہی ذلیل خیالات کو دور کرکے مخلوقات کی عظمت وجلالت ہمارے دلوں میں بٹھا دی ہے ہماری الٰہیات کی کتابوں میں اس سائنس کے برخلاف لکھا جاتا ہے اور ہمارے خطیب برسر منبر اُس سے ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔

**ہم ایک ایشیائی کہانی کا ترجمہ بیان کرتے ہیں۔**

ایک ایشیائی

"علموں کے خاندان میں سائنس ایک مزدورنی ہے۔ جو محنت مشقت کی

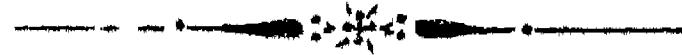
(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۲) بجز اس کے ممکن نہیں ہے کہ سائنس کی تعلیم کی طرف لوگوں کو توجہ دلائی جاوے اور ہر قسم کے کارخانے ملک میں کھولے جائیں تاکہ کروڑوں مفلس اور فاقہ مست روزی کے سر لگ جائیں۔ اب وقت آگیا ہے کہ علی گڈھ کالج سائنس اور صنعت وحرفت کی تعلیم کو بھی اپنے اہم ترین مقاصد میں داخل کرے۔ اگر اس کی طرف سے غفلت کی گئی تو آیندہ چل کر اُس کا تدارک سخت دشوار ہو جائیگا ٥

| کھیتوں کو دے لو پانی اب بہہ رہی ہے گنگا | کچھ کرلو نوجوانو اٹھتی جوانیاں ہیں |  |
|---|---|---|

کام کرتی ہے۔ اُس کی خوبیاں تاریکی میں پڑی ہوئی۔ اور لوگوں کی آنکھوں سے چھپی ہوئی ہیں۔ اُس کے کمالات کو کوئی تسلیم نہیں کرتا۔ سارے کام دہندے اُس کو سونپ دیے گئے ہیں۔ اُسی کی عقل۔ سلیقہ اور سرگرمی کی بدولت تمام آرام اور خوشیاں حاصل ہوئی ہیں۔ حالاں کہ وہ لگاتار سب کی خدمت کرتی ہے۔ مگر اُس کو گم نامی کی حالت میں ڈال رکھا ہے۔ تاکہ اُس کی مغرور بہنیں لوگوں کی آنکھوں میں اپنے پرانے دھرانے کپڑوں کی بھڑک دکھائیں "

حکایت جس میں تمثیل و استعارہ کے پیرایہ میں سائنس کی عظمت اور لوگوں کی اُس سے غفلت کا حال بیان کیا گیا ہے

مگر یہ تمثیل اور بھی زیادہ صادق آتی ہے کیوں کہ اب ہم اُس نتیجہ تک پہنچتے جاتے ہیں جب کہ درجے بدل جائیں گے اور یہ مغرور بہنیں دریائے فراموشی میں ڈوب جائیں گی جس کی وہ مستحق ہیں۔ مگر سائنس کو قدر و قیمت اور حسن دونوں میں سب سے اعلیٰ درجہ دیا جائیگا اور اُس کی حکومت سب سے بالا ہوگی۔



# باب دوم

## تعلیم عقلی

مدارج تعلیم اور معاشرت کی مختلف حالتوں کا باہمی تعلق

نظامِ تعلیم کے مختلف مدارج اور معاشرت کی مختلف حالتوں کے درمیان، جن کے ساتھ ساتھ وہ مدارج موجود رہے ہیں، باہمی تعلق ضرور رہوتا ہے۔ ہر ایک زمانہ کے مُروجات اور قوانین کی مشترکِ اصلی قومی طبیعت ہوتی ہے گو اُن کے خاص عمل کچھ ہی ہوں، اس لیے اُن میں خاندانی مشابہت کا پایا جانا ضروری ہے۔ جس زمانہ میں لوگوں نے اپنے معتقدات اور ان کے مطالب کو ایسے معتبر شخص سے حاصل کیا تھا جس کو معصوم سمجھا جاتا تھا اور جس نے معتقدات کی تشریح کرنی مناسب نہیں سمجھی تھی، اُس زمانہ میں یہ بات قدرتی تھی کہ بچّوں کی تعلیم بھی محض تحکمانہ اصول پر ہو۔ جس زمانہ میں مذہب کا اُصول یہ تھا کہ "ایمان لاؤ اور سوال نہ کرو" اُس زمانہ میں مدرسہ کی تعلیم کے لئے بھی یہی اصول مناسب تھا۔ برعکس اس کے آج کل جب کہ فرقۂ پرانسٹنٹ[ل] (معترضین) نے بالغوں کو مذہبی معاملات میں اپنی ذاتی رائے قایم کرنے کا حق دیدیا ہے اور عقل سے کام لینے کا دستور جاری کردیا ہے بچّوں کی تعلیم میں بھی اُسی مناسبت سے ایک تغیر پیدا

[ل] ۱۵۱۷ء میں ملک جرمنی کے ایک پادری مسمّی لیوتھر نے مذہب عیسوی کی خرابیوں کے دُور کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ جن عیسائیوں نے اُس کی اصلاح کو قبول کیا اُن کا ایک جُداگانہ فرقہ قایم ہوگیا ہے اس فرقہ کو پراٹسٹنٹ (معترضین) کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ مترجم

ہوگیا ہی اور اُن ہی کی سمجھ کے مطابق توضیح و تشریح کی کارروائی شروع ہوگئی ہی جس زمانہ میں بادشاہ بالکل مطلق العنان ہوتا تھا اُس کے احکام سخت ہوتے تھے، ہیبت اور دبدبہ کے زور سے حکومت کی جاتی تھی، خفیف جرموں پر موت کی سزا دی جاتی تھی، سرکشوں سے انتقام لینے میں بے رحمی ظاہر کی جاتی تھی، اُس زمانہ کا لازمی نتیجہ یہی تھا کہ اصول حکومت کی طرح مدرسہ کی تادیب بھی سخت ہوتی۔ یہ وہ تادیب تھی جس میں بے شمار احکام صادر ہوتے تھے اور ہر حکم کی خلاف ورزی پر تشدّد کا سلوک کیا جاتا تھا۔ یہ وہ تادیب تھی جس کی غیر محدود خود مختاری کو قمچی اور بید اور اندھیری کوٹھری کی قید کے ذریعہ سے قایم رکھا جاتا تھا۔ برخلاف اس کے پولٹیکل آزادی کی ترقی، شخصی عمل کو روکنے والے قوانین کی منسوخی۔ اور ضابطہ فوجداری کی اصلاح کے ساتھ ساتھ تعلیم میں بھی جبر و تعدی کی کمی ہوگئی ہی۔ شاگردوں کی روک ٹوک بہت کم ہوگئی ہے۔ اُن کو قابو میں رکھنے کے لئے سزا کے سوا اور وسائل استعمال کئے جاتے ہیں۔ اُس رُہبانیت کے زمانہ میں جب کہ لوگ سخت ترین ریاضت کے اصول پر عمل کرکے یہ سمجھتے تھے کہ لذّات اور حظِّ نفس سے جس قدر پرہیز کریں گے اسی قدر زیادہ نیک بن جائیں گے۔ اُس زمانہ میں لامحالہ یہی خیال ہونا چاہیئے تھا کہ سب سے بہتر تعلیم وہی ہی جو بچّوں کی خواہشوں کو سب سے زیادہ روک دے۔ اور اُن کی تمام قدرتی چستی و چالاکی کو یہ کہکر فنا کردے کہ "تم کو ایسا نہیں کرنا چاہیئے"۔ برعکس اس کے اس زمانہ میں جب کہ خوشی کو زندگی کا ایک واجبی مقصد سمجھنے لگے ہیں۔ جب کہ محنت کے گھنٹے کم ہوتے جاتے ہیں۔ اور عام پسند تفریح طبع کے سامان مہیا ہوتے جاتے ہیں۔ والدین اور معلّم یہ بات سمجھنے لگے ہیں کہ نہایت ہی طفلانہ خواہشوں کا پورا کرنا بھی حق بجانب ہی اور یہ کہ طفلانہ کھیل کود کی طرف بچّوں کو ضرور شوق دلانا چاہیئے۔ اور یہ بھی کہ بچے

کے نمو پذیر نفس کے رُجحانات بالکل شیطانی ہی نہیں ہیں جیسا کہ پہلے خیال کیا جاتا تھا۔ جس زمانے میں سب لوگوں کو اس امر کا یقین تھا کہ تجارت کو سرکاری امداد اور سرکاری قیود کے ذریعہ سے قایم کرنا ضروری ہی، دست کاروں کو اپنے مصالح مال کی خوبی اور قیمت کو مقرر کرنے کی ضرورت ہی اور یہ کہ روپیہ کی قیمت قانون کے ذریعہ سے معین کی جا سکتی ہے" یہ وہی زمانہ تھا کہ لوگوں کے دلوں میں خواہ مخواہ اس قسم کے خیالات سمائے ہوئے تھے کہ "بچّے کی طبیعت کو فرمائش کر کے جیسا چاہیں بنوا سکتے ہیں۔ مُعلّم ہی اُس کو قوائے عقلیہ عطا کرتا ہے۔ اُس کا نفس ایک ظرف ہی جس میں علم رکھا جاتا ہے اور وہیں اُستاد کے نمونہ کے موافق تیار ہو جاتا ہے"۔ مگر اس تجارتی آزادی کے زمانہ میں جب کہ ہم کو یہ بات معلوم ہوتی جاتی ہی کہ ہر چیز میں اپنا انتظام آپ رکھنے کی قوت بہت زیادہ موجود ہے۔ بہ نسبت اس کے کہ لوگ خیال کیا کرتے تھے۔ یہ کہ محنت۔ تجارت زراعت اور جہاز رانی۔ انتظام کے ساتھ جس طرح چل سکتی ہیں بغیر انتظام کے زیادہ خوبی کے ساتھ چل سکتی ہیں اور یہ کہ پولیٹکل حکومتوں کے کارگر ہونے کے لئے ضروری ہی کہ وہ اپنی اندرونی قوت سے نشو ونما حاصل کریں نہ کہ کسی خارجی قوت سے تو ہم کو اس امر کا علم بھی حاصل ہوتا جاتا ہی کہ روحانی ارتقا کا ایک ایسا قدرتی عمل موجود ہے کہ اگر اس میں مداخلت کی جائے تو ضرور نقصان ہوگا اور یہ کہ ہم اس بات کے مجاز نہیں ہیں کہ نشو ونما پانے والے نفس پر اپنی مصنوعی تدبیروں کو زبردستی عمل میں لائیں۔ بلکہ علم سائی کالوجی بھی رسد اور مانگ کا ایک قانون ہمارے سامنے ظاہر کرتا ہی۔ جس کی پابندی (اگر ہم چاہتے ہیں کہ کچھ نقصان نہ ہو) ہم کو ضرور کرنی چاہیئے۔ پس قدیم تعلیمی دستور العمل اپنے

بعید الفہم اُصول ہیں۔ اپنی سخت تربیت ہیں۔ اپنی بے حد روک ٹوک ہیں۔ اپنی نفس کشی ہیں جس کا اُس کو دعویٰ ہے۔ اور لوگوں کی تدبیروں پر اپنا اعتقاد رکھتے ہیں اپنے زمانہ کے طریق معاشرت سے مشابہت رکھتا تھا۔ علیٰ ہذالقیاس۔ برعکس ان خصوصیتوں کے تربیت کے نئے اُصول ہمارے زمانہ کے زیادہ آزادانہ مذہبی و ملکی قوانین کے مطابق ہیں۔

مگر ابھی اور مشابہتیں باقی ہیں جن پر ہم نے اب تک توجہ نہیں کی۔ یعنی وہ مشابہت جو اُن عملوں کے درمیان پائی جاتی ہے جن سے یہ جداگانہ تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں اور نیز وہ مشابہت جو مختلف الجنس رائے کی متعدد حالتوں کے درمیان پائی جاتی ہے جو حالتیں اُن عملوں سے پیدا ہوئی ہیں۔ چند صدیوں پہلے سب لوگوں کے مذہبی ملکی اور تعلیمی عقاید یکساں تھے۔ سب رومن کیتھولک تھے۔ سب شخصی سلطنت کے حامی تھے۔ سب ارسطو[1] کے پیرو تھے۔ کسی شخص کو مدرسۂ صرف و نحو کے اُس دستورالعمل پر اعتراض کرنے کا خیال نہ آتا تھا جس کے موافق سب نے تعلیم و تربیت حاصل کی تھی۔ اب اُن ہی لوگوں نے ہر ایک حالت میں اس یک رنگی کے بجائے اُس اختلاف کو رکھا ہے جو ہمیشہ بڑھتا ہی رہتا ہے۔ شخصیت کی حمایت کا وہ میلان جو فرقہ پروٹسٹنٹ کی ایک بڑی جماعت پیدا کرنے میں ممد و معاون ہوا۔ اور بعد ازاں اس وقت سے لے کر اب تک مذہبی فرقوں کی روز افزوں تعداد پیدا کرتا رہا ہے۔ وہ میلان جس نے پولیٹیکل فریق پیدا کر دیئے ہیں اور دو ابتدائی[2] فریقوں میں سے

کیا وجہ ہے کہ آج کل تعلیم کے بہت سے جدید طریقے پیدا ہو گئے ہیں۔

[1] ارسطو زمانہ قدیم میں یونان کا مشہور حکیم گزرا ہے۔ ۳۸۴ قبل مسیح میں پیدا ہوا تھا اور ۳۲۲ قبل مسیح میں وفات پائی۔ مترجم

[2] ابتدائی دو فرقوں سے مراد لبرل اور کنزرویٹو ہیں۔ لبرل وہ فریق ہے جو ملکی یا مذہبی معاملات

آج کل بے شمار فریق پیدا کر دیئے ہیں جن کی تعداد میں ہر سال اضافہ ہوتا رہتا ہے
وہ میلان جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بیکن نے مدارس کے برخلاف بغاوت اختیار
کی۔ اور جس کی وجہ سے اس ملک اور بیرونی ممالک میں چند جدید طریق تعلیم پیدا
ہوگئے ہیں یہی وہ میلان ہے جس نے تعلیم میں بھی فریق اور نئے طریقے
پیدا کر دیئے ہیں۔ چوں کہ یہ عمل ایک ہی اندرونی تبدیلی کے بیرونی نتیجے ہیں اس لئے
وہ قریب قریب ایک ساتھ ہی پیدا ہوئے ہیں۔ اقتدار کا زوال۔ خواہ پوپ[1]
کا اقتدار ہو۔ خواہ حکما کا۔ خواہ بادشاہ کا۔ خواہ اتالیق کا۔ فی الحقیقت ایک ہی
کرشمۂ قدرت ہے۔ اس کرشمہ کی ہر ایک صورت میں ایک میلان آزادانہ عمل کی طرف
نظر آتا ہے۔ اور یہ میلانِ آزادی خود اُس انقلاب کے وقوع پذیر ہونے میں
اسی طرح دیکھا جاتا ہے جس طرح کہ خیال وعمل کی نئی صورتوں میں جو اُس انقلاب سے
پیدا ہوتی ہیں۔

تربیتِ اطفال کے طریقوں کی اس زیادتی پر بہت سے لوگ افسوس کریں گے
مگر جو شخص آزادانہ نظر سے غور کرے گا اُس کو معلوم ہو جائیگا کہ یہ کثیر التعداد طریقے
ایک آخری معقول طریقہ کے قرار دینے کا ذریعہ ہیں۔ علم الٰہیات میں اختلاف رائے
کی بابت کچھ ہی خیال کیا جائے۔ مگر یہ بات صاف ظاہر ہے کہ تعلیم کے معاملات میں
اختلاف رائے کا یہی نتیجہ ہے کہ تقسیم محنت کی وجہ سے تحقیقات میں سہولت پیدا

مختلف ط
تعلیم کا بہ
درحقیقت
ہے اور اسی
رائے کی بد
ایک معقو
تعلیم نکل

بقیہ نوٹ صفحہ (۱۲۸) میں آزادانہ رائے رکھتا ہے اور موجودہ پابندیوں کو دُور کرنا چاہتا ہے
کنسر ویٹو اُس فریق کو کہتے ہیں جو قدیم آئین اور رسم ورواج کو بحال رکھنا چاہتا ہے۔ مترجم

[1] عیسائیوں کے فرقہ رومن کیتھولک کے سب سے بڑے پادری کو پوپ کہتے ہیں جو کہ اٹلی
کے دارالسلطنت شہر روما میں رہتا ہے۔ رومن کیتھولک فرقہ کے لوگ اس کو محفوظ عن الخطاء اور نائب مسیح

(باقی صفحہ ۱۳۰ پر)

ہوتی ہی۔ اگر تعلیم کا صحیح طریقہ ہمارے پاس موجود ہوتا تو البتہ اُس سے انحراف کرنا مضر ہوتا مگر چوں کہ صحیح طریقہ ابھی دریافت کرنا ہے اس لئے بے شمار جُداگانہ تحقیقات کرنے والوں کی کوششیں جو اپنی تحقیقات کو مختلف پہلوؤں میں جاری رکھتے ہیں صحیح طریقہ کے دریافت کرنے کے لئے بہ نسبت کسی دوسرے ذریعہ کے جو تجویز کیا جا سکتا ہی بہتر ذریعہ ہے۔ چوں کہ ہر شخص کے دل میں کوئی نہ کوئی نیا خیال پیدا ہوتا ہے جس کی تھوڑی بہت بنیاد واقعات پر ہوتی ہی، چوں کہ ہر شخص اپنی تجویز کی تائید میں سرگرم ہوتا ہے اور اُس کی صحت کو جانچنے کے لئے اُس کے پاس بہت سے موقع ہوتے ہیں اور وہ اپنی کامیابی کو ظاہر کرنے کی کوششوں میں نہیں تھکتا۔ چوں کہ ہر شخص باقی طریقوں پر بے دردی کے ساتھ نکتہ چینی کرتا ہی اس لئے اجتماع قوت کے ذریعہ سے یہ نتیجہ ضرور پیدا ہو کر رہیگا کہ یہ سب طریقے رفتہ رفتہ ٹھیک رستہ کے قریب پہنچ جائیں گے۔ باقاعدہ طرز تعلیم کا جس قدر حصہ کوئی شخص دریافت کرتا ہی اور بار بار اُس کے نتیجوں کو ظاہر کرتا ہی اُس حصہ کو اختیار کرنے کے لئے لوگ ضرور مجبور ہو جائیں گے۔ اور جس قدر غلط عمل اُس طریقہ کے ساتھ اُس نے شامل کر دیئے ہیں وہ متواتر تجربہ اور ناکامیابی کی وجہ سے ضرور رُد ہو جائیں گے، پس اس طرح حقایق اصلیہ کے اجتماع اور غلطیوں کے اخراج سے آخر کار ایک صحیح اور کامل اصول کا مجموعہ ضرور تیار ہو جائیگا۔ انسانی رائے تین صورتیں اختیار کرتی ہی۔ یعنی جہلا کا اتفاق محققین کا اختلاف۔ اور عقلا کا اتفاق ظاہر ہی کہ ان میں سے دوسری صورت تیسری صورت کی بنیاد ہے۔ یہ صورتیں نہ صرف

---

بقیہ نوٹ صفحہ (۱۲۹) سمجھتے ہیں۔ اور اُس کے حکم کو حضرت عیسیٰؑ کا حکم سمجھتے ہیں جب سے فرقہ پروٹسٹنٹ نکلا ہے اس وقت سے پوپ کے اقتدار میں بہت کچھ فرق آگیا ہی۔ اور عیسائیوں کا ایک معتدبہ گروہ پوپ کی حکومت سے آزاد ہو گیا ہی۔ مترجم

باعتبار زمانہ (ایک دوسرے سے) متاخر ہیں۔ بلکہ سببیت کے لحاظ سے بھی متاخر ہیں۔ پس
طریق تعلیم کے موجودہ تناقص کو دیکھکر ہم کیسے ہی بے قرار کیوں نہ ہو جائیں اور اُن خرابیوں
پر جو اُن کے ساتھ لگی ہوئی ہیں ہم کتنا ہی افسوس کیوں نہ کریں۔ تاہم یہ بات ضرور تسلیم
کرنی چاہیئے کہ یہ انقلاب کا زمانہ ہے جس میں سے گزرنا ضروری ہے اور جس کے آخری
نتائج عمدہ برآمد ہوں گے۔

تعلیم کے قدیم طریقوں کو ترک کرنے ا[ور] جدید طریقوں کو اختیار کرنے کے لیے پچاس سال سے کشمک[ش] ہو رہی ہے

اس ضمن میں کیا یہ بات مفید نہ ہوگی کہ ہم اپنی ترقی کا محاسبہ کریں؟ پچاس سال
کے مباحثہ۔ تجربہ اور نتائج کے مقابلہ کے بعد کیا ہم کو منزل مقصود کی طرف۔ جس کو پہلے ہی
طے کرنا چاہیئے تھا۔ چند قدم بڑھنے کی توقع نہیں رکھنی چاہیئے؟ اس عرصہ میں بعض پرانے
طریقے ضرور متروک ہو گئے ہوں گے۔ بعض نئے طریقے ضرور قایم ہوئے ہوں گے اور بہت سے
دوسرے طریقوں کو عام طور پر ترک اور اختیار کرنے کے لئے ضرور کشش و کوشش ہو رہی ہوگی
ظن غالب ہے کہ ان مختلف تغیرات میں بھی۔ جب کہ اُن کو پہلو بہ پہلو رکھا جائے۔ اسی قسم کی
خصوصیتیں ہم کو نظر آئیں۔ یعنی اُن میں ایک عام میلان پایا جائے اور اُس کا نتیجہ یہ ہو کہ
اُس رُخ کا سُراغ مل جائے جدھر تجربہ ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ اور ایسے اشارے حاصل
ہو جائیں جن سے معلوم ہو سکے کہ اور زیادہ ترقیاں کیوں کر حاصل ہو سکتی ہیں۔ پس ہم
اس مضمون پر زیادہ غور اور تعمق کی غرض سے زمانہ ماضی و حال کی تعلیم کے بڑے
بڑے اختلافات پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

ایک غلطی سے نجات پاکر لوگ عموماً دوسری متضاد غلطی میں مبتلا ہو[تے] ہیں جسمانی

یہ عام قاعدہ ہے کہ ہر ایک غلطی کے انسداد کے بعد دوسری متضاد غلطی کو
عارضی عروج حاصل ہو جاتا ہے۔ اور ایسا ہی ہوا بھی کہ جس زمانہ میں صرف جسمانی نشو و نما
لوگوں کا مقصود تھا اُس کے بعد وہ زمانہ آیا جب کہ محض عقلی تربیت کی طرف لوگوں کا
خیال تھا۔ جب کہ دو تین سال کی عمر میں بچوں کے سامنے کتابیں رکھدی جاتی تھیں اور

یہ سمجھتے تھے کہ فقط علم کا حاصل کرنا ہی ایک شے ضروری ہی۔ اس کے سوا عموماً ایسا ہوا کرتا ہی کہ ان مزاحمتوں میں سے کسی مزاحمت کے بعد آیندہ ترقی اس طرح حاصل ہوتی ہے کہ متضاد غلطیوں کو مساوی درجہ پر رکھا جائے اور سمجھ لیا جائے کہ وہ ایک وسط حقیقی کے اطراف ہیں۔ (جو افراط و تفریط سے خالی نہیں ہیں) اسی طرح اب ہم کو اس امر کا یقین ہوتا جاتا ہے کہ جسم اور نفس دونوں کی غور و پرداخت کرنی چاہیئے اور دونوں کے مجموعہ کا نشو و نما ہونا چاہیئے۔ جبری طریقہ کو بہت سے لوگوں نے ترک کر دیا ہی اور کسی قوت کو قبل از وقت ترقی دینا پسند نہیں کیا جاتا، لوگ سمجھنے لگے ہیں کہ زندگی میں کامیابی کے لئے پہلی شرط ہی اچھا حیوان بننا، اچھے سے اچھا دماغ بے کار ہی اگر اُس سے کام لینے کے لئے کافی قوت حیات موجود نہ ہو اور اسی وجہ سے جسمانی قوت کے سرچشمہ کو قربان کر کے دماغی قوت کا حاصل کرنا آج کل حماقت سمجھا جاتا ہی۔ یہ وہ حماقت ہی جس کی مثالیں اُن نوخیز بچّوں کی آخری ناکامیابی سے ہمیشہ ملتی رہتی ہیں جو بچپن میں غیر معمولی طور پر ذکی اور طبّاع ہوتے ہیں۔ پس ہم اس مقولہ کی حکمت کو معلوم کرتے جاتے ہیں کہ تعلیم کا ایک بھید یہ ہی کہ "وقت کو عقلمندی سے کیوں کر صرف کرنا چاہیئے"۔

عقلی تربیت کی مثال سے اس عام قاعدہ کی توضیح

کتابوں کو رٹ لینے کا عام رواج جو کسی زمانہ میں تھا روز بروز ساقط الاعتبار ہوتا جاتا ہی۔ زمانہ حال کے تمام معتبر اساتذہ حروف تہجی کی تعلیم کے قدیم عملی طریقہ کو قابل الزام ٹھیراتے ہیں۔ آج کل پہاڑے اکثر تجربہ کی رو سے سکھائے جاتے ہیں، زبانوں کی تحصیل میں مدارس صرف و نحو کے طریقہ کی بجائے ایسے طریقے تجویز کئے گئے ہیں جو اُس قدرتی عمل پر مبنی ہیں جس کو بچہ اپنی مادری زبان کے سیکھنے میں اختیار کرتا ہی۔ "مدرسۂ تعلیم المعلمین واقع مقام بیٹرسی[1]"، کی رپوٹوں میں تعلیم کے اُن طریقوں کے ساتھ جو وہاں رائج ہیں یہ بیان کیا گیا ہی کہ "تمام ابتدائی نصاب کی تعلیم زیادہ تر زبانی ہوتی ہی اور اُس کی توضیح و تشریح

طوطی کی طرح یاد کر لینے کا طریقہ اب متروک ہوتا جاتا ہی۔ اس طریقہ کے نقصانات

[1] بیٹرسی۔ نواح لندن میں سے ایک مقام ہے۔ اور دریائے ٹیمز پر واقع ہے۔ مترجم

کے لئے حتیٰ الامکان موجودات قدرت کی طرف رجوع کی جاتی ہے" اور سب صورتوں میں ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ رٹ لینے کا طریقہ (اپنے زمانہ کے دوسرے طریقوں کی طرح) صورتوں اور علامتوں کو بہ نسبت اُن چیزوں کے جن کو وہ صورتیں اور علامتیں تعبیر کرتی ہیں زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ لفظوں کا صحت کے ساتھ دُہرا لینا سب کچھ تھا۔ اُن کے معنوں کا سمجھنا ہیچ تھا۔ اور اس طرح سے رُوحِ معنی کو حرفوں پر قربان کر دیا جاتا تھا۔ آخر کار یہ بات معلوم ہو گئی ہے کہ مثل دوسری صورتوں کے اس صورت میں یہ نتیجہ اتفاقی نہیں بلکہ ضروری ہے کہ جس قدر علامتوں پر توجہ کی جاتی ہے اسی قدر اصل چیزوں کی طرف سے جن کو وہ علامتیں ظاہر کرتی ہیں بے توجہی ہوتی ہے یا جیسا کہ مانٹینٹن[1] نے ایک مدت پہلے کہا تھا کہ "حفظ یاد کر لینا (حقیقی) علم نہیں ہے"

قواعد کے ذر... سے تعلیم د... کے بجائے ا... اصول کے ذ... سے تعلیم دی... ہر پہلے طر... کے نقصا... اور دوسر... طریقہ کے فو...

طوطے کی طرح تعلیم دینے کے ساتھ ہی قواعد کے ذریعہ سے تعلیم دینے کا طریقہ بھی جو قریب قریب اُسی قسم کا ہے زائل ہو جاتا ہے۔ نیا طریقہ یہ ہے کہ اوّل خاص مثالیں اور پھر عام نتائج بتائے جاتے ہیں۔ اگرچہ یہ طریقہ جیسا کہ مدرسۂ بیٹرسی کی رپورٹوں میں درج ہے اُس طریقہ کے برعکس ہے جس کی پیروی عموماً کی جاتی ہے اور جس میں شاگردوں کو پہلے ہی قاعدہ بتا دیا جاتا ہے، تاہم تجربہ سے ثابت ہو گیا ہے کہ صحیح طریقہ یہی ہے قاعدہ سکھانے پر آج کل یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ اُس سے محض عملی علم حاصل ہوتا ہے یعنی صرف ظاہری سمجھ پیدا ہوتی ہے جس کی حقیقت کچھ نہیں ہوتی تحقیقات کا خالص نتیجہ بتا دینا اور اُس تحقیقات کو نہ بتانا جو اُس نتیجہ کی طرف رہنمائی کرتی ہے یہ عمل قوائے عقلیہ کو ضعیف کرنے والا اور غیر موثر بھی ثابت ہوا ہے۔ حقایق عامہ سے باقاعدہ اور مستقل فائدہ اُٹھانے کے لئے یہ امر ضروری ہے کہ اُن کو کمائی کر کے پیدا کیا جائے۔ یہ مقولہ کہ آسانی کی کمائی آسانی سے گنوائی علم پر بھی ایسا ہی صادق آتا ہے جیسا کہ

[1] مانٹینٹن فرانس کا ایک فلسفی اور مضمون نگار تھا ۱۵۳۳ء میں پیدا ہوا اور ۱۵۹۲ء میں فوت ہوا۔ مترجم

دولت پر۔ چوں کہ قواعد ذہن میں منتشر پڑے رہتے ہیں یعنی مواد موجود فی الذہن سے اُن قواعد کا تعلق اس اعتبار سے نہیں ہوتا کہ وہ اُس مواد کا ماحصل ہیں۔ اسی وجہ سے وہ بار بار ذہن سے نکل جاتے ہیں۔ مگر وہ اصول جو اُن قواعد سے جدا جدا ظاہر ہوتے ہیں اگر ایک مرتبہ دل نشین ہو جائیں تو اُن پر مستقل قبضہ ہو جاتا ہے۔ قواعد پڑھا ہوا طالب علم جب اپنے قاعدوں سے آگے بڑھتا ہے گھبرا جاتا ہے مگر جس طالب علم کو اصول کی تعلیم دی جاتی ہے وہ جس قدر مستعدی سے پُرانی بات کو حل کرتا ہے اُتنی ہی مستعدی سے نئی بات کو حل کر لیتا ہے۔ قواعد کے ذریعہ سے تعلیم پائے ہوئے اور اصول کے ذریعہ تعلیم پائے ہوئے نفس میں ایسا فرق ہے جیسا مصالح کے ایک منتشر ڈھیر میں اور اُسی مصالح میں جب کہ اُس کو باضابطہ ترتیب دے کر ایک مکمل مجموعہ کی صورت میں ظاہر کیا جائے اور اُس کے حصول کو باہم وابستہ کر دیا جائے۔ ان دونوں طریقوں میں سے پچھلے طریقہ میں نہ صرف یہ فائدہ ہے کہ اُس کے اجزائے اصلیہ زیادہ اچھی طرح ذہن میں محفوظ رہتے ہیں بلکہ بہت بڑا فائدہ یہ ہے کہ یہ طریقہ تحقیقات کے لئے آزادانہ غور و خوض کے لئے اور دریافت کرنے کے لئے ایک کارگر وسیلہ ہوتا ہے اور ان مقاصد کے لئے پہلا طریقہ بیکار ہے۔ یہ خیال نہیں کرنا چاہیئے کہ محض تمثیل ہی تمثیل ہے۔ نہیں بلکہ یہ بات حرف بہ حرف صحیح ہے۔ واقعات کو جمع کر کے اُن سے اصول کلیہ کا استنباط کرنا علم کی باضابطہ ترتیب ہے خواہ مظہر صوری کی حیثیت سے اُس پر غور کیا جائے خواہ مظہر معنوی کی حیثیت سے۔ عقلی رسائی کا اندازہ اُسی حد سے کیا جا سکتا ہے جس حد تک کہ اس باضابطہ ترتیب کو عمل میں لایا جائے۔

قواعد کی جگہ اصول کو رواج دینے سے اور اُس عمل سے جو ضروری طور پر اُس تبدیلی کا ہم پلہ ہے یعنی مجردات کی تعلیم کو اُس وقت تک چھوڑ دینا جب تک کہ نفس کو اُن چیزوں سے واقفیت نہ ہو جائے جن سے وہ مجردات حاصل ہوتے ہیں یہ نتیجہ

تقدیم کے صرف تعلیم

بڑی عمر میں شروع کرائی جاتی ہے

پیدا ہوا ہے کہ جن مضامین کی تعلیم کسی زمانہ میں بچپن ہی میں شروع کرائی جاتی تھی اب اُن کو زمانۂ مابعد تک ملتوی رکھا جاتا ہے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ بچوں کو قواعد (صرف ونحو) کی تعلیم دینے کا سخت احمقانہ دستور متروک ہو گیا ہے۔ مسٹر مارسل[1] کہتے ہیں "یہ بات بلا تامل کہی جا سکتی ہے کہ گریمر تعلیم کی پہلی سیڑھی نہیں ہے بلکہ تکمیل تعلیم کا آلہ ہے"

مسٹر وائز کا استدلال نسبت ذیل ہے:-

مسٹر وائز کی دلیل اس کی متعلق کہ سائنس استقراء کا نتیجہ ہے

صرف ونحو قوانین اور قواعد کا مجموعہ ہے۔ قواعد مشق سے جمع ہوتے ہیں۔ قواعد استقراء کے نتائج ہیں اور عرصہ دراز کے تجربہ اور واقعات کے مقابلہ کے ذریعہ اُس استقراء تک ہماری رسائی ہوتی ہے۔ بالآخر یہ استقراء زبان کا سائنس اور فلسفہ ہے۔ قدرت کے عمل کی پیروی میں ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ افراد یا اقوام پہلے ہی سائنس تک پہنچ جائیں۔ صرف ونحو یا علم عروض کا خیال تک کسی کو پیدا نہیں ہوتا مگر برسوں پہلے سے لوگ زبان بولتے اور نظم لکھتے ہیں ایسا نہیں ہوا تھا کہ ارسطو کے منطق کو مدوّن کرنے سے پہلے لوگ حجت اور دلیل لانے کے لئے منتظر بیٹھے رہے ہوں۔

المختصر چونکہ صرف ونحو زبان کے بعد بنتی ہے۔ اس لئے اس کو زبان کے بعد سکھایا جائے۔ یہ ایسا نتیجہ ہے کہ جو لوگ قومی یا شخصی ارتقاء کے باہمی تعلق کو تسلیم کرتے ہیں وہ سب کے سب اس نتیجہ کے ناگزیر ہونے کو ضرور سمجھ لیں گے۔

قوائے مشاہدہ کی تربیت اُس کی غرض وغیرہ

اُن پرانے دستوروں کے زوال کے زمانہ میں جو نئے دستور پیدا ہو گئے ہیں اُن میں سے سب سے زیادہ اہم قوائے مشاہدہ کی باقاعدہ تربیت ہے۔ ایک مدّت مدید کی کورانہ تقلید کے بعد آخر کار لوگ سمجھتے جاتے ہیں کہ بچوں کے قوائے مشاہدہ کی قدرتی چستی وچالاکی کچھ معنی رکھتی ہے اور کام کی چیز ہے جس بات کو کسی زمانہ میں لوگ ایک فعل عبث یا لہو ولعب یا

[1] مارسل ملک فرانس کا باشندہ اور السنۂ مشرقیہ کا عالم تھا ۱۷۶۶ء میں پیدا ہوا تھا اور ۱۸۵۴ء میں فوت ہوا۔ مترجم

شرارت جیسی کہ صورت ہو۔ سمجھتے تھے۔ اب اُس کو ایسا علم حاصل کرنے کا وسیلہ تسلیم کرتے ہیں جس پر آیندہ علم کی بنیاد ہو۔ اسی وجہ سے اسباق الاشیار کا طریقہ خوب غور و خوض کر کے نکالا گیا ہو مگر اُس کو اچھی طرح کام میں نہیں لایا جاتا۔ لوگ بیکن کا یہ مقولہ کہ "وہ علم طبعی علموں کی ماں ہو" اب جا کر سمجھنے لگے ہیں اور جانتے ہیں کہ تعلیم میں اس مقولہ کے کچھ معنی ہیں۔ اشیا کے مرئی و محسوس خواص کی صحیح واقفیت کے بغیر ہمارے تصوّرات نادرست ہمارے نتائج مغالطہ خیز۔ اور ہمارے افعال ناکامیاب ضرور ہوں گے "حواس کی تربیت سے اگر غفلت کی جائے تو آیندہ کی تمام تربیت میں ایک قسم کی کاہلی تاریکی اور کوتاہی پیدا ہو جاتی ہے جس کا علاج محال ہو" حقیقت میں اگر ہم اس کو سوچیں تو ہم کو معلوم ہو جائیگا کہ کامل مشاہدہ ہر ایک اعلیٰ کامیابی کا جزو اعظم ہو۔ نہ صرف اہل حرفہ عالمان خواص الاشیار (نیچرلسٹ) اور عالمان سائنس ہی کے لئے مشاہدہ کی ضرورت ہو۔ اور تشخیص امراض کی صحت کے لئے نہ صرف طبیب کا اس پر مدار ہے اور نہ صرف انجینیر کے لئے وہ ایسا ضروری ہو کہ اُس کے لئے چند سال کارخانہ میں کام کرنا لازمی قرار دیا گیا ہے۔ بلکہ ہم سمجھ سکتے ہیں کہ فلسفی بھی دراصل وہی شخص ہے جو اُن چیزوں کے تعلقات کا مشاہدہ کرتا ہو جن کو دوسرے لوگوں نے نظر انداز کر دیا ہو۔ اور شاعر بھی وہی شخص ہے جو کائنات میں ایسی باریک باتوں کو دیکھ لیتا ہو کہ اگر وہ باتیں بتا دی جائیں تو سب اُن کو پہچان لیں مگر پہلے سے کسی کے خیال میں نہیں آتیں۔ اس سے زیادہ کسی بات پر زور دینے کی ضرورت نہیں ہو کہ صاف اور پوری طرح سے اُن باتوں کا دل پر نقش ہو جانا نہایت ہی ضروری ہو عقلمندی کا مضبوط پارچہ بوسیدہ کچے سوت سے نہیں بُنا جا سکتا۔

واقعات کو مجردات کی شکل میں پیش کرنے کا پُرانا طریقہ متروک ہو جاتا ہے اور اُس کی بجائے اُن واقعات کو مادیات کی صورت میں پیش کرنے کا طریقہ اختیار کرتے

ہوتا ہیں
مسائل کی
مجردات کی

جاتے ہیں۔ مبادیات سائنس کا علم آج کل بدیہات کے ذریعہ سے حاصل کیا جاتا ہے
جس طرح کہ بناوٹ۔ ذائقہ اور رنگوں کا علم حاصل کیا جاتا ہے۔ حساب کے ابتدائی
سبقوں میں بال فریم[1] (گولیوں کے چوکھٹے) کا استعمال اس امر کی ایک مثال ہے،
پروفیسر ڈی مارگن[2] کے طریقہ تشریح کتابت اعشاریہ میں بھی اس کی بخوبی توضیح
کی گئی ہے۔ مسٹر مارسل کی یہ رائے صحیح ہے کہ وہ جدولیں حفظ کرا دینے کے قدیم طریقہ
کو ترک کرکے ماپ تول کے پیمانوں کو اصلی گز اور فٹ پونڈ[3] اور اونس۔ گیلن اور کوارٹ
کے ذریعہ سے سکھاتے ہیں۔ اور ان پیمانوں کے تعلقات کی تحقیقات تجربہ کے ذریعہ
سے کراتے ہیں۔ جغرافی نمونوں اور اجسام منتظم کے نمونوں وغیرہ کا استعمال۔ جو
علم جغرافیہ اور علم ہندسہ کی تمہید ہیں۔ یہ بھی اسی قسم کے واقعات ہیں ظاہر ہے کہ ان
طریقوں کی ایک مشترک خصوصیت یہ ہے کہ اُن کی وجہ سے ہر ایک بچہ کا نفس ایسے
مدارج طے کر لیتا ہے جن میں سے بالعموم نوع انسان کے نفس کو گزرنا پڑا ہے۔ عدد شکل
اور تعلق مکانی کے تمام حقائق اوّل اوّل اشیاء کے ذریعہ سے پیدا ہوئے تھے اور
ان حقائق کو بچے کے سامنے مادّیات کی شکل میں پیش کرنا گویا اُس طریقہ پر کہ نوع انسان
نے تعلیم پائی ہے۔ شاید رفتہ رفتہ لوگوں کی سمجھ میں آجائے گا کہ اُن حقیقتوں کو کسی دوسرے
طریقہ سے سیکھنا ممکن نہیں ہے کیوں کہ اگر بطور مجرّدات کے بچے سے بار بار اُن باتوں کا

مشکل میں دی
جاتی تھی زیا
حال میں آن
تعلیم مادیات
کی شکل میں دی
جاتی ہے

---

[1] بال فریم۔ ایک مستطیل شکل کا چوکھٹا ہوتا ہے جس کے عرض میں خطوط متوازی کی طرح دھاگے کے تار لگے ہوئے ہوتے ہیں
ہر ایک تار میں لکڑی کی متعدد گولیاں پروئی جاتی ہیں۔ گولیوں کی تعداد ہر ایک تار میں یکساں ہوتی ہے۔ بال فریم میں
عموماً سولہ تار اور ہر تار میں سولہ سولہ گولیاں ہوتی ہیں۔ اس کے ذریعے سے بچوں کو گنتی حساب کے ابتدائی اصول
اور پہاڑے (۱۶ × ۱۶) تک نہایت آسانی سے سکھائے جا سکتے ہیں۔ مترجم

[2] ڈی مارگن۔ انگلستان کا باشندہ اور علم ریاضی کا عالم تھا۔ ۱۸۰۶ء میں پیدا ہوا۔ اور ۱۸۷۱ء میں فوت ہوا۔ مترجم

[3] پونڈ۔ تقریباً آدھ سیر کا۔ اونس آدھی چھٹانک کا۔ گیلن چار سیر کا اور کوارٹ ایک سیر کا ہوتا ہے۔ مترجم

اعادہ کرایا جائے تو اُس کے نزدیک ان مجرّدات کے کچھ معنی ہی نہیں ہو سکتے تاوقتیکہ اُس کو معلوم نہ ہو جائے کہ وہ مجرّدات صرف اُن چیزوں کے بیانات ہیں جن کو وہ بداہتہً دیکھتا ہے۔

ضرور ہے کہ تحصیل علم بچوں کے لئے فرحت و مسرت کا باعث ہو نہ کہ رنج و کلفت کا

مگر اُن تمام تغیرات میں جو پیش آرہے ہیں سب سے زیادہ نمایاں تغیر اس بات کی روزافزوں خواہش ہی کہ تحصیل علم کو موجب فرحت و مسرّت بنایا جائے نہ کہ باعث رنج و کلفت۔ یہ خواہش کم و بیش اس بات کو صاف صاف سمجھ لینے پر مبنی ہی کہ ہر ایک زمانہ میں وہی عقلی عمل بچّہ کے واسطے مفید ہوتا ہی جس کو وہ پسند کرتا ہے۔ اور برعکس اس کے جو عمل اُس کو ناپسند ہوتا ہی وہ مُضر پڑتا ہے۔ یہ رائے عام طور پر پھیلتی جاتی ہے کہ کسی قسم کی معلومات کی **اشتہا** کا بڑھ جانا اس بات کی دلیل ہے کہ بچّے کا کھُلنے والا دل اُس غذا کو جزو بدن کرنے کے قابل ہو گیا ہی اور نشو و نما کی غرض سے اُس کی ضرورت ہی۔ اور برعکس اس کے ایسی معلومات سے نفرت پیدا ہونی اس بات کی علامت ہے کہ وہ غذا یا تو قبل از وقت دی گئی ہے یا ایسے طریقہ سے دی گئی ہی کہ ہضم نہیں ہو سکتی یہی وجہ ہے کہ ابتدائی تعلیم اور تمام تعلیم کو موجب تفریح اور دلکش بنانے کی کوششیں کی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہی کہ کھیل کود کی قدر و قیمت پر لکچر دیئے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دایہ خانہ کی تُک بندیوں (یعنی لوریوں) اور پریوں کی کہانیوں کی تائید کی جاتی ہی۔ ہم روز بروز اپنی تدبیروں کو زیادہ تر بچّوں کی رائے کے مطابق بناتے جاتے ہیں۔ ہم برابر یہ سوال کرتے رہتے ہیں کہ بچّہ فلاں قسم کی تعلیم کو پسند کرتا ہی یا نہیں؟ اُس کی طرف توجہ کرتا ہی یا نہیں؟ مسٹر مارسل کہتے ہیں کہ "جو بچّوں میں قدرتی خواہش ہوتی ہے کہ وہ طرح طرح کی مختلف چیزوں کو پسند کرتے ہیں اس کی رعایت کرنی چاہیئے اور اُن کے شوقِ تجسّس کی تکمیل کو اُن کی ترقی کے ساتھ شامل کر دینا چاہیئے۔ صاحب موصوف یہ بھی کہتے ہیں کہ "بچہ پر تکان کے آثار ظاہر ہونے سے پہلے ہی سبقوں کو

بند کر دینا چاہیئے؛" اور آیندہ تعلیم بھی اسی طرح ہونی چاہیئے۔ مدرسہ کے گھنٹوں کے بیچ بیچ میں تھوڑا تھوڑا وقفہ دینا۔ مفصلات کی سیر و تفریح۔ دلچسپ لکچر۔ آواز ملا کر گانا۔ ان باتوں میں اور اسی قسم کی بہت سی خصوصیتوں میں یہ تغیر و تبدل صاف نظر آسکتا ہے نفس کشی تعلیم میں سے ایسی گم ہوتی جاتی ہے جیسی معاشرت میں سے اور ملکی قانون کا معمولی معیار۔ یعنی خوشی کو ترقی دینے کا میلان۔ یہی وہ معیار ہے جو زیادہ تر قانون مدرسہ اور قانون دایہ خانہ کے لئے بھی مقرر ہوتا جاتا ہے۔

طریقہ تعلیم روز بروز قانون قدرت کے مطابق ہوتا جاتا ہے

اب غور کرو کہ ان مختلف تغیرات کی مشترک خصوصیت کیا ہے؟ کیا وہ خصوصیت یہی نہیں ہے کہ تعلیم کے طریقوں میں قدرت کے طریقوں سے روز بروز زیادہ مطابقت ہوتی جاتی ہے؟ یہ اس بات سے ثابت ہے کہ بچپن میں جبر کرنا جس کے برخلاف قدرت بغاوت کرتی ہے۔ اب متروک ہوگیا ہے۔ اور ابتدائی عمر کو اعضا اور حواس کی مشق کے واسطے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ یہ اس بات سے بھی ثابت ہے کہ طوطے کی طرح حفظ یاد کر لینے کا طریقہ جاتا رہا ہے اور کھیت کے کاروبار اور کھیل کود کے سبقوں کی طرح جملہ اسباق کی تعلیم زبانی اور تجربہ کے ذریعہ سے دی جاتی ہے۔ یہ اس بات سے ثابت ہے کہ قواعد کے ذریعہ سے تعلیم دینے کا دستور متروک ہوگیا ہے اور اصول کے ذریعہ سے تعلیم دینے کا رواج ہوگیا ہے۔ یعنی نتائج عام کو اُس وقت تک چھوڑ دیا جاتا ہے جب تک کہ وہ خاص امور موجود نہ ہوں جن پر وہ نتائج مبنی ہیں۔ اسباق الاشیاء کے طریقہ سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔ سائنس کے ابتدائی اصول کو مجردات کی بجائے مادیات کے ذریعہ سے تعلیم دینے سے بھی یہ بات ثابت ہے۔ اور ان سب سے بڑھکر یہ بات ہے کہ یہ میلان اُن مختلف کوششوں سے ثابت ہے جو علم کو دلکش صورتوں میں پیش کرنے کی غرض سے کی جاتی ہیں تاکہ تحصیل علم موجب مسرت ہو جائے؛ وجہ یہ ہے کہ تمام مخلوقات میں قدرت کا انتظام یہ ہے کہ ضروری فرایض کے پورا کرنے سے جو حظ حاصل ہوتا ہے وہ اُن کو پورا کرنے کے لئے محرک کا کام دیتا ہے مثلاً

جس زمانہ میں چھوٹا بچہ بطور خود تعلیم حاصل کرتا ہے تو اُس حسی کے کاٹ کھانے اور کھلونوں کو توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دینے سے جو خوشی حاصل ہوتی ہے وہ اُن کاموں کی محرک ہوتی ہے جو مادہ کے خواص کی تعلیم دیتے ہیں۔ اس لئے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مختلف مضامین اور تعلیم کے اُن طریقوں کو، جو شاگرد کے لئے سب سے زیادہ دلچسپ ہیں انتخاب کرنے سے ہم قدرت کے احکام کو پورا کر رہے ہیں اور اپنی کارروائیوں کو قوانین زندگی کے موافق مرتب کر رہے ہیں۔

مضمون کی ترتیب اور تعلیم کا طریقہ عقلی ارتقا کے اصول کے مطابق ہونا چاہئے

پس ہم اُس مسئلہ کی شاہ راہ پر پہنچ گئے ہیں جس کو پستالوزی[1] نے ایک مدت پہلے بیان کیا تھا کہ تعلیم اپنی ترتیب اور نیز اپنے طریقوں کے لحاظ سے عقلی ارتقا کے قدرتی عمل کے مطابق ہونی چاہیئے اور یہ کہ ایک خاص ترتیب ایسی موجود ہے جس کے موافق قوتیں قدرتاً نشو و نما پاتی ہیں اور ایک خاص قسم کا علم ہر ایک قوت کے لئے اُس کے نشو و نما کے زمانہ میں درکار ہے اور یہ کہ اس ترتیب کی تحقیق کرنی اور اس علم کو بہم پہنچانا ہمارا کام ہے۔ جن ترقیوں کا ذکر اوپر اشارةً کیا گیا ہے وہ سب اسی عام اصول کے جزوی استعمال ہیں۔ اس بات کا ایک دھندلا سا خیال آجکل معلموں میں پیدا ہو گیا ہے اور تعلیمی تصانیف میں روز بروز اس بات پر زیادہ زور دیا جاتا ہے مسٹر مارسل کہتے ہیں کہ "قدرت کا طریقہ تمام طریقوں کا اصلی نمونہ ہے"۔ مسٹر وائز لکھتے ہیں کہ "اس کام میں اصل اصول یہی ہے کہ شاگرد کو اس قابل بنا دیا جائے کہ وہ اپنے آپ کو ٹھیک ٹھیک تعلیم دے سکے"۔ سائنس ہم کو نظام اشیاء سے جس قدر زیادہ آگاہ کرتا ہے اُسی قدر زیادہ خلقی کمال بجائے خود اُن میں نظر آتا ہے۔ اعلیٰ درجہ کا علم ہم کو متواتر اس امر کی طرف مائل کرتا ہے کہ زندگی کی عملوں سے کم تعرض کریں جس طرح طبابت میں قدیم "بہادرانہ علاج" کی جگہ نرم علاج کا رواج ہو گیا ہے اور اکثر اوقات باقاعدہ پرہیز کے سوا کوئی علاج ہی نہیں کیا جاتا جس طرح کہ ہم کو معلوم ہو گیا ہے کہ شیر خوار بچوں کے جسموں کو پٹیاں باندھ کر جیسا کہ شمالی امریکہ کے وحشی باشندے

[1] پستالوزی ملک سوئٹزرلینڈ کا باشندہ اور ایک جدید طریقہ تعلیم کا بانی ہوا ہے ۱۷۴۶ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۲۷ء میں فوت ہوا۔ مترجم

کرتے ہیں۔ یا اور کسی طرح سلسلہ نحو میں ڈھالنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جس طرح یہ بات ظاہر ہوتی جاتی ہے کہ جیل خانوں میں قیدیوں کی اصلاح کے لئے مصنوعی تربیت اتنی کارگر نہیں ہوتی جتنی قدرتی تربیت۔ اسی طرح تعلیم میں بھی ہم کو معلوم ہوتا جاتا ہے کہ کامیابی صرف اس طرح حاصل ہو سکتی ہے کہ اپنے بچوں کو اُس قدرتی نشو و نما کے تابع بنایا جائے جس میں سے بلوغ تک پہنچنے سے پہلے سب لوگوں کو گزرنا پڑتا ہے۔

اصول مذکور کی پابندی مدرسوں کے نصاب تعلیم میں کچھ نہ کچھ ضرور ہوتی ہے

بیشک تعلیم کا یہ بنیادی اصول کہ "مضمون اور طریقہ کی ترتیب قویٰ کی ترتیب ارتقا اور طریقہ عمل کے مطابق ہونی چاہیئے" جو ایسا صریح اور صحیح اصول ہے کہ ایک دفعہ بیان کرتے ہی اُس کی صداقت تقریباً بدیہی معلوم ہوتی ہے۔ اُس کو کبھی بالکلیہ نظر انداز نہیں کیا گیا۔ معلموں نے اپنے مدرسوں کے نصاب کو چارو ناچار کسی قدر اس اصول کے مطابق بنایا ہے۔ محض اس وجہ سے کہ تعلیم اسی شرط پر ممکن ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ لڑکوں کو اربعہ متناسبہ کی تعلیم دی گئی ہو جب تک اُنھوں نے جمع نہ سیکھ لی ہو۔ ایسا بھی نہیں ہوا کہ کاپیاں لکھانے سے پہلے اُن کو مشقیں لکھانی شروع کرائی گئی ہوں۔ علم تراشہائے مخروطی سے پہلے ہمیشہ اقلیدس کی تعلیم دی گئی ہے مگر قدیم طریقوں کی غلطی اس امر پر مشتمل ہے کہ جو بات اُن کو مجملاً تسلیم کرنی پڑتی ہے اُس کو مفصلاً تسلیم نہیں کرتے۔ تاہم یہ اصول ہر جگہ صادق آتا ہے۔ اگر اُس وقت سے لے کر جب سے کہ بچہ دو چیزوں کے تعلق مکانی کو سمجھنے قابل ہو جاتا ہے اُس وقت تک جب کہ وہ زمین کا صحیح تصور اس حیثیت سے کر سکے کہ وہ ایک کرہ ہے خشکی اور تری سے مرکب ہے پہاڑوں۔ جنگلوں۔ دریاؤں۔ اور شہروں سے معمور ہے اپنے محور پر گھومتا ہے آفتاب کے گرد بھی گردش کرتا ہے کئی سال کی مدت کا منقضی ہونا ضروری ہے اگر وہ ایک تصور سے دوسرے تصور تک بہ تدریج پہنچتا ہے اگر درمیانی تصورات جن کو وہ حاصل کرتا ہے سلسلہ بہ سلسلہ زیادہ بڑے اور پیچیدہ

ہوتے جاتے ہیں تو کیا یہ بات صاف ظاہر نہیں ہے کہ اسی قسم کا ایک عام سلسلہ ایسا موجود ہے کہ اسی سلسلہ کو بہ تدریج طے کرنا بچّہ کے لئے ضروری ہے اور یہ کہ ہر ایک بڑا تصوّر چھوٹے تصوّرات کے مجموعہ سے بنتا ہے اور اُس سے پہلے اُن تصوّرات کا وجود مان لیا جاتا ہے اور یہ کہ اُن مُرکّب تصوّرات میں سے کسی تصوّر کو بچّہ کے سامنے ایسے وقت میں پیش کرنا جب کہ اُس تصوّر کے اجزائے ذاتی ابھی اُس کے ذہن میں حاضر نہیں ہیں ایک بیہودہ بات ہے اور یہ بیہودگی صرف اسی بیہودگی سے کم ہے کہ سلسلہ کے آخری تصوّر کو ابتدائی تصوّر سے پہلے پیش کر دیا جائے۔ ہر ایک مضمون پر عبور حاصل کرتے وقت بہ تدریج پیچیدہ خیالات کو طے کرنا پڑتا ہے۔ ان خیالات کے مقابل میں جو قوتیں موجود ہیں اُن کی ترقی اس بات پر منحصر ہے کہ وہ خیالات پوری طرح ذہن نشین ہو جائیں اور یہ بات نفس الامر میں اُس وقت تک محال ہی جب تک کہ اُن خیالات کو باقاعدہ ترتیب سے دل میں نہ ڈالا جائے اور جب اس ترتیب کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا تو یہ نتیجہ ہوتا ہی کہ اُن کو بے اعتنائی یا نفرت کے ساتھ حاصل کیا جاتا ہے اور جب تک کہ شاگرد میں اس قدر عقل نہ ہو کہ وہ آخر کار اس نقصان کی تلافی خود کر سکے یہ خیالات مُردہ واقعات کی طرح اُس کے حافظہ میں پڑے رہتے ہیں جن سے بہت کم فائدہ اُٹھا سکتے ہیں یا فائدہ اُٹھا ہی نہیں سکتے۔

ایک اعتراض کا جواب جو اُٹھایا جاتا ہے قانون نشو و نما کی تشریح اور اس امر کا ثبوت کہ نفس کی طلب بھی اُن ہی قوانین کے

مگر یہ سوال ہو سکتا ہے کہ ہم مطلق کسی نصاب تعلیم کے لئے ہم کیوں اپنے آپ کو دقت میں پھنسائیں؟ اگر یہ بات صحیح ہو کہ جسم کی طرح ترقی نفس کی رفتار بھی ایسے اصول کے موافق ہوتی ہی جو پہلے سے مقرر ہو چکے ہیں۔ اگر اُس کا نشو و نما قدرتی طور پر ہوتا ہے، اگر خاص خاص معلومات حاصل کرنے کے لئے نفس کی متواتر خواہشیں اُسی وقت پیدا ہوتی ہیں جب کہ وہ اُس کی غذا کے لئے مطلوب ہوں۔ پس اگر مناسب وقت میں مناسب قسم کی تحریک کا محرک خود بخود موجود ہو جاتا ہے تو ہم کیوں اُس میں کسی طرح کی

موافق نشوونما پاتاہے

دست اندازی کریں ؟ بچّوں کو بالکل قدرت ہی کی تربیت پر کیوں نہ چھوڑا جائے ؟ کیوں مداخلت کو بالکل ترک نہ کیا جائے اور جس طرح بطور خود بچّے علم حاصل کریں کیوں نہ اُسی طرح اُن کو علم حاصل کرد یا جائے ؟ کیوں تمام حالتوں میں یکساں روش اختیار نہ کی جائے" ؟ یہ سوال بے ڈھنگا سا معلوم ہوتا ہے ۔ظاہرا یہ اعتراض اس بات پر دلالت کرتا ہی کہ مسائل مذکورۂ بالا کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ دست اندازی سے بالکل اجتناب کیا جائے مگر ایسا معلوم ہوتا ہی کہ وہ اُن مسائل کو لغو بتا کر اُن کے بطلان کا سامان مہیّا کرتا ہی ۔مگر حقیقت یہ ہے جب اُن مسائل کو ٹھیک ٹھیک سمجھ لیا جائے تو وہ ہم کو کسی ایسے بے بنیاد اصول تک نہیں پہنچاتے ۔جسمانی مشابہتوں پر ایک نظر ڈالنے سے یہ بات صاف ظاہر ہوجائیگی ۔یہ زندگی کا عام قانون ہی کہ جس قدر زیادہ پیچیدہ جسمانی ساخت تیار کرنی مقصود ہوتی ہے اُسی قدر زیادہ مدّت تک خوراک یا حفاظت کے لئے اُس کو ماں باپ کا محتاج رہنا پڑتا ہے ۔جیسن ریشہ دار آبی پودے کا ننھا سا بیج جلدی سے بن جاتا اور خود بخود حرکت کرنے لگتا ہے ۔ مگر ایک درخت کا بیج آہستہ آہستہ نشوونما پاتا ہی جس میں بے شمار لفافے اور غذا کا بڑا ذخیرہ ہوتا ہے تاکہ نمو کے ابتدائی مدارج کو طے کرنے میں بیج کی پرورش ہوسکے ۔ان دونوں قسم کے بیجوں میں جو فرق ہی اُس سے اس امر کی تشریح ہوتی ہی کہ نباتاتی دنیا پر یہ قانون صادق آتا ہی حیوانات میں اس قانون کا سُراغ اُس سلسلۂ تفاوت سے یہ جو نہایت ہی ننھے ننھے کیڑوں سے لے کر جن کے قدرتی طور پر تقسیم کئے ہوئے نصف حصّے جدا ہونے کے بعد بھی بجائے خود ایسے ہی کامل ہوتے ہیں جیسا کہ اصلی کیڑا ہوتا ہے، انسان تک نظر آتا ہے ۔اور انسان کی اولاد کو نہ صرف حمل کی طویل مدّت میں سے گزرنا پڑتا ہے ۔اور اُس کے بعد مدّت تک پستان مادر سے غذا حاصل کرنے کی احتیاج رہتی ہے بلکہ اُس کے بعد بھی ضرور ہے کہ اُس کو مصنوعی طور سے خوراک دی جائے

اور جب وہ اپنے آپ کھانا سیکھ جائے اُس وقت بھی ضرور ہے کہ روٹی۔ کپڑا اور حفاظت کا سامان اس کے لئے مہیا کیا جائے۔ اور اُس مدت تک۔ جو پیدائش کے بعد باختلاف حالات پندرہ سال سے بیس سال تک ہوتی ہے۔ پوری طرح آپ اپنا گزارا کرنے کی قوت حاصل نہیں کرتا[1]۔ اب دیکھو یہی قانون جس طرح جسم پر صادق آتا ہی اسی طرح نفس پر صادق آتا ہے۔ روحانی غذا کے حاصل کرنے کے لئے بھی ہر ایک اعلیٰ مخلوق۔ اور خصوصاً انسان۔ اوّل اوّل اپنے سے بڑوں کی مدد کا محتاج ہوتا ہی چونکہ ننھے بچے میں ادھر اُدھر حرکت کرنے کی قابلیت نہیں ہوتی اس لئے جس طرح وہ اپنا پیٹ پالنے کے لئے خوراک حاصل کرنے کے قابل نہیں ہوتا تقریباً اسی طرح اُس مواد کے حاصل کرنے کی قوت بھی نہیں رکھتا جس پر وہ اپنے ادراک کو عمل میں لاسکے جس طرح وہ اپنی خوراک تیار کرنے کے قابل نہیں ہوتا اُسی طرح علم کی بہت سی قسموں کو دل نشین کرنے کے لئے ایک مناسب صورت میں نہیں لاسکتا جس زبان کے ذریعہ سے تمام اعلیٰ درجہ کے حقایق حاصل ہوتے ہیں وہ اُس زبان کو کلیتہً گرد وپیش کے حقایق کے ذریعہ سے حاصل کرتا ہے۔ اور جب والدین اور اتاؤں کی کی طرف سے کوئی مدد نہیں ملتی تو نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نشو ونما میں خلل پڑتا ہی۔ جیسا کہ ہم آویرن[2] کے جنگلی لڑکے کی مثال سے مشاہدہ کرتے ہیں۔ پس روز بروز صحیح

---

[1] اس مطلب کو شیخ سعدی نے اس طرح ادا کیا ہے "ہرچہ زود برآید دیر نہ پاید" ؎

| | | | |
|---|---|---|---|
| مترجم | آدمی زادہ ندارد خبر از عقل و تمیز | | مرغک از بیضہ برون آید و روزی طلبد |
| | دیں بہ تمکین و فضیلت بگزشت از ہمہ چیز | | آں کہ ناگاہ کسے گشت بچیزے نہ رسید |
| | لعل دشوار بدست آید و زاں ست عزیز | | آبگینہ ہمہ جا بینی ازاں قدرش نیست |

[2] آویرن ایک ضلع ہی فرانس کے جنوب میں آویرن کے جنگلی لڑکے سے غالباً ایسا لڑکا مُراد ہی جس نے بھیڑیوں میں پرورش پائی ہو بھیڑیے کبھی کبھی چھوٹے بچوں کو اُٹھالے جاتے ہیں اور یہ بات مشہور ہی کہ کسی کسی بچے کو پھاڑ کھانے کے بجائے اپنے بچوں کے ساتھ پرورش کر لیتے ہیں میں نے بہت کوشش کی مگر افسوس ہی کہ آویرن کے جنگلی لڑکے کا حال کسی کتاب وغیرہ کے ذریعہ کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ مترجم

قسم کے واقعات مہیا کرنے ہیں۔ جو صحیح طریقے سے تیار کئے گئے ہوں اور مناسب وقفوں
سے۔ باندازہ مناسب اُن واقعات کو ذہن نشین کرنے کی غرض سے بچے کے نفس کے
لئے مستعدانہ مدد کی اُسی قدر گنجایش ہے جس قدر کہ اُس کے جسم کے لئے دونوں صورتوں
میں والدین کا مقدم فرض اس بات کا دیکھنا ہے کہ جو شرطیں نشوونما کے لئے ضروری
ہیں اُن کو قایم رکھا جائے اور جس طرح خوراک۔ لباس۔ مکان بہم پہنچانے میں والدین
اس فرض کو اس طرح پورا کر سکتے ہیں جس سے اعضا اور امعا کے قدرتی نشوونما میں کیا
بلحاظ ترتیب کے اور کیا بلحاظ طریقہ نشوونما کے مطلق خلل واقع نہ ہو اسی طرح نقل کے لئے آوازیں
دیکھ بھال کے لئے اشیا۔ پڑھنے کے لئے کتابیں اور حل کرنے کے لئے سوالات بھی
مہیا کر سکتے ہیں۔ اور اگر وہ بالواسطہ یا بلا واسطہ جبر و مزاحمت نہ کریں تو روحانی ارتقا
کے باقاعدہ عمل میں کسی طرح کا خلل واقع نہ ہوگا۔ بلکہ یوں کہو کہ اس عمل میں بہت کچھ
سہولت ہو جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ مسائل مذکورہ کا تسلیم کرنا اس امر کی دلیل نہیں ہے
کہ تعلیم کو ترک کر دیا جائے۔ جیسا کہ بعض اشخاص حجت پیش کر سکتے ہیں۔ بلکہ تربیت کے
ایک مفید اور مکمل نصاب کے لئے کافی گنجایش باقی رہتی ہے۔

پستالوزی کے طریقہ تعلیم کی ناکامیابی اور اُس کی بڑی وجہ لایق معلموں کا دست یاب نہ ہونا

اصول کلیہ کو چھوڑ کر خاص امور پر غور کیا جائے تو یہ بات قابل بیان ہے کہ پستالوزی
کے طریقہ تعلیم نے اپنے خیالی منصوبہ کے دعوے کو عملاً بہت ہی کم پورا کیا ہے ہم نے
سُنا ہے کہ بچے اُس طریقہ کے سبقوں سے ذرا بھی دلچسپی نہیں رکھتے بلکہ اُن سے متنفر
ہیں۔ جو مدرسے پستالوزی کے اصول کے موافق قایم ہوئے ہیں۔ جہاں تک ہم
تحقیق کر سکتے ہیں۔ اُن کے طالب علم اگر اوسط درجہ پر پہنچے بھی ہیں تو بھی اُن میں سے
ممتاز اور سربرآوردہ لوگوں کی غیر معمولی تعداد پیدا نہیں ہوئی۔ ہم کو اس بات سے
تعجب نہیں ہے۔ ہر ایک آلہ کی کامیابی زیادہ تر اس بات پر منحصر ہے کہ کس دانشمندی
سے اُس کو کام میں لایا جاتا ہے؟ یہ ایک عام اور مبتذل مقولہ ہے کہ اناڑی کا ہیگر

عمدہ سے عمدہ اوزاروں سے بھی بھدّا کام بناتا ہی۔ اور بُرے معلّم اچھّے سے اچھّے طریقوں سے بھی ناکامیاب رہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسی حالت میں طریقہ کی عمدگی اسی طرح ناکامیابی کا باعث ہوجاتی ہے جس طرح کہ حسب تمثیل مذکورۂ بالا۔ اوزار کا کمال اناڑی کے ہاتھوں ناقص نتائج کا ذریعہ بن جاتا ہی۔ سیدھے سادے۔ غیر متغیر۔ اور قریب قریب کل کی طرح چلنے والے تعلیم کے کام کو نہایت ہی معمولی عقل کا آدمی چلا سکتا ہے جس سے اسی قدر کم فائدہ مند نتیجہ پیدا ہوتا ہی جس قدر کہ پیدا ہو سکتا ہے۔ مگر کامل طریقہ یعنی وہ طریقہ جس کے عمل ایسے ہی مختلف الجنس ہیں جیسے کہ نفس ناطقہ کی قوتیں مختلف قسم کی ہیں۔ یا یوں کہو کہ وہ طریقہ جو ہر خاص مقصد کے واسطے ایک خاص وسیلہ تجویز کرتا ہی اس کے صحیح استعمال کے لئے ایسی قوتیں درکار ہیں جو بہت کم معلّموں میں پائی جاتی ہیں۔ مدرسۂ نسواں کی معلّمہ ہجّوں کے سبق سُن سکتی ہے۔ اور ایک معمولی مدرسہ کا معلّم بچّوں کو ضرب کے پہاڑوں کی مشق کرا سکتا ہی مگر صحیح طور پر ہجّے سکھانے کے لئے جس میں حرفوں کے ناموں کی بجائے اُن کی قوتوں سے کام لیا جائے۔ یا مجموعۂ اعداد کی تعلیم اس طرح دینے کے لئے کہ اُن کی ہیئت ترکیبی کو تجربہ کے ذریعہ سے سمجھا دیا جائے ذرا عقل چاہیئے اور تمام سلسلۂ تعلیم میں اسی قسم کے معقول طریقہ کو اختیار کرنے کے لئے کسی قدر قوت فیصلہ۔ قوّت ایجادی عقلی ہمدردی۔ اور قابلیت تحلیل درکار ہے۔ اور جب تک معلّمی کے پیشہ کی ایسی کم قدری رہیگی اس وقت تک ہم کبھی نہیں دیکھیں گے کہ معلّم ان قوتوں کا استعمال کریں۔ سچّی تعلیم تو سچّے حکیم (فلسفی) ہی سے ممکن ہی۔ پس انصاف کرو کہ آج کل حکیمانہ طرز تعلیم پر عمل کئے جانے کی کیا خاک توقع ہو سکتی ہے! ہم تو اب تک سائی کالوجی سے بہت ہی کم واقف ہیں اور ہمارے معلّم اس تھوڑی سی معلومات سے بھی ناواقف ہیں بھلا ایسی حالت میں جس طریقہ کی بنیاد ہی سائی کالوجی پر ہے اس کی کامیابی کا کیا

احتمال ہو سکتا ہے۔

پستالوزی کا طریقہ تعلیم اصولاً صحیح ہے مگر اُس کو عملاً صحیح طور پر استعمال نہیں کیا گیا۔

اس کے سوا پستالوزی کے اُصول کو اُن صورتوں کے ساتھ گڈمڈ کر دینا جن میں وہ شامل ہیں۔ اور بھی سدِّراہ اور دل شکنی کا باعث ہو گیا ہے۔ چوں کہ خاص خاص تدبیروں سے جیسا کہ اندیشہ تھا کاربراری نہیں ہوئی۔ اس لئے جو اصول اُن سے متعلق ہے اُس کو بے اعتباری کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اس بات کی تحقیقات نہیں کی جاتی کہ آیا یہ تدبیریں حقیقت میں اُس اصول کے مطابق ہیں بھی یا نہیں۔ لوگ عادةً مجرّدات کی بجائے مادّیات کے ذریعہ سے رائے قایم کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے اُنھوں نے عمل کی غلطیوں کا الزام اصل مسئلہ پر لگا دیا ہے۔ یہ ایسی بات ہے جیسا کہ دُخانی انجن بنانے کی ابتدائی ناچیز کوشش کو اس امر کا ثبوت قرار دیا گیا تھا کہ بھاپ قوّتِ محرکہ کا کام نہیں دے سکتی۔ یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہیئے کہ گو پستالوزی کے اصولی خیالات صحیح تھے مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ اپنے تمام خیالات کے استعمال میں حق بجانب تھا۔ پستالوزی کے مدّاح بھی یہی کہتے ہیں کہ وہ ایسا شخص تھا جس میں قدرتی ذکاوت کم تھی۔ یعنی ایسا شخص جس کے اندر سے کبھی کبھی نورِ بصیرت کے چمکارے نکلتے تھے نہ کہ ایسا شخص جو باضابطہ رائے رکھتا ہو اُس کو بڑی کامیابی بمقام ستانز اُس وقت حاصل ہوئی تھی جب کہ اُس کے پاس کتابیں یا معمولی تعلیم کا سامان نہ تھا۔ اور جب کہ اُس کی توجہ کا مقصد صرف یہ تھا کہ ہر وقت اس بات کا پتا لگائے کہ اُس کے بچّوں کو خاص کر کس تعلیم کی ضرورت ہے اور جس علم کو بچّے پہلے ہی حاصل کر چکے ہیں اُس کے ساتھ نئے علم کو نہایت عمدہ طور پر کس طرح شامل کرنا چاہیئے۔" اُس کی بہت سی قوت تربیت کی اُن تدبیروں پر مبنی نہ تھی جو اطمینان سے بحث و دلیل کے بعد نکالی جاتی ہیں۔ بلکہ اُس کی گہری ہمدردی کی بدولت تھی جس کی وجہ سے بچّوں کی ضروریات اور مشکلات کا ادراک اُس کو جلد حاصل ہو گیا تھا۔ اُس میں یہ قابلیت نہیں تھی کہ اُن اصول کو جن پر اُس نے

وقتاً فوقتاً اس طرح قابو پایا۔ اجمالاً منطقی طور پر باضابطہ مرتب کرتا اور ترقی دیتا اور یہ معاملہ اُس کو بہت کچھ اپنے مددگاروں (کروزی۔ تابلر۔ نیڈرر۔ اور شمد) پر چھوڑنا پڑتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود اُس کے اپنے منصوبے اور نیز جو منصوبے اُس کے مددگاروں نے نیابتہً تجویز کئے تھے۔ ان دونوں کے جزئیات میں بے شمار خامیاں اور اختلافات ہیں۔ چوں کہ اس کا بنایا ہوا قانونِ دایہ خانہ۔ جو کتاب "مدر ز مینول" (ماں کی کتاب) میں بیان کیا گیا ہے۔ اُس کے شروع میں جسم کے مختلف حصّوں کے نام درج ہیں اس کے بعد اُن کے اضافی محل وقوع اور پھر اُن کے تعلقات کا ذکر کیا گیا ہے اس لئے یہ بات ثابت ہو سکتی ہے کہ یہ قانون عقلی ارتقا کے ابتدائی مدارج کے موافق بالکل نہیں ہے۔ مادری زبان کی تعلیم کا طریقہ جو اُس نے تجویز کیا ہے کہ لفظوں کے معنوں اور جملوں کی ساخت کی باقاعدہ مشق کرائی جائے بالکل غیر ضروری ہے اور اُس سے شاگردوں کے وقت محنت اور خوشی کا نقصان ضرور ہوگا۔ پستالوزی کی تجویز کئے ہوئے جغرافیہ کے سبق اُس کے مقرر کردہ اصول کے بالکل خلاف ہیں۔ اور اکثر اوقات دیکھا جاتا ہے کہ جہاں کہیں اُس کے منصوبے دراصل صحیح ہیں وہاں بھی یا تو نامکمل ہیں یا پرانے دستور العمل کا کچھ اثر باقی رہ جانے کی وجہ سے خراب ہو گئے ہیں۔ پس جہاں ہم اُس عام اصول کی پوری پوری حمایت کرتے ہیں جس کو پستالوزی نے جاری کیا ہے ہم یہ بھی خیال کرتے ہیں کہ اُس کے خاص طریقوں کو بلا تحقیق و تنقید قبول کر لینے سے بڑی خرابی پیدا ہونے کا احتمال ہے۔ بنی نوع انسان کا میلان ہمیشہ اس بات کی طرف ظاہر ہوتا رہا ہے کہ جن شکلوں اور جن عملوں کی ساتھ اُن کو کوئی بڑا مسئلہ تلقین کیا جاتا ہے۔ اُن شکلوں اور عملوں ہی کو آئین و شریعت قرار دے لیتے ہیں یعنی اپنی عقلوں کو پیغمبر کے سامنے سربسجود ڈال دیتے اور اُس کے ہر لفظ کی قسم کھانے کے لئے مستعد رہتے ہیں۔ یا یوں کہو کہ لوگوں کی رغبت اس طرف

ہے کہ جس لباس میں اس خیال کو ظاہر کیا گیا ہے غلطی سے اُس لباس ہی کو خیال سمجھ لیتے ہیں۔ اس لئے ضرورت اس امر کی مقتضی ہے کہ پستالوزی کے طریقہ کے بنیادی اصول میں اور جو تدابیر اُس کو عمل میں لانے کے لئے تجویز کی گئی ہیں۔ اُن میں جو فرق ہے اس پر سختی کے ساتھ زور دیا جائے۔ اور یہ بات جتا دی جائے کہ گو اُس طریقہ کو ایک قانون مسلم قرار دے سکتے ہیں مگر غالباً ان تدابیر میں باقاعدہ طریقہ کی محض خفیف سی جھلک کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ بے شک اپنے علم کی حالتِ موجودہ پر نظر کر کے ہم اس بات کا پورا یقین کر سکتے ہیں کہ یہی صورت ہے۔ قبل اس کے کہ طرق تعلیم کو بہ لحاظ اُن کی نوعیت اور ترتیب کے قوائے عقلیہ کے طریقہ و ترتیب نشو و نما کے مطابق بنایا جائے۔ سب سے پہلے اس بات کی ضرورت ہے کہ ذرا کامل طور پر اس امر کی تحقیق کر لیں کہ اُن قویٰ کا نشو و نما کیوں کر ہوتا ہے فی الحال اس بارہ میں ہم نے محض چند عام خیالات حاصل کئے ہیں۔ ان عام خیالات کو با تفصیل ترقی دینی چاہیئے۔ یعنی قبل اس کے کہ ہماری نسبت یہ کہا جا سکے کہ ہم نے اُس علم (سائنس) کو حاصل کر لیا ہے۔ جس پر تعلیم کے فن (آرٹ) کی بنیاد رکھنی لازم ہے یہ بات ضروری ہے کہ اُن عام خیالات کو بے شمار خاص بخاص مختلف شکلوں میں ظاہر کیا جائے۔ اور پھر جب ہم کو قطعی طور پر یہ معلوم ہو جائے کہ کس ترتیب اور کس اجتماع سے قوائے عقلیہ چست و چالاک ہوتے ہیں تو یہ کام باقی رہ جاتا ہے کہ ہر ایک قوت کی مشق کے لئے منجملہ بہت سے طریقوں کے اُس طریقہ کو پسند کر لیا جائے جو اُس کی قدرتی طریق عمل سے سب سے زیادہ مطابقت رکھتا ہو۔ پس ظاہر ہے کہ سب سے عمدہ اور ترقی یافتہ طرق تعلیم کی بابت بھی یہ خیال نہیں کرنا چاہیئے کہ وہ صحیح یا تقریباً صحیح طریقے ہیں۔

پستالوزی کے اصول و عمل میں اختلاف

پس پستالوزی کے اصول اور عمل میں اس امتیاز کو ذہن نشین کر کے اور پیش کی ہوئی دلیلوں سے یہ نتیجہ نکال کر کہ اُس کا عمل بالضرور بہت ناقص ہے۔ ناظرین

صحیح طریقہ تعلیم کا معیار کیا ہے ؟

اس امر کا اندازہ کرسکیں گے کہ بعض لوگوں نے اس طرز تعلیم سے جو ناراضی ظاہر کی ہے اُس کی حقیقی وقعت کس قدر ہے اور اس بات کو دیکھ لیں گے کہ پستالوزی کے خیال کی تکمیل ابھی باقی ہے۔ جو کچھ ہم نے ابھی بیان کیا ہے اگر ناظرین اُس پر یہ حجت پیش کریں کہ اس قسم کی تکمیل بالفعل ممکن العمل ہی نہیں ہے اور یہ تمام کوشش ابتدائی تحقیقات ہی میں مصروف رکھنی چاہیئے۔ تو ہم اس کا یہ جواب دیتے ہیں کہ اگرچہ تربیت کے کسی طریقے کی تکمیل۔ خواہ مادہ کے اعتبار سے ہو خواہ صورت کے اعتبار سے۔ اُس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک کہ عقلی سائی کالوجی قایم نہ ہو جائے۔ تاہم بعض رہنمائی کرنے والے اصول کی مدد سے یہ ممکن ہے کہ ہم تجربہ کے ذریعہ سے ایک مکمل طریقے کے قریب قریب جا پہنچیں۔ ہم آیندہ تحقیقات کا رستہ صاف کرنے کی غرض سے ان اصول کو خاص طور پر بیان کریں گے۔ ان میں سے بعض اصول تو صفحات ماسبق میں کم وبیش صراحت کے ساتھ بیان ہو چکے ہیں مگر یہاں اُن سب کو منطقی ترتیب سے بیان کرنا بہتر ہوگا۔

عقلی ارتقا کے سات اُصول (۱) آسان باتوں سے مشکل باتوں کی طرف جانا

(۱) یہ بات کہ "تعلیم میں آسان باتوں سے پیچیدہ باتوں کی طرف جانا چاہیئے" ایسی حقیقت ہے جس پر کسی حد تک ہمیشہ عمل ہوتا رہا ہے گو حقیقت میں صاف وصریح طور پر عمل نہیں کیا گیا اور معقول مناسب طریق پر بھی مطلقاً عمل نہیں ہوا۔ نفس ناطقہ کا نشو ونما ہوتا رہتا ہے۔ مثل اُن تمام چیزوں کے جو نشو ونما پاتی ہیں نفس بھی ہمجنس چیزوں سے مختلف الجنس چیزوں تک بہ تدریج پہنچتا ہے۔ اور چوں کہ تربیت کا باقاعدہ طریقہ اس معنوی عمل کی صوری شبیہ ہے اس لئے اُس میں بھی اسی طرح بہ تدریج ترقی ظاہر ہونی چاہیئے۔ اس کے علاوہ اصول مذکور کی اس طرح تشریح کرنے کے بعد ہم یہ بات دیکھ سکتے ہیں کہ اس کا اطلاق۔ جتنا اوّل اوّل معلوم ہوتا ہے۔ اُس سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اُس کی تشریح میں یہ بات داخل ہو کہ نہ صرف علم کی

ہر ایک شاخ کی تعلیم میں مفرد شے سے مجموعہ کی طرف جانا چاہیئے بلکہ تمام علم ہی اس
طریقہ سے سکھانا چاہیئے - چوں کہ نفس ناطقہ میں عمل کرنے والی قوتوں کی تعداد اول اول
بہت ہی کم ہوتی ہے اور جو قوتیں بعد میں تکمیل کو پہنچتی ہیں وہ یکے بعد دیگرے اپنا عمل
کرنا شروع کرتی ہیں اور آخر کار نفس ناطقہ کی تمام قوتیں ایک ساتھ اپنا اپنا عمل شروع
کر دیتی ہیں اس لئے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ابتدائی تعلیم میں ایک ہی دو مضمونوں کی
تعلیم ایک ساتھ شروع ہونی چاہیئے - اور بتدریج اُن مضامین کی تعداد
میں اضافہ کر کے آخر کار تمام مضامین کی تعلیم کو ساتھ ساتھ جاری رکھنا
چاہیئے نہ صرف جزئیات میں بلکہ مجموعی حیثیت سے بھی آسان سے مشکل
کی طرف جانا چاہیئے۔

(۲) بچوں کو علمی اصطلاحیں اور تعریفیں شروع میں نہیں بتانی چاہئیں صرف موٹی موٹی باتیں اُن کی سمجھ کے موافق بتا دینی کافی ہیں

(۲) نفس ناطقہ کے نشو و نما میں بھی جیسا کہ سب چیزوں کے نشو و نما میں ہوتا ہے مبہم
غیر معین چیزوں سے معین چیزوں کی طرف ترقی ہوتی ہے۔ دیگر اعضائے بدن کی
مانند دماغ کی مکمل ساخت بھی زمانہ بلوغ کو پہنچ کر ہی پوری ہوتی ہے۔ اور جس قدر
کہ اس کی بناوٹ نامکمل ہوتی ہے اسی قدر اس کے عملوں میں صحت و درستی نہیں ہوتی
یہی وجہ ہے کہ گفتگو سیکھنے کے لئے بچّہ کی ابتدائی حرکات اور ابتدائی کوششیں
جس طرح مبہم اور غیر معیّن ہوتی ہیں اس کے ادراکات اور خیالات بھی مبہم اور غیر
معیّن ہوتے ہیں جس طرح کہ نا تربیت یافتہ نگاہ صرف روشنی اور تاریکی کے فرق کو
معلوم کرتی ہے اور پھر ترقی کر کے وہی نگاہ ایسی بن جاتی ہے جو بڑی صحت کے ساتھ
رنگ کی قسموں اور درجوں میں اور شکل کے جزئیات میں تمیز کرنے لگتی ہے اسی طرح
عقل بھی کیا بحیثیت مجموعی اور کیا باعتبار اپنی ہر ایک قوت کے شروع میں تو اشیا
اور افعال کے نہایت موٹے موٹے فرقوں ہی میں تمیز کر سکتی ہے مگر رفتہ رفتہ ترقی
کر کے نہایت نازک اور باریک فرقوں کو سمجھنے لگتی ہے۔ ہمارا تعلیمی نصاب اور طرق تعلیم

اس عام قانون کے مطابق ضرور ہونے چاہئیں۔ یہ بات ممکن العمل نہیں ہے اور اگر ممکن العمل بھی ہو تو پسندیدہ نہیں ہے کہ ناتربیت یافتہ نفس میں ٹھیک بچے تلے خیالات ڈال دیئے جائیں۔ یہ بات درحقیقت ممکن ہے کہ الفاظ کی صورتیں جن میں وہ خیالات ملفوف ہیں بچوں کو بچپن ہی میں بتادی جائیں۔ اور جو معلم عادۃً ایسا کرتے ہیں وہ یہ فرض کرلیتے ہیں کہ جب الفاظ کی صورتیں صحیح طور پر یاد ہوجائیں گی تو جو خیالات اُن صورتوں میں بھرے ہوئے ہیں وہ بھی حاصل ہوجائیں گے۔ مگر طالب علم سے مختصر سے جرحی سوالات کرنے سے معاملہ بالعکس ثابت ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ یا تو یہ نکلتا ہے کہ الفاظ یاد کرلئے گئے ہیں اور اُن کے معنوں کا بہت کم خیال کیا گیا ہے یا بالکل نہیں کیا گیا۔ اور یا یہ کہ اُن کے معنوں کی بابت جو علم حاصل کیا گیا ہے وہ نہایت تاریک اور دھندلا سا علم ہے، صرف اُس وقت جب کہ بے شمار تجربوں کے ذریعہ سے قطعی ومعین تصوّرات کا مواد بہم پہنچ جاتا ہے، صرف اُس وقت جب کہ مشاہدہ کے ذریعہ سے سال بہ سال ایسے اوصاف ظاہر ہوتے رہتے ہیں جو صاف طور پر نمایاں نہ تھے اور جن کی وجہ سے اُن چیزوں اور عملوں میں تمیز ہوجاتی ہے جن میں پہلے کچھ تمیز نہیں ہوسکتی تھی صرف اُس وقت جب کہ ہر قسم کے لوازم وملزومات اور نتائج سے واقفیت ہوجاتی ہے۔ اور یہ واقفیت اُن باتوں کے متواتر وقوع پذیر ہونے کی بدولت حاصل ہوتی ہے جو اس مشاہدہ کے تحت میں داخل ہیں، صرف اُس وقت جب کہ مختلف قسم کے تعلقات میں باہمی حدود وقیود کی وجہ سے ایک دوسرے سے ٹھیک ٹھیک تمیز ہوسکتی ہے ترقی یافتہ علم کی صحیح صحیح تعریفیں واقعی طور پر سمجھ میں آسکتی ہیں۔ پس ہم کو لازم ہے کہ ابتدائی تعلیم میں نامکمل خیالات ہی پر قناعت کریں۔ ہمارا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ اُن خیالات کو بہ تدریج زیادہ صاف اور صحیح کیا جائے اور یہ مقصد اس طرح پورا ہوسکتا ہے کہ اوّل اُن ہی تجربوں کے حاصل کرنے

میں سہولت پیدا کی جائے جن سے بچوں کی موٹی موٹی غلطیاں دُور ہو جائیں اور بعد ازاں اُن غلطیوں کی اصلاح بہ تدریج ہو جائے جو اُن سے کم درجہ کی ہیں۔ اور جس وقت تصورات کامل ہو جائیں عملی اصول صرف اُسی وقت بتانے چاہئیں۔

(۳) ابتدائی تعلیم میں خاص سے عام کی طرف یعنی مادیات سے مجردات کی طرف جانا چاہیئے

(۳) یہ قول کہ "اسباق مادیات سے شروع ہونے چاہئیں اور مجردات پر ختم ہونے چاہئیں"۔ اس قول کی نسبت یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ وہ اصول مذکورۂ بالا میں سے پہلے اصول کا کسی قدر اعادہ ہے۔ تاہم یہ ایسا مسئلہ ہے جس کو ضرور بیان کرنا چاہیئے اگر کسی غرض سے نہیں تو اسی غرض سے سہی کہ بعض صورتوں میں یہ بات ظاہر ہو جائے کہ درحقیقت آسان باتیں کون سی ہیں اور مشکل باتیں کون سی۔ کیونکہ بدقسمتی سے اس خصوص میں بہت کچھ غلط فہمی ہو رہی ہے۔ مجموعہ جزئیات کے ظاہر کرنے کے لئے جو عام اصول لوگوں نے تجویز کئے ہیں اور جن کی وجہ سے اُن کے تصورات آسان ہو گئے ہیں۔ اس طرح کہ بہت سے واقعات کو ملا کر ایک واقعہ بنا دیا ہے۔ اُن عام اصول کی بابت لوگوں نے یہ قیاس کر لیا ہے کہ اُن کی وجہ سے بچہ کے تصورات بھی ضرور آسان ہو جائیں گے! وہ اس بات کو بھول گئے ہیں کہ عام اصول صرف اُن خاص امور کے مجموعہ کے مقابلہ میں آسان ہوا کرتا ہے جو اُس میں شامل ہیں۔ یعنی وہ نتیجہ اُن میں سے کسی ایک حقیقت کی نسبت۔ اگر اُس کو بہ حیثیت انفرادی لیا جائے زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ اور جب بہت سی حقیقتیں فرداً فرداً حاصل ہو جاتی ہیں اُس کے بعد ہی عام نتیجہ سے حافظہ کو سہولت اور عقل کو مدد مل سکتی ہے۔ اور جس نفس میں یہ حقایق منفرداً موجود نہ ہوں اُس کے لئے وہ نتیجہ بالضرور ایک عقدۂ لاینحل ہے پس ان دو قسم کی سہولتوں کو گڈمڈ کر دینے کی وجہ سے معلّموں نے ہمیشہ یہی غلطی کی ہے کہ وہ "اصول اوّلیہ ہی سے تعلیم شروع کر دیتے ہیں۔ یہ کارروائی اگرچہ ظاہراً نہیں مگر حقیقتہً اُس ابتدائی قاعدہ ہی کے خلاف ہے جس کا ماحصل یہ

ہے کہ نفس ناطقہ کو اصول کی تعلیم مثالوں کے ذریعہ سے دینی چاہیئے اور اس طرح خاص سے عام کی طرف یعنی مادّیات سے مجرّدات کی طرف اُس کی رہنمائی کرنی چاہیئے۔

(۴) بچّہ کی تعلیم۔ طریقہ اور تربیت دونوں کے اعتبار سے نوع انسان کی تعلیم کے مطابق ہونی چاہیئے جب کہ تاریخی حیثیت سے اُس پر نظر کی جائے۔ اس مطلب کو دوسرے لفظوں میں یوں بیان کر سکتے ہیں کہ جس طریقہ سے نوع انسان میں علم نے جنم لیا ہے فرد واحد میں بھی اُسی طریقہ کے مطابق اُس کا جنم ہونا چاہیئے۔ اگر ٹھیک ٹھیک دیکھا جائے تو ہم خیال کر سکتے ہیں کہ یہ اصول پہلے ہی کنایۃً بیان ہو چکا ہے۔ چوں کہ یہ دونوں ارتقا کے عمل ہیں اس لئے ضرور ہے کہ وہ اُن عام قوانین ارتقا کے موافق ہوں جن کو ہم زور دے کر اوپر بیان کر چکے ہیں۔ اور اسی وجہ سے یہ دونوں عمل ایک دوسرے کے مطابق ضرور ہونے چاہئیں۔ تاہم یہ خاص مشابہت اُس خاص ہدایت کی غرض سے بھی، جو اُس سے حاصل ہوتی ہے۔ قابل قدر ہے۔ ہم کو یقین ہے کہ قوم مسٹر کونت[1] کی وجہ سے ممنون احسان ہے کہ اُنھوں نے اس بات کو بیان کر دیا ہے اور ہم صاحب موصوف کے فلسفہ کے اس حصّہ کو قبول کر سکتے ہیں لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اُن کے باقی ماندہ فلسفہ کو بھی تسلیم کر لیا جائے۔ کسی مجرّد مسئلہ سے بالکل قطع نظر کر کے یہ مسئلہ دو دلیلوں سے ثابت ہو سکتا ہے۔ اور اُن میں سے کوئی ایک دلیل اُس کے ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔ ایک دلیل تو قانون توارث سے پیدا ہوتی ہے (یعنی آبا و اجداد کے اوصاف و خصائل کا نسلاً بعد نسل اولاد تک پہنچنا) جب کہ اس قانون پر اُس کے وسیع تر نتائج کے اعتبار سے غور کیا جائے۔ کیوں کہ اگر یہ بات سچ ہو کہ لوگ شکل و شباہت اور عادت و خصلت

[حاشیہ: بچوں کی تعلیم اُسی اصول کے موافق ہونی چاہیئے جس کے موافق نوع انسان کی تعلیم ہوئی ہے]

[1] کونت فرانس کا ایک فلسفی تھا ۱۷۹۸ء میں پیدا ہوا۔ اور ۱۸۵۷ء میں انتقال کیا۔ مترجم

دونوں میں اپنے اسلاف کے ساتھ مشابہت ظاہر کرتے ہیں۔ اگر یہ بات سچ ہو کہ بعض عقلی ظہور مثلاً جنون ایک ہی خاندان کے لوگوں میں ایک ہی عمر میں نسلاً بعد نسلٍ پیش آتے ہیں۔ اگر بعض منفرد صورتوں (خاص شخصوں) سے قطع نظر کرکے، جن میں بہت سے مُردہ بزرگوں کے خط وخال چند زندہ بزرگوں کے خط وخال کے ساتھ مِل جُل کر اس قانون کو بہت کچھ تاریکی میں ڈال دیتے ہیں ہم قومی شکل وشباہت کی طرف توجہ کریں اور اس امر پر غور کریں کہ اُن کے باہمی اختلافات قرناً بعد قرنٍ کیسے مستقل رہتے ہیں۔ اگر ہم یہ بات یاد رکھیں کہ یہ شکل وشباہت ایک مشترک ذخیرہ سے پیدا ہوئی ہے۔ اور یہ کہ اسی وجہ سے موجودہ نمایاں فرق جو اُن میں پائے جاتے ہیں وہ بالضرور اُن تبدیل شدہ حالات کے اثر سے پیدا ہوئے ہیں جو یکے بعد دیگرے اُن نسلوں کو پیش آئے ہیں۔ اور اُن نسلوں نے اثراتِ مجتمعہ کو جُدا جُدا اپنی اولاد تک پہنچایا ہے۔ اگر ہم کو یہ بات معلوم ہو جائے کہ آج کل یہ فرق خلقی ہیں یہاں تک کہ ایک فرانسیسی بچّہ اگر اجنبی لوگوں میں پرورش پائے تو بھی بڑا ہو کر فرانسیسی آدمی بن جاتا ہے۔ اور اگر یہ عام بات جس کی ہم نے اس طرح تشریح کردی ہے جملہ کائنات کی بابت صادق آتی ہے جس میں عقل بھی شامل ہے، تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر کوئی ایسی ترتیب موجود ہو جس ترتیب سے نسل انسانی نے مختلف قسم کے علوم پر عبور حاصل کیا ہے تو ہر ایک بچّہ میں اس قسم کے علوم کو حاصل کرنے کی قابلیت اُسی ترتیب سے پیدا ہو گی۔ پس اگر یہ ترتیب فی حدِ ذاتہٖ غیر ضروری ہو تو بھی تعلیم میں اس بات سے سہولت ضرور پیدا ہو جائے گی کہ فرد واحد کے نفس کو اسی راہ پر قدم بہ قدم لے جائیں جس کو بالعموم نوع انسانی نے طے کیا ہے۔ مگر یہ ترتیب فی حدِ ذاتہٖ غیر ضروری نہیں ہے لہذا یہ ایک اہم وجہ ہے کہ تعلیم میں کسی قدر تمدّن کا اعادہ ہونا چاہیئے۔ یہ دونوں

باتیں ثابت ہو سکتی ہیں کہ تاریخی واقعات کی بڑی بڑی باتوں کا ایک خاص ترتیب سے وقوع پذیر ہونا ایک لازمی نتیجہ تھا۔ اور یہ کہ جو اسباب اس امر کا باعث ہوئے ہیں وہ جس طرح نسل انسانی پر صادق آتے ہیں اسی طرح ایک بچّہ پر بھی صادق آتے ہیں۔ ان اسباب کی بالتفصیل صراحت کرنے کی ضرورت نہیں ہی یہاں صرف اتنا اشارہ کافی ہوگا کہ چوں کہ نوع انسان کے نفس ناطقہ نے مظاہر قدرت کے درمیان رہکر اور اُن کو سمجھنے کی کوشش کرکے بیے حدّو حساب مقابلوں۔ خیالوں۔ تجربوں۔ اور مسئلوں کے بعد ایک خاص راہ سے ہر مضمون میں موجودہ علم تک رسائی حاصل کی ہی۔ لہذا معقول طور پر یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہی کہ نفس ناطقہ اور مظاہر قدرت کا تعلق ایسا ہی کہ وہ اس علم کو کسی دوسرے رستہ سے حاصل ہونے سے روکتا ہے۔ اور چوں کہ ہر ایک بچّہ کا نفس ناطقہ بھی مظاہر قدرت کے ساتھ یہی علاقہ رکھتا ہی اس لیے صرف اسی رستہ سے اُن مظاہر تک اُس کی رسائی ہو سکتی ہے یہی وجہ ہے کہ تعلیم کے صحیح طریقہ کی بابت تصفیہ کرنے میں طریق تمدّن کی تحقیقات ہمارا ہی ہدایت کے لئے ممد و معاون ہوگی۔

۵) تعلیم کی ہر شاخ میں عملی علم سے عقلی علم تک پہنچنا چاہیئے

(۵) اس قسم کی تحقیقات جن نتائج تک ہم کو پہنچاتی ہے اُن میں سے ایک نتیجہ یہ ہے کہ تعلیم کی ہر ایک شاخ میں ہم کو عملی علم سے عقلی علم تک پہنچنا چاہیئے۔ انسانی ترقی کے دوران میں ہر ایک علم (سائنس) اپنے اپنے فن (آرٹ) سے نکلا ہے۔ شخصی حیثیت سے اور نیز بہ حیثیت قوم ہم کو اس امر کی ضرورت درپیش ہے کہ مادیات کے ذریعہ سے مجرّدات تک رسائی حاصل کریں۔ اسی ضرورت کا یہ نتیجہ ہے کہ سائنس کے وجود سے پہلے مشق اور تجربہ۔ جو مشق سے حاصل ہوتا ہے اور مشق کے عملی نتائج کا وجود ضروری ہے۔ سائنس منضبط علم ہے اور علم کے منضبط ہونے سے پہلے ضرور ہے کہ اُس کا کسی قدر

حصہ ہمارے قبضہ میں ہو۔ پس ہر ایک مطالعہ کی تمہید خالص تجربہ سے ہونی چاہیئے۔
اور جب مشاہدات کا وافر سرمایہ جمع ہو جائے اُس کے بعد دلیل کو شروع کرنا چاہیئے
اس قاعدہ کی توضیح میں ہم بطور تمثیل کے جدید نصاب تعلیم کو پیش کر سکتے ہیں جس میں
صرف و نحو کی تعلیم کو زبان سے پہلے نہیں بلکہ بعد میں رکھا گیا ہی۔ یا اس معمولی دستور کو
پیش کر سکتے ہیں کہ فن مصوری میں قرب و بعد کے لحاظ سے اشیاء کی چھٹائی بڑائی کا
خیال رکھنے سے پہلے عملی مصوری کی تعلیم دی جاتی ہی۔ رفتہ رفتہ ہم اس بات کو
بیان کریں گے کہ اس قاعدہ کا مزید اطلاق کن صورتوں میں ہو سکتا ہی۔

(۶) بچوں کو اس بات کی ترغیب دینی چاہیئے کہ جہاں تک ممکن ہو اپنے علم کو آپ ترقی دیں

(۶) مذکورۂ بالا عام اصول سے دوسرا نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے کہ تعلیم میں بچوں کو اس
بات کی ہمت دلانی چاہیئے کہ وہ اپنے قوائے عقلیہ کو بطور خود ترقی دیں۔ یہ ایسا نتیجہ ہی
کہ خواہ کتنی ہی سرگرمی سے اُس پر زور دیا جائے پھر بھی کم ہے۔ بچوں کو اس طرح
رہنمائی کرنی چاہیئے کہ وہ اپنے آپ تحقیقات کریں اور اپنے آپ نتائج نکالیں۔
اُن کو جہاں تک ممکن ہو کم بتایا جائے اور جہاں تک ممکن ہو زیادہ تحقیقات
کرنے کی ترغیب دی جائے۔ نوع انسان نے اپنے نفس کو آپ ہی تعلیم دینے سے
ترقی کی ہی اور اُن لوگوں کی نمایاں کامیابی سے جو اپنی ہی کوشش سے بن گئے ہیں۔ یہ بات
برابر ثابت ہو رہی ہے کہ بہترین نتائج حاصل کرنے کی غرض سے ہر ایک نفس کے واسطے
ضروری امر ہے کہ کسی قدر اسی روش پر ترقی کرے۔ جن لوگوں نے مدرسہ کی معمولی
تربیت حاصل کی ہی اور جو مدرسہ سے اس خیال کو اپنے ساتھ لے کر نکلے ہیں کہ تعلیم صرف
اسی قدیم ڈگر پر چل سکتی ہی۔ اُن کو تو اس خیال سے مایوسی ہوگی کہ بچوں کو آپ اپنا معلم بنایا
جائے۔ البتہ اگر وہ اس بات پر غور کریں کہ گرد و پیش کی اشیاء کا نہایت ضروری علم جس کو بچہ
ابتدائی عمر میں حاصل کرتا ہی۔ وہ بغیر مدد کے حاصل ہوتا ہی۔ اگر وہ اس بات کو یاد کریں کہ
بچہ اپنی مادری زبان کا استعمال خود ہی سیکھتا ہے۔ اگر وہ اس بات کا اندازہ کریں کہ

زندگی میں تجربہ کیا کچھ بڑھ جاتا ہی یعنی مدرسے سے باہر نکل کر عقل میں کس قدر ترقی ہو جاتی
ہی جس کو ہر ایک بچہ بطور خود حاصل کرتا ہی۔ اگر وہ لندن کے اُس آوارہ لڑکے کی غیر معمولی
ذکاوت پر غور کریں جس کا کوئی خبر گیراں نہیں ہوتا اور جس کی ذکاوت اُن کاموں میں
ظاہر ہوتی ہی جن میں اُس کی قوتیں مصروف رہتی ہیں۔ مزید برآں اگر وہ یہ خیال
کریں کہ کتنے آدمی نہ صرف ہمارے نامعقول نصاب تعلیم کی بھول بھلیاں میں بلکہ
اور بھی بے شمار مزاحمتوں میں بلا امداد غیرے کشش و کوشش کر چکے ہیں تو اُن کو معلوم
ہو جائے گا کہ یہ نتیجہ کچھ خلاف عقل نہیں ہی کہ اگر کسی معمولی استعداد والے
طالب علم کے سامنے مضامین کو صحیح ترتیب اور صحیح شکل میں پیش کیا
جائے تو وہ اپنی مشکلات کو بہت ہی تھوڑی مدد سے بتدریج حل
کر لے گا۔ بھلا کون ایسا شخص ہوگا، جو اُس لگاتار مشاہدہ اور تحقیقات اور نتیجہ
جو بچے کے دل میں پیدا ہوتے رہتے ہیں، غور سے دیکھے یا ایسے معاملات میں، جو اُس
کے قوائے عقلیہ کی حد کے اندر ہیں، اُس کی عاقلانہ بات چیت کو غور سے سنے اور اُس کو
یہ معلوم نہ ہو جائے کہ اگر ان ہی قوتوں کو جو بچّہ میں ظاہر ہوتی ہیں ایسی چیزوں میں
باقاعدہ مصروف رکھا جائے جو اُس کی عقلی حد کے اندر ہیں تو وہ بغیر مدد کے اُن کو
جلد حاصل کر سکتا ہی؟ یہ جو بچّہ کو ہر ایک بات بتا دینے کی ضرورت ہمیشہ پیش
آتی ہی بچّہ کی حماقت کا نتیجہ نہیں ہی بلکہ ہماری اپنی حماقت کا نتیجہ ہے جن باتوں
سے بچّہ کو دلچسپی ہے اور جن کو وہ بذات خود مستعدی کے ساتھ سمجھ سکتا ہی ہم اُس کو
ان باتوں سے ہٹا دیتے ہیں۔ ہم اُس کے سامنے ایسی مشکل باتیں رکھ دیتے ہیں جن کو وہ
سمجھ نہیں سکتا اور اسی وجہ سے وہ اُس کو ناگوار معلوم ہوتی ہیں۔ یہ معلوم کر کے کہ وہ
خوشی خوشی اُن باتوں کو حاصل کرنا نہیں چاہتا۔ ہم تنبیہ و تہدید اور سزا کے
زور سے اُن کو اُس کے دل میں ٹھونس دیتے ہیں۔ جس علم کی بچّہ کو خواہش

ہے اُس علم سے تو اُس کو محروم رکھتے ہیں اور جس علم کو وہ ہضم نہیں کرسکتا اُس کو بچّے کے اندر ٹھونس کر بھر دیتے ہیں۔ اس سے بچّے کے قویٰ کی حالت خراب ہو جاتی ہی اور نتیجہ یہ ہوتا ہی کہ اُس کو بالعموم علم ہی سے نفرت پیدا ہو جاتی ہی۔ اور جب بچّہ کسی بات کو بغیر سمجھائے نہیں سمجھ سکتا اور محض ایک کاہل و مجہول آدمی کی طرح تعلیم حاصل کرتا ہی (اور نتیجہ یہ ہی کچھ تو اُس احمقانہ کاہلی کا جو ہم نے پیدا کی ہی اور کچھ تحصیل علم میں اُس کی نالیاقتی کا جو ہمیشہ بڑھتی رہتی ہے) تو ہم یہی نتیجہ نکالتے ہیں کہ تعلیم کو بالضرور اسی طریقہ کے موافق جاری رکھنا چاہیئے۔ ہم خود اپنے طریقۂ تعلیم کی وجہ سے طلبہ کو بےلبسی اور بےکسی کی ترغیب دیتے ہیں اور اُس طریقۂ تعلیم کو اس لاچاری اور بےکسی کی علّت قرار دیتے ہیں۔ پس صاف ظاہر ہی کہ جس طریقۂ تعلیم کی ہم حمایت کر رہے ہیں اُس کے خلاف نیم ملّاؤں کے تجربے کو پیش کرنا معقول بات نہیں ہی۔ اور جو شخص یہ بات سمجھتا ہے وہ یہ بھی سمجھ لے گا کہ ہم ہر حالت میں بےکھٹکے قدرت کی تربیت کی پیروی کر سکتے ہیں۔ یعنی نفس ناطقہ جس طرح ابتدائی مدارج میں بطور خود نشو و نما حاصل کرتا ہے اسی طرح اگر سلیقہ سے انتظام کیا جائے تو مدارج مابعد میں بھی بطور خود نشو و نما حاصل کر سکتا ہی۔ اور یہ بات بھی سمجھ لے گا کہ یہی ایسا کام ہی جس کے کرنے سے نفس ناطقہ میں نہایت اعلیٰ درجہ کی قوّت اور چستی و چالاکی پیدا ہو سکتی ہی۔

(۲) طریقۂ تعلیم ایسا ہونا چاہیئے جس سے بچّوں کو فرحت و مسرّت حاصل ہو۔

(۷) جس آخری معیار پر تربیت کی کسی تدبیر کو پرکھنا چاہیئے وہ یہی سوال ہونا چاہیئے کہ "آیا اُس تدبیر سے شاگردوں میں جوشِ مسرّت پیدا ہوتا ہی یا نہیں" جب ہم کو اس بات میں شبہ ہو کہ آیا فلاں طریقہ یا انتظام بہ نسبت کسی دوسرے طریقہ یا انتظام کے۔ اصول متذکرۂ بالا سے زیادہ تر موافقت رکھتا ہے یا نہیں تو ہم اس معیار پر بےکھٹکے قایم رہ سکتے ہیں۔ اگر اصول کی حیثیت سے غور کرنے کے بعد کوئی

مجوزہ نصاب سب سے بہتر معلوم ہو۔ مگر اُس سے بچّوں کو کوئی دلچسپی پیدا نہ ہو یا مقابلہ کسی دوسرے نصاب کے کم دلچسپی پیدا ہو۔ تو بھی اُس کو ترک کر دینا چاہیئے۔ کیوں کہ بچے کی عقلی فطرت ہمارے دلائل کی نسبت زیادہ قابل اعتبار ہے، قوائے تعلّم کی بابت ہم اس عام قانون پر پُورا بھروسہ کر سکتے ہیں کہ اگر باقاعدہ شرائط پائی جائیں تو صحت بخش عمل موجب فرحت ہوتا ہی اور جس عمل سے تکلیف ہوتی ہی وہ صحت بخش نہیں ہوتا۔ اگرچہ جذباتی فطرت کو اس قانون کے ساتھ بالفعل پوری موافقت نہیں ہے تاہم عقلی فطرت یا کم از کم اُس کے وہ حصّے جن کا ظہور بچّے کی طبیعت میں ہوتا ہی اس قانون سے قریب قریب پوری موافقت رکھتے ہیں۔ یہ جو خاص خاص مضمونوں سے بچّوں کو نفرت ہوتی ہی اور جس سے معمولی مُعلّم دق آجاتا ہے۔ یہ نفرت خلقی اور طبعی نہیں ہے۔ بلکہ مُعلّم کے ناوانش مندانہ طرز تعلیم کا نتیجہ ہوتا ہے۔ فیلن برگ[1] کہتا ہی کہ "تجربہ نے مجھے سکھا دیا ہی کہ نوعمر اشخاص میں سُستی و کاہلی کا پایا جانا اُس چُستی و چالاکی سے جس کی طرف اُن کو قدرتی میلان ہوتا ہے براہ راست اس قدر مخالف ہی کہ وہ سُستی و کاہلی تقریباً ہمیشہ کسی نہ کسی جسمانی نقص سے پیدا ہوتی ہی۔ بجز اُس صورت کے کہ خراب تعلیم کا نتیجہ ہو۔ اور قدرتی چستی و چالاکی جس کی طرف بچّے اس طرح مائل ہوتے ہیں گویا اُن ہی مسرّتوں کا حاصل کرنا ہی جو قویٰ کی صحت بخش ورزش سے حاصل ہوتی ہیں۔ یہ سچ ہے کہ بعض اعلیٰ درجہ کے قوائے عقلیہ جنھوں نے اب تک نسل انسانی میں بہت کم نشو و نما پایا ہی اور جو نہایت اعلیٰ درجہ کے ترقی یافتہ لوگوں ہی میں کسی قدر زیادہ مقدار میں خلقی طور پر موجود ہوتے ہیں۔ وہ قویٰ اس قدر محنت کی طرف مائل نہیں ہوتے جو اُن سے لی جاتی ہے۔ مگر چوں کہ یہ قویٰ نہایت پیچیدہ ہوتے ہیں اس لیے باقاعدہ طریقۂ تربیت میں اُن کا عمل سب سے پیچھے ہوتا ہے اور جب تک طالب علم اُس

---

[1] فیلن برگ ملک سوئٹزرلینڈ کا باشندہ اور طریقۂ تعلیم صنعت و حرفت کا ماہر تھا۔ ۱۷۷۱ء میں پیدا ہوا۔ اور ۱۸۴۴ء میں فوت ہوا۔ مترجم

عمر تک نہ پہنچ جائے جس عمر میں محرکات بعیدہ کو کام میں لایا جا سکتا ہے اور بالواسطہ
خوشی کا موازنہ بلاواسطہ خوشی کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔ اُس وقت تک نوع انسان میں
اُن قویٰ سے کوئی کام نہیں لیا جائیگا۔ مگر اُن پیچیدہ قوتوں کی نسبت جو قوتیں درجہ میں
کم ہیں اُن کا باقاعدہ محرک وہ خوشی ہے جو اُن قوتوں کو عمل میں لانے سے براہ راست
حاصل ہوتی ہے۔ اور اگر عمدہ انتظام ہو تو صرف اسی محرک کی ضرورت ہے جب اس کو چھوڑ کر
کوئی دوسرا محرک ہم کو اختیار کرنا پڑے تو اس کے تعلق ہم کو بطور ثبوت کے یہ بات تسلیم کر لینی
چاہیئے کہ ہم غلط راہ پر چل رہے ہیں۔ تجربہ روزمرہ زیادہ صفائی سے یہ بات ثابت کرتا
ہے کہ ہمیشہ ایسا طریقہ دریافت کرنا چاہیئے جو دلچسپی بلکہ خوشی کا بھی پیدا کرنے والا ہو۔ باقی تمام
معیاروں کی رو سے بھی یہی طریقہ صحیح ثابت ہوتا چلا آیا ہے۔

اگر ان اصول ہدایت کو اسی مجرد شکل میں چھوڑ دیا جائے تو اکثر آدمی اُن کو بنا بریں
کم وزن سمجھیں گے۔ پس کچھ تو اس غرض سے کہ اُن کے اطلاق کو مثالوں کے ذریعہ سے
واضح کر دیا جائے اور کچھ اس نظر سے کہ چند خاص تجاویز پیش کی جائیں اب ہم تعلیم کے
خیالی منصوبہ سے اُس کے عملی پہلو کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

پستالوزی کی اس رائے سے سب کو اتفاق ہے کہ بچوں کی تعلیم شیرخواری ہی کے زمانہ سے شروع ہونی چاہیئے

پستالوزی کی یہ رائے تھی کہ کسی قسم کی تعلیم گہوارہ ہی سے شروع ہو جانی چاہیئے
اور اُس کے زمانہ سے لے کر آج تک یہی رائے ترقی پر ہے۔ جس شخص نے ذرا غور و
خوض سے شیرخوار بچہ کو دیکھا ہے کہ وہ کھلی آنکھوں گھور گھور کر گرد و پیش کی چیزوں پر
نظر ڈالتا ہے وہ اس بات کو بہت اچھی طرح جانتا ہے کہ تعلیم ابتدائی عمر میں بالضرور
شروع ہو جاتی ہے خواہ ہم تعلیم کا ارادہ کریں خواہ نہ کریں۔ اور یہ جو بچہ ہر چیز کو جو اُس
کے ہاتھ آ جاتی ہے۔ ٹٹولتا۔ چھوتا اور چوستا ہے۔ ہر ایک آواز کو منہ کھول کر سنتا
ہے یہ اُس سلسلہ کے ابتدائی درجے ہیں جو بن دیکھے سیاروں کی تحقیقات، حسابی کلوں
کی ایجاد، بڑے بڑے مصوری کے کاموں۔ یا نغمات خوش آہنگ اور

موسیقی ناٹکوں کی تصنیف پر جا کر منتہی ہوتا ہے چونکہ اوّل ہی سے قویٰ کا یہ عمل قدرتی اور راٹل ہوتا ہے اس لیے سوال یہ ہے کہ "آیا ہم کو بچوں کے لیے مختلف مواد کی ایک ایسی مقدار بہم پہونچانی چاہیئے جن پر وہ اپنی قوتوں کی مشق کر سکیں"۔ اور یہ جو سوال کیا گیا ہے مثبت جواب کے سوا اس کا کوئی جواب نہیں ہوسکتا۔ مگر جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے پستالوزی کے خیال کے ساتھ موافقت کرنے میں یہ بات داخل نہیں ہے کہ اس کے عمل کے ساتھ بھی موافقت کرنی چاہیئے۔ اور اس مطلب کی ایک مثال بھی موجود ہے۔ بچوں کی تعلیم پر بحث کرتے ہوئے پستالوزی یہ کہتا ہے:۔

"اس لیئے بچوں کی کتاب میں زبان کی تمام آوازیں شامل ہونی چاہئیں اور ہر ایک خاندان میں بچوں کو شیر خوارگی ہی کے زمانہ سے اُن آوازوں کی تعلیم دینی چاہیے جو بچہ اپنی بچوں کی کتاب یاد کرلے اس کو چاہیئے کہ گہوارہ کے شیر خوار بچے کے سامنے اُن کو دہرائے قبل اس کے کہ وہ اُن میں سے کسی ایک آواز کا تلفظ ادا کرسکے تاکہ بار بار دہرانے سے اُس کے دل پر اُن آوازوں کا گہرا نقش جم جائے"۔

اگر اس طریقہ کو "دایہ خانہ کے قاعدہ" (تربیت اطفال) کی تجاویز کے ساتھ شامل کر دیا جائے جو پستالوزی کی کتاب "مدر زمینول" (ماں کی کتاب) میں درج ہیں اور جن میں اُس نے اسماء، مقامات، تعلّقات، اعداد، خواص، اور اعضاء جسم کے فوائد کو ابتدائی سبقوں میں رکھا ہے تو یہ بات صاف ظاہر ہو جائے گی کہ ابتدائی عقلی نشوونما کی بابت پستالوزی کے خیالات اس قدر خام تھے کہ وہ عاقلانہ تدبیریں نہیں نکال سکتا تھا۔ آؤ اب اُس طریقۂ تعلیم پر غور کریں جس کی ہدایت سائیکالوجی کرتی ہے۔

نہایت ہی ابتدائی عمر میں جن خیالات سے نفس متاثر ہوسکتا ہے وہ ناقابل تحلیل (مفرد) احساسات ہیں جو مزاحمت، روشنی، آواز وغیرہ سے پیدا ہوتے ہیں

...وں کی تعلیم ...ابتدائی ...ت کی نسبت ...الوزی کی آ... ...راس ہوئے ...غلطی۔

...تشریح اس امر ...کہ شیر خوار بچے ...اسات یوں

سے متصل باتوں تک بتدریج ترقی کرتا ہے

یہ بات ظاہر ہے کہ شعور کی وہ حالتیں جو قابل تحلیل یا مرکب ہیں اُن کا وجود شعور کی اُن مفرد حالتوں سے مقدم نہیں ہو سکتا جن سے وہ مرکب ہیں۔ جب تک روشنی کی مختلف درجوں اور صفتوں سے یا مزاحمت کی مختلف سختیوں سے کسی قدر واقفیت حاصل نہ ہو جائے اُس وقت تک شکل کا تصوّر نہیں ہو سکتا۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ ہم مرئی شکل کو طرح طرح کی روشنی کے ذریعہ سے اور شکل ممکن المس کو طرح طرح کی مزاحمت کے ذریعے سے شناخت کرتے ہیں اور یہ مسئلہ مدت سے لوگوں کو معلوم ہے۔ علیٰ ہذا القیاس کوئی مرکب آواز اُس وقت تک محسوس نہیں ہو سکتی جب تک کہ اُن مفرد آوازوں کو نہ سیکھ لیں جن سے وہ آواز مرکب ہے اور باقی تمام محسوسات میں بھی ضرور یہی کیفیت ہو گی۔ پس ترقی کے اس لازمی قانون کی پیروی کرکے کہ "ترقی سادہ صورت سے شروع ہو کر پیچیدہ صورت تک پہونچتی ہے" ہم کو چاہیئے کہ شیر خوار بچّہ کے واسطے ایسی چیزوں کا کافی ذخیرہ بہم پہونچا دیں جن میں مختلف درجہ اور مختلف قسم کی مزاحمت پائی جائے اور ایسی چیزوں کا کافی ذخیرہ جو اپنی مقدار اور صفات کے لحاظ سے مختلف قسم کی روشنی پھینکیں اور ایسی آوازوں کا کافی ذخیرہ جو اپنی بلندی و پستی اور اپنے لہجہ میں ایک دوسرے سے مختلف ہوں۔ اگر لوگوں کو یہ بات یاد دلائی جائے کہ "چھوٹے بچّہ" کو اپنے کھلونوں کو منھ سے کاٹنے سے، بھائی کی صدری کے چمکدار بٹنوں کو ٹٹولنے سے اور باپ کی موچھوں کو کھینچنے سے کس قدر خوشی حاصل ہوتی ہے"! "کسی بھڑک دار رنگین شئے کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے میں وہ کیسا محو ہو جاتا ہے" اور محض اُس کے چمک دار رنگوں کی وجہ سے اُس پر لفظ "اچھی" کا اطلاق کرتا ہے اگر وہ اُس لفظ کا تلفّظ ادا کر سکتا ہے اور" اپنی انّا کی بکو اُس سُننے سے کسی ملاقاتی کی چٹکی بجانے، یا کسی آواز کے سُننے سے جو اُس نے پہلے نہیں

سُنی اُس کا چہرہ ہنسی کے مارے کیسا کھل جاتا ہے"۔ تو وہ سب اس بات کو خوب سمجھ لیں گے کہ یہ نتیجہ، جو بُرہانِ لمّی سے نکلتا ہے، شیر خواروں کی فطرت اُس نتیجہ کی کیسی پُوری پُوری تصدیق کرتی ہے۔ خوش قسمتی سے دایہ خانہ کے معمولی دستورالعمل تعلیم کی ان ابتدائی ضروریات کو ایک معقول درجہ تک پورا کرتے ہیں۔ مگر ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے اور اس کام کا پُورا کرنا اوّل اوّل جیسا ضروری معلوم ہوتا ہے اُس سے زیادہ ضروری ہے۔ ہر ایک قوّت اُس قدرتی عمل کے زمانہ میں جو اُس کے نشو ونما کے ساتھ ہوتا رہتا ہے بہ نسبت کسی دوسرے زمانہ کے زیادہ قوی اور گہری اثرات کو قبول کر سکتی ہے اس کے علاوہ چوں کہ ان نہایت ہی سیدھے سادے ابتدائی اصول سے پوری واقفیت حاصل کرنی پڑتی ہے۔ اور چوں کہ اس واقفیت کے حصول میں خواہ کبھی حاصل ہو وقت ضرور لگتا ہے۔ اس لئے وقت کی کفائت اسی میں ہے کہ بچپن کے اس ابتدائی زمانہ کو جس میں کوئی دوسرا عقلی عمل ممکن نہیں ہے۔ صرف اسی کام میں مصروف رکھا جائے کہ بچوں کو اُن اصول اور اُن اصول کی مختلف صورتوں سے پوری واقفیت حاصل ہو جائے۔ اس امر کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے کہ جن خیالات کو ہر ایک بچہ بڑی شوق سے ذہن نشین کرتا ہے۔ اگر اُن خیالات کو باقاعدہ طور پر مہیا کر دیا جائے تو اس سے بچہ کو ہمیشہ ایسا حظ حاصل ہوتا ہے جس سے اُس کے مزاج اور صحت دونوں کو ترقی ہوتی ہے۔ اگر یہاں کچھ گنجایش ہوتی تو بعض ایسی تجویزوں کا درج کرنا مناسب ہوتا جن میں یہ بات بتائی جاتی کہ اُن سیدھے سادے ادراکات کا زیادہ باقاعدہ بندوبست کیوں کر ہو سکتا ہے۔ مگر صرف اسی بات کا بتا دینا کافی ہے کہ جس انتظام میں اس عام قانونِ ارتقا کو تسلیم کیا گیا ہو کہ "مبہم اور غیر معیّن چیزوں سے ترقی کر کے قطعی اور معیّن چیزوں تک پہنچتے ہیں" اُس انتظام کی بنیاد اس نتیجہ پر رکھنی چاہیئے کہ "ہر ایک قوّت کے نشو ونما میں۔ اوّل اوّل اُن ہی خیالات میں

تمیز کرنی چاہیئے جن میں صاف نمایاں فرق نظر آتا ہو۔ اور اسی وجہ سے جو آوازیں بلندی اور اتار چڑھاؤ میں بہت مختلف ہوں جو رنگ ایک دوسرے سے بہت مختلف ہوں۔ اور جو چیزیں سختی یا ساخت میں نہایت نامشابہ ہوں۔ اُن کو سب سے پہلے مہیّا کرنا چاہیئے۔ اور جو خیالات باہم دگر زیادہ قریبی تعلق رکھتے ہیں اُن خیالات تک ہر حالت میں آہستہ آہستہ بہ تدریج پہنچنا چاہیئے۔

زمانۂ شیرخواری کے بعد اسباق الاشیاء کی تعلیم تربیت جو اس کے لئے نہایت ضروری ہے اور اسباق الاشیاء کی تعلیم کا طریقہ

اب ہم اسباق الاشیاء کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ سبق جو اس کی اس ابتدائی تربیت کا قدرتی سلسلہ ہیں۔ اس بارہ میں ہم کو یہ بیان کرنا ہے کہ جو طریقہ تعلیم عموماً اختیار کیا گیا ہے وہ قدرت کے طریقہ کے بالکل خلاف ہے جس کا ظہور زمانۂ شیرخواری۔ زمانۂ بلوغ، اور طریق تمدن میں یکساں ہوتا رہا ہے۔ مارسل کہتے ہیں کہ "بچے کو یہ بات دکھانی چاہیئے کہ ایک شے کے تمام حصے کس طرح ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں وغیرہ"۔ مگر ان اسباق الاشیاء کی مختلف کتابوں میں محض حالات کی فہرستیں ہوتی ہیں اور جو شے بچے کے سامنے رکھی جاتی ہے اُس کی بابت وہ حالات اُس کو بتا دیئے جاتے ہیں۔ اب اس بات کو سمجھنے کے لئے کہ قوتِ گویائی کے حاصل ہونے سے پہلے چیزوں کی بابت جو کچھ علم حاصل ہوتا ہے وہ از خود حاصل ہوتا ہے۔ ہم کو شیرخوار بچے کی روزانہ زندگی پر صرف ایک نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔ مثلاً سختی اور وزن کی صفتیں جو خاص خاص صورتوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ خاص شخصوں کا خاص شکلیں اور خاص رنگ رکھنا خاص صورتوں کے جانوروں کا خاص قسم کی آوازیں نکالنا۔ یہ ایسے مظاہر قدرت ہیں جن کا مشاہدہ بچہ خود بخود کرتا ہے۔ بڑی عمر میں بھی جب کہ معلّم پاس نہیں ہوتے یہ بات ضرور ہے کہ جو مشاہدے اور نتیجے ہر گھڑی ہدایت کے واسطے درکار ہیں اُن کو بغیر کسی کی مدد کے حاصل کیا جائے اور جس قدر

صحت اور تکمیل کے ساتھ اُن کو حاصل کیا جائے گا اُسی قدر زندگی کی کامیابی کا اُن پر دار و مدار ہوگا پس کیا یہ بات قرین قیاس ہو کہ جس حالت میں شیرخوار بچہ اور بڑا آدمی دونوں بار بار اُسی طریقہ پر عمل کرتے ہیں جو جملہ بنی نوع انسان کی ترقی میں ظاہر ہوتا رہتا ہو۔ شیرخواری اور جوانی کے درمیان زمانہ میں اس کے بالعکس طریقہ اختیار کیا جائے؟ اور وہ بھی ایسی سیدھی سادی بات میں جیسا کہ خواص اشیاء کا علم حاصل کرنا؟ برعکس اس کے کیا یہ بات صاف ظاہر نہیں ہو کہ ہر حالت میں ایک ہی طریقہ کی پابندی رکھنی لازم ہو؟ اور کیا قدرت ہمیشہ جبراً اسی طریقہ کی طرف ہم کو ہدایت نہیں کرتی اگر ہم میں اتنی ہی عقل ہو کہ اس کو سمجھیں اور اتنا انکسار ہو کہ اُس کو اختیار کریں؟ اس سے زیادہ صاف اور صریح بات اور کیا ہو گی کہ بچے عقلی ہمدردی چاہتے ہیں؟ غور کرو کہ شیرخوار بچہ جو تمہاری گود میں بیٹھا ہوا ہے اُس کھلونے کو۔ جو اُس کے ہاتھ میں ہے۔ تمہارے مُنہ کی طرف کیا گھمائے دیتا ہو اس غرض سے کہ تم اُس کو دیکھو۔ دیکھو جب وہ میز پر اپنی گیلی اُنگلی سے ایک خاص آواز پیدا کرتا ہے تو کیا مُڑ مُڑ کر تم کو دیکھتا ہو۔ پھر ایسا ہی کرتا ہو اور پھر تم کو دیکھتا ہے۔ گویا حتی الامکان صاف طور پر بہ زبان حال یہ کہتا ہے کہ اس نئی آواز کو سنو۔ غور کرو کہ بڑی عمر کے بچے کمرہ میں آکر بول اُٹھتے ہیں۔ اماں۔ دیکھو کیسی عجیب چیز ہو۔ اماں۔ اس چیز کو دیکھو۔ اماں۔ اُس چیز کو دیکھو۔ یہ ایسی عادت ہے کہ وہ اس کو جاری رکھنا چاہتے ہیں اگر نادان ماں اُن سے یہ نہ کہہ دے کہ ”تم مجھے دق نہ کرو“ مشاہدہ کرلو کہ جب چھوٹے بچے انّا کے ساتھ باہر سیر کو جاتے ہیں تو ہر ایک بچہ اُس نئے پھول کو لے کر۔ جو اُس نے توڑا ہو۔ دوڑ کر انّا کے پاس آتا ہو تاکہ اُس کو دکھائے کہ وہ پھول کیا خوب صورت ہو۔ اور اُس سے بھی کہلوائے کہ ہاں خوب صورت ہو۔ غور کرو کہ کس ذوق و شوق اور چرب زبانی سے ہر ایک لڑکا کسی ایسی نئی چیز کا حال بیان کرتا ہے جس کو وہ دیکھ آیا ہے۔ اگر اُس کو

کوئی شخص ایسا مل جائے جو ذرا دلچسپی سے اُس کی بات پر توجہ کرے۔ کیا یہ بات نہیں ہے کہ یہ نتیجہ سطح پر موجود ہے (اور اُس کو نکالنے کے لئے غوص کی ضرورت نہیں ہے) کیا یہ بات صاف ظاہر نہیں ہے کہ اسی عقلی فطرت کے موافق ہم کو اپنا طریقہ اختیار کرنا چاہیئے۔ یعنی ہم کو بھی قدرتی عمل کے ساتھ ہمدردی کرنی چاہیئے یا یوں کہو کہ بچّہ ہر شے کی بابت جو کچھ ہم سے بیان کرے اُس کو کان لگا کر سُننا چاہیئے۔ اُس کو اس امر کی ترغیب دینی چاہیئے کہ اُس شے کی بابت جو بات اُس کے خیال میں آسکتی ہے اُس کو بیان کرے۔ کبھی کبھی اُس کی توجہ کو ایسی باتوں کی طرف مائل کرنا چاہیئے جو اب تک اُس کے مشاہدہ میں نہیں آئی ہیں تاکہ جب کبھی وہی باتیں دوبارہ پیش آئیں تو اُس کو بذات خود اُن پر غور کرنے کے لئے ہدایت ہو۔ اور اسی قسم کی مکمل تحقیقات کے لئے اشیا کا نیا سلسلہ رفتہ رفتہ مہیا کرتے یا بتاتے رہنا چاہیئے۔ اب غور کرو کہ سمجھ دار ماں اس طریقہ کی رو سے اپنے سبقوں کا انتظام کس طرح کرتی ہے۔ وہ اپنے چھوٹے لڑکے کو سہل تر اوصاف سختی۔ نرمی۔ رنگ۔ ذائقہ۔ ڈیل ڈول سے بہ تدریج واقفیت پیدا کراتی ہے اور وہ دیکھتی ہے کہ اس کام میں بچّہ شوق سے اُس کو مدد دیتا ہے۔ ایک چیز لا کر اُس کو بتاتی ہے کہ یہ چیز لال ہے اور دوسری چیز لا کر کہتی ہے اس کو چھو کر دیکھو یہ سخت ہے جوں ہی کہ وہ ان خاصیتوں کے لئے اُس کو الفاظ بتا دیتی ہے۔ جب بچّہ کوئی نئی چیز اُس کے پاس لاتا ہے اور وہ اُس نئی چیز میں کسی نئی خاصیت پر اُس کو توجّہ دلاتی ہے تو وہ اس بات کی احتیاط رکھتی ہے کہ اُس نئی خاصیت کو اُن چیزوں کے تعلق سے بیان کرے جن کو بچّہ پہلے سے جانتا ہے تاکہ وہ نقل کرنے کے قدرتی میلان کی وجہ سے یکے بعد دیگرے اُن کو دُہرانے کا عادی ہو جائے۔ جب رفتہ رفتہ ایسی صورتیں پیش آتی ہیں کہ جن خاصیتوں سے بچّہ واقف ہو گیا ہے اُن میں سے

ایک یا زیادہ خاصیتوں کا نام لینا بھول جاتا ہے تو وہ بچّہ سے پوچھتی ہے "یہ چیز جو تمہارے پاس ہے اس میں کوئی اور خاصیت تو نہیں ہے جس کو تم بتا سکتے ہو" عموماً بچّہ اس سوال کو نہیں سمجھتا تو تھوڑی دیر تک اُس کو ششدر و حیران رکھنے کے بعد خود بتا دیتی ہے اور شاید اس کی ناکامیابی پر ذرا اُس کی ہنسی بھی اڑاتی ہے۔ چند مرتبہ اس طرح اعادہ کرنے سے بچّہ کو معلوم ہو جاتا ہے کہ کیا کرنا چاہیئے۔ جب دوبارہ ماں بچّہ سے کہتی ہے کہ "اس چیز کی بابت جو کچھ تم نے بیان کیا ہے میں اُس سے کسی قدر زیادہ جانتی ہوں" تو بچّہ کا غرور جوش میں آتا ہے۔ وہ غور سے اُس شے کو دیکھتا ہے اور اُن تمام باتوں پر غور کرتا ہے جو اُس نے سُنی ہیں۔ اور چوں کہ یہ سوال آسان ہوتا ہے فوراً اُس کو حل کر لیتا ہے۔ وہ اپنی کامیابی پر خوشی کے مارے پھولا نہیں سماتا اور ماں اُس کے ساتھ ہمدردی کرتی ہے۔ وہ اپنی قوتوں کو معلوم کر کے خوش ہوتا ہے اور ہر ایک بچّہ ایسا ہی کرتا ہے۔ وہ اور زیادہ فتوحات کی خواہش اور زیادہ چیزوں کی جستجو کرتا ہے تاکہ اُن کا حال بھی ماں سے کہدے۔ جوں جوں اُس کی قوتیں نشو و نما پاتی ہیں وہ اُس کی فہرست میں یکے بعد دیگرے نئی صفتوں کا اضافہ کرتی جاتی ہیں۔ سختی اور نرمی سے کھُردرے پن اور ہمواری تک۔ رنگ سے جلا تک۔ اجسام مفردہ سے اجسام مرکبہ تک بہ تدریج آگے بڑھتی ہے یعنی جوں جوں بچّہ کافی استعداد حاصل کرتا ہے اپنے سوال کو ہمیشہ مشکل کرتی رہتی ہے، اس کی توجہ اور حافظہ پر ہمیشہ زیادہ زور ڈالتی رہتی ہے۔ اُس کے واسطے ایسے نئے خیالات مہیا کرتی ہے جن کو وہ بخوبی سمجھ سکتا ہے۔ اُس کے ذوق و شوق کو ہمیشہ قایم رکھتی ہے اور اُن فتوحات سے۔ جو چھوٹی چھوٹی مشکلوں کو حل کرنے سے حاصل ہوتی ہیں ہمیشہ اُس کا دل خوش کرتی رہتی ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ اس کام میں محض اُس قدرتی عمل کی پیروی کرتی ہے۔ جو ذرا پہلے بچپن کے زمانہ میں جاری تھا۔ یا یوں کہو

وہ صرف اس بات میں مدد دیتی ہے کہ لڑکا خود بخود ترقی کرے۔ اور جس ڈھنگ پر بچہ فطرۃً ماں کے ساتھ برتاؤ کرتا ہے اُسی ڈھنگ پر اُس کو مدد دیتی ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ جو طریقہ وہ اختیار کرتی ہے مشاہدہ کی عادت پیدا کرنے کے لئے وہی طریقہ سب سے بہتر ہے۔ اور ان سبقوں کا مقصد یہی بیان کیا جاتا ہے۔ اگر بچہ کو ایک چیز بتا دیں اور دوسری چیز دکھا دیں تو یہ بات طریق مشاہدہ کی تعلیم نہیں ہے بلکہ اُس کو ایسا بنا دیتا ہے کہ محض دوسرے شخص کے مشاہدوں کو حاصل کر سکے۔ یہ ایسی کارروائی ہے جس سے بذات خود تعلیم حاصل کرنے کی قوتیں قوی نہیں ہوتیں بلکہ ضعیف ہو جاتی ہیں اس کی وجہ سے بچہ اُن خوشیوں سے محروم رہ جاتا ہے جو کامیاب مساعی سے پیدا ہوتی ہیں یہ کارروائی نہایت دلکش علم کو رسمی تعلیم کی شکل میں پیش کرتی ہے اور اُس بے اعتنائی بلکہ نفرت کو پیدا کرتی ہے جو بسا اوقات بچوں کو ان اشیا کے سبقوں سے ہوتی ہے۔ برعکس اس کے طریقہ مذکورۂ بالا کی پیروی کرنا گویا عقل کو اُس کی مناسب غذا تک لے جاتا ہے۔ عقلی اشتہا کے ساتھ اُس کے قدرتی اوصاف یعنی خود پسندی اور ہمدردی کی خواہش کو بھی شامل کر دینا اور ان سب کو ملا کر بچہ کو پوری طرح توجہ کرنے کی ترغیب دینا ہے جس سے صاف اور کامل ادراک حاصل ہو جاتا ہے۔ اور گویا نفس کو شروع ہی سے اس کام کا عادی بنا دیتا ہے جو انجام کار اُس کو ضرور کرنا پڑے یعنی اپنی مدد آپ کرنا۔

اشیا کی تعداد اور مدت تعلیم دونوں کے اعتبار سے اسباق الاشیا کے سلسلہ کو وسعت دینی چاہیئے

نہ صرف اس بات کی ضرورت ہے کہ اسباق الاشیا کی تعلیم مروجہ عام طریقے سے بالکل مختلف طریقہ پر ہونی چاہیئے بلکہ ضرورت اس امر کی بھی ہے کہ آجکل کی بہ نسبت ان سبقوں کو اشیا کے بہت زیادہ وسیع سلسلہ تک وسعت دی جائے اور بہت زیادہ عرصہ تک اُن کی تعلیم جاری رکھی جائے۔ ان سبقوں کو گھر کی چیزوں تک محدود نہیں رکھنا چاہیئے بلکہ کھیتوں۔ جھاڑیوں۔ پتھر کی کانوں۔ اور ساحل بحر کے

سبقوں کو بھی اُن میں شامل کرنا چاہیئے۔ ایسا نہ ہو کہ ابتدا ہی میں ان سبقوں کو بند
کردیا جائے بلکہ جوانی کے زمانہ میں بھی اُن کو بدستور جاری رکھنا چاہیئے تاکہ
یہی سبق نامعلوم طور پر نیچرل ہسٹری[1] (علم حیوانات) اور عالم سائنس کی تحقیقات تک
پہنچ جائیں۔ یہاں بھی ہم کو قدرت ہی کی ہدایتوں کی پابندی کرنی پڑتی ہے۔ نئے
پھولوں کو جمع کرنے سے نئے کیڑوں کو غور سے دیکھنے سے یا لنکریوں اور
سیپیوں کو اکٹھا کرنے سے بچّوں کو جو لطف حاصل ہوتا ہے اُس سے زیادہ گہرا
لطف کہاں دیکھا جاسکتا ہے؟ اور کون ہے جو اس بات کو نہیں سمجھ سکتا کہ اگر بچوں کے
ساتھ ہمدردی کی جائے تو ان چیزوں کی ساخت اور صفات کی تحقیقات جہاں تک
چاہیں اُن سے کرا سکتے ہیں؟ ہر ایک عالم نباتات نے جس کو جنگلوں اور باغ
کی روشوں میں بچّوں کو اپنے ساتھ لے جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ اس بات کو ضرور دیکھا
ہوگا کہ بچے اُس کے کاموں میں کیسی سرگرمی سے شریک ہوتے ہیں۔ کیسے اشتیاق
سے اُس کے واسطے پودوں کو تلاش کرکے لاتے ہیں جب وہ پودوں کو دیکھتا بھالتا ہے
تو کیسے غور سے دیکھتے ہیں اور سوالوں سے اُس کو کیا پریشان کر دیتے ہیں "قدرت کے
خادم اور ترجمان" یعنی حکیم بیکن کا پکا مقلد اس بات کو معلوم کرلے گا کہ جو طریقہ تربیت
اس طرح بتایا گیا ہے اُس کو عجز و انکسار کے ساتھ اختیار کرنا چاہیئے۔ سادہ چیزیں جن
کی ساخت پیچیدہ نہیں ہے۔ جب بچہ اُن چیزوں کی زیادہ سہل خاصیتوں سے واقف
ہو جائے تو اُس سے اُسی ترکیب سے اُن چیزوں کی پوری جانچ پرتال کرانی چاہیئے
جن کو وہ اپنی روزانہ سیر میں جمع کرتا ہے یعنی جو چیزیں زیادہ مشکل نہیں ہیں سب

---

[1] نیچرل ہسٹری کے لفظی معنی قدرتی تاریخ ہیں۔ ابتدا میں اس کا اطلاق اس علم پر کیا جاتا تھا جس میں جملہ موجودات قدرت کا بیان ہو۔ مگر اب اس کا اطلاق صرف اُن علموں پر ہوتا ہے جن میں زمین اور اُس کی پیداوار سے بحث ہوتی ہے۔ مثلاً علم نباتات۔ علم حیوانات۔ علم معدنیات۔ اور بالخصوص علم حیوانات۔ مترجم

سے پہلے اُن ہی پر توجہ کی جائے۔ مثلاً پودوں میں پنکھڑیوں کے رنگ۔ تعداد اور صورتیں۔ اور ڈنڈیوں اور پتّوں کی شکلیں۔ کیڑوں میں۔ بازوؤں۔ ٹانگوں اور موچھوں کی تعداد اور اُن کے رنگ جب یہ چیزیں پوری طرح سے سمجھ میں آجائیں اور وہ ہمیشہ اُن کا مشاہدہ کرنے لگیں۔ تو مزید واقعات بہ تدریج پیش کرنے چاہئیں مثلاً پودوں میں سٹیمن[1] اور پسٹل[2] کی تعداد۔ پھولوں کی شکلیں۔ خواہ وہ پھول سڈول طریقہ میں جڑ کے پاس سے نکلتے ہوں۔ خواہ دونوں طرف اُگتے ہوں۔ پتّوں کی ترتیب اور نوعیت۔ خواہ وہ متقابل واقع ہوں خواہ متبادل۔ خواہ ڈنڈی سے نکلتے ہوں خواہ تنے سے۔ خواہ صاف اور چکنے ہوں۔ خواہ بال دار۔ خواہ آرہ کی شکل کے ہوں خواہ دندانہ دار۔ خواہ سیپ دار مچھلی کی شکل کے ہوں۔ اور کیڑوں میں جسم کے حصّے پیٹ کے حصّے بازوؤں کے نشانات۔ ٹانگوں کے جوڑوں کی تعداد۔ اور چھوٹے اعضا کی شکلیں۔ المختصر تمام صورتوں میں جو طریقۂ تعلیم اختیار کیا جائے وہ ایسا ہونا چاہیئے جس سے بچہ کو اس بات کا حوصلہ پیدا ہو کہ جو شئے اُس کو دستیاب ہو اُس کی بابت جو کچھ بیان کر سکتا ہو بیان کرے۔ پھر جب بچہ مناسب عمر تک پہنچ جائے تو اُس کے حق میں بڑی عنایت ہوگی اگر اُسی پودوں کو محفوظ رکھنے کا ذریعہ بہم پہنچا دیا جائے جن سے اُس کو بڑی دلچسپی اس وجہ سے پیدا ہو گئی ہے کہ اُس نے اُن کا علم حاصل کیا ہے۔ اور عام تیتریوں اور پتنگوں کے بچّوں کو اُن کے تبدیل شکل کی حالت میں پالنے کے واسطے بھی ضروری سامان مہیا کر دیا جائے تو اور بھی زیادہ عنایت ہوگی۔ اس بات سے نہایت اعلیٰ درجہ کا لطف حاصل ہوتا ہے جس کی تصدیق ہم بذات خود کر سکتے ہیں اور یہ لطف برسوں تک گرمجوشی کے ساتھ جاری رہتا ہے۔ اور جب حشرات الارض

---

[1] سٹیمن پھول کے اُس حصّے کو کہتے ہیں جس سے ایک قسم کی خاک (جس کو پولن کہتے ہیں) پیدا ہوتی ہے اس خاک کو پھولوں کا مادّہ تولید سمجھنا چاہیئے۔ مترجم

[2] پسٹل پھول کا وہ حصّہ ہے جو پھول کے بیچ میں رہتا ہے۔ اور جس میں بیج محفوظ رہتا ہے۔ مترجم

تعلیم اسباق الاشیا پر ایک اعتراض اور اُس کا جواب

کو بھی جمع کر لیا جائے تو شنبہ کی سہ پہر کی سیر کا لطف بیحد بڑھ جاتا ہی نیز یہ تحقیق و تلاش (علم فزیالوجی) مطالعۂ عضویات کی گویا ایک عمدہ تمہید ہے۔

ہم بہت سے لوگوں سے یہ اعتراض سننے کے لیئے بالکل تیار ہیں کہ اُس تمام تعلیم میں وقت اور محنت کی بربادی ہی۔ اور اگر بچّوں کو کاپیاں لکھنے یا نقدی کے جدول یاد کرنے میں مصروف رکھا جائے۔ اور اس طرح اُن کو زندگی کے کاروبار کے قابل بنایا جائے تو بہت بہتر ہوگا"۔ ہم افسوس کرتے ہیں کہ اس امر کی نسبت کہ "تعلیم میں کون سی چیزیں داخل ہیں"؟ ایسے خام خیالات اور سودمندی کی بابت ایسے تنگ خیال اب تک لوگوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس بات کا ذکر جانے دو کہ باضابطہ طور پر تربیت ادراک کی ضرورت ہی اور اُس طریقہ تعلیم سے بھی قطع نظر کرو جس کی بابت ہم بہ تاکید لکھ چکے ہیں کہ وہ اُس ضرورت کو پورا کرنے میں ممد و معاون ہی تو ہم اس وجہ سے بھی اس طریقۂ تعلیم کی حمایت کے لئے تیار ہیں کہ اُس سے علم حاصل ہوتا ہی (کیوں کہ علم شئے بہ از جہل شئے) اگر لوگوں کو صرف شہری بننا ہو۔ اور یہ مقصود ہو کہ صرف اپنے ہی کھاتوں کو بیٹھے پڑھا کریں۔ اور اپنے لین دین کے سوا دوسرے خیالات سے کچھ سروکار نہ رکھیں۔ اگر یہ بات مناسب ہو کہ وہ اُس باشندہ لندن کی مانند ہو جائیں جس کا تصوّر دہقانی تفریحات کی بابت اس سے زیادہ نہیں ہی کہ چار کے باغ میں بیٹھکر حقہ کے دم لگایا کری اور جو کی شراب اُڑایا کرے یا نواب صاحب بن جائیں جن کا یہ خیال ہوتا ہی کہ جنگل ہماری شکارگاہیں ہیں۔ اور جو بوٹے ہم نے نہیں لگائی وہ محض خار و خس ہیں۔ اور جو جانوروں کی تقسیم اس طرح کرتے ہیں کہ شکار کے جانور۔ حشرات الارض اور یالتو مویشی تو البتہ کسی ایسی شئے کا سیکھنا غیر ضروری ہی جس سے غولک کو پُر کرنے یا گودام کو بھرنے میں براہ راست مدد نہ ملتی ہو۔ لیکن اگر ہمارے لئے زندگی کا زیادہ عمدہ مقصد موجود ہی بہ نسبت اس کے کہ ہم مزدور بنے رہیں۔ اگر ہمارے گرد و پیش کی چیزوں میں۔ روپیہ پیدا کرنے

کی طاقت کے سوا اور بھی فائدے موجود ہیں۔ اگر قوائے حصول دولت اور قوائے بہیمی سے بڑھکر اعلیٰ درجہ کی قوتیں موجود ہیں جن کی مشق کرنی چاہیئے۔ اگر اُن خوشیوں کی کچھ قدر و منزلت ہی جو شاعری اور آرٹ (فن) اور سائنس اور فلسفہ سے حاصل ہوتی تب تو اس بات کی ضرورت ہی کہ اُس طبعی میلان کو تقویت دی جائے جس کو ہر ایک بچہّ قدرتی خوبصورتیوں کا مشاہدہ کرنے اور قدرتی مظاہر کی تحقیقات کرنے کے لئے ظاہر کرتا ہے۔ مگر یہ جو محض سُودمندی کا خبط سمایا ہوا ہے (کہ لوگ ہر ایک شئے کی خوبی کو اُس کے ظاہری فائدہ کی کسوٹی پر کستے ہیں) جس میں اسی بات پر قناعت کی جاتی ہی کہ دنیا میں آئیں اور پھر اُس کو چھوڑ جائیں۔ اور اس بات کو معلوم نہ کریں کہ وہ کس قسم کی دُنیا ہی یا یہ کہ اُس میں کیا کیا چیزیں ہیں۔ ہم اس خیال کو اُن ہی دلائل سی باطل کر سکتے ہیں جو اُس کے حق میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔ رفتہ رفتہ یہ بات لوگوں کو معلوم ہوگی کہ قوانین زندگی کا علم بہ نسبت کسی دوسرے علم کے۔ خواہ کوئی سا علم ہو۔ زیادہ ضروری ہے یہ بات کہ قوانین زندگی نہ صرف تمام جسمانی اور عقلی عملوں کی بُنیاد ہیں بلکہ کنایتہً گھر اور بازار کے تمام کاروبار۔ تمام تجارت۔ تمام امور سلطنت اور تمام اخلاقی مسائل کی بھی بنیاد ہیں۔ اور یہ بات کہ اسی وجہ سے اُن قوانین کو سمجھے بغیر نہ تو کسی اشخص کا چال چلن ٹھیک باقاعدہ ہو سکتا ہی اور نہ کسی قوم کا۔ آخر کار یہ بات بھی معلوم ہو جائے گی کہ دنیا کی اس تمام پیچیدہ کل میں زندگی کے قوانین درحقیقت یکساں ہیں۔ اور مزید براں یہ بات ہے کہ اُن قوانین کی پیچیدہ شکلوں کو اس وقت تک ٹھیک ٹھیک نہیں سمجھ سکتے جب تک کہ مفرد شکلوں میں اُن کا مطالعہ نہ کیا جائے۔ اور جب یہ بات معلوم ہو جائے گی تو اُس وقت یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ جس بیرونی معلومات کے حاصل کرنے کے لئے بچہ بہت کچھ شوق ظاہر کرتا ہے اگر ہم اُس معلومات کے حاصل کرنے میں اُس کو مدد دیں اور اس بات کی ترغیب دیں کہ جوانی میں بھی اُس معلومات کو برابر

حاصل کرتا رہے تو یہ سمجھنا چاہیئے کہ ہم اُس کو خام مسالا جمع کرنے کی ترغیب دے رہے ہیں جس کو وہ آیندہ زمانہ میں مرتب و منضبط کر سکتا ہے یا یوں کہو کہ ایسے واقعات جمع کرنے کی ترغیب دے رہے ہیں جن کی بدولت وہ سائنس کے اُن بڑے بڑے عام اصول کو ایک نہ ایک دن پوری طرح سمجھ لے گا جن سے افعال میں باضابطہ ہدایت حاصل ہوتی ہی۔

مصوری کی تعلیم عقلی تربیت کے لئے ضروری ہے۔

عقلی تربیت، جس کا رواج آجکل ہونے لگا ہی اُس کی بابت لوگوں کے خیالات زیادہ معقول ہوتے جاتے ہیں۔ اور اس بات کی بہت سی علامتوں میں سے ایک علامت یہ ہی کہ مصوری کو عام طور پر تعلیم کا جزو تسلیم کرنے لگے ہیں۔ ہم یہ بات مکرر بیان کرتے ہیں کہ معلّم آخر کار اُس رستہ کو اختیار کرتے جاتے ہیں جس پر قدرت اُن کو متواتر توجہ دلاتی رہتی ہی۔ سب جانتے ہیں کہ گرد و پیش کے آدمیوں۔ مکانوں۔ درختوں اور حیوانوں کی تصویریں بنانے کے لئے بچے خود بخود کوشش کیا کرتے ہیں۔ اگر کوئی چیز بہتر نہیں مل سکتی تو سلیٹ پر یا کاغذ پنسل مانگا رہی جائے تو کاغذ پنسل ہی سے تصویریں بنا لیتے ہیں۔ اُن کی نہایت اعلیٰ درجہ کی خوشیوں میں ایک خوشی یہ ہے کہ اُن کو تصویروں کی کتاب دکھائی جائے اور نقل اُتارنے کا قومی میلان جو بچوں میں پایا جاتا ہی اُس سے فی الفور اُن کے دل میں یہ شوق بالعموم پیدا ہو جاتا ہے کہ خود بھی تصویریں بنائیں۔ یہ کوشش کہ جو عجیب چیز دیکھیں اُس کی تصویر اُتار لیں قوائے مُدرکہ کی ایک اور قدرتی مشق ہے۔ یعنی یہ ایسا وسیلہ ہی جس سے اس بات کی ترغیب ہوتی ہے کہ اور بھی زیادہ صحیح اور مکمل طور پر مشاہدہ کیا جائے۔ اور چوں کہ بچے اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ چیزوں کی قابل حس خاصیتوں کے متعلق اپنی تحقیقات کی طرف ہم کو متوجہ کریں اور خود بھی تصویریں بنانے کی کوشش کرتے ہیں اس لئے گویا وہ ہم سے درخواست کرتے ہیں کہ اُن کو ٹھیک اسی قسم کی تربیت

کرنی چاہیئے جس کی اُن کو سب سے زیادہ ضرورت ہی۔

بچوں کو مصوّری کی تعلیم کس طرح دینی چاہیئے

اگر معلّم نہ صرف مصوّری کو تعلیم کا جز بنانے ہیں بلکہ مصوری سکھانے کے طریقوں کو منتخب کرنے میں بھی قدرت کے اشاروں سے ہدایت حاصل کرتے تو جس قدر فائدہ اُنھوں نے پہنچایا ہے اُس سے زیادہ فائدہ پہنچا دیتے۔ وہ کیا ہے جس کی تصویر اُتارنے کے لئے بچہ سب سے پہلے کوشش کرتا ہے؟ یہ چیزیں ہیں جو بڑی ہیں۔ یہ وہ چیزیں ہیں جو رنگ میں دل کش ہیں یہ وہ چیزیں ہیں جن سے اس کی خوشی سب سے زیادہ وابستہ ہوتی ہی یعنی انسان جن سے اس نے بہت سے جذبات حاصل کئے ہیں گائیں اور کتے جن سے اُن بہت سی باتوں کی وجہ سے اُس کو دلچسپی ہے جو اُن میں پائی جاتی ہیں۔ مکانات جو ہر ساعت دیکھنے میں آتے ہیں اور اپنے تفاوتِ حصص کی وجہ سے دل پر اثر کرتے ہیں۔ اور بھلا مصوّری کا وہ کون سا عمل ہے جس سے بہت ہی زیادہ لطف بچہّ کو حاصل ہوتا ہے؟ رنگ بھرنے سے اگر کاغذ اور پنسل سے زیادہ اچھّی چیز موجود نہ ہو تو یہی چیزیں اچھّی ہیں مگر رنگوں کا بکس اور موقلم یہ تو خزانے ہیں۔ خاکہ کھینچنا رنگ بھرنے سے ٹھیک دوسرے درجہ پر ہے یعنی خاکہ زیادہ تر رنگ بھرنے کی غرض سے کھینچا جاتا ہے۔ اور اگر اُن کو تصویروں کے خاکوں کی مطبوعہ کتاب میں رنگ بھرنے کی اجازت ہو جائے تو کیسی بڑی عنایت ہے! اب سُنئے کہ مصوری کے معلّموں کو اگرچہ یہ بات قابلِ مضحکہ معلوم ہوگی جو رنگ بھرنے کی تعلیم کو پیچھے ڈال دیتے ہیں اور شکل بنانے کی تعلیم سے پہلے لکیروں کی مشق کراتے ہیں جو ایک بے لطف تعلیم ہے۔ مگر ہم کو یقین ہے کہ جو طریقہ تربیت ہم نے اس طرح بتایا ہے وہی صحیح ہے۔ اس امر کو شروع ہی سے سمجھ لینا چاہیئے کہ رنگ شکل سے مقدم ہے۔ اور جیسا کہ پہلے اشارۃً بیان کیا گیا ہے اس کی بنا دماغی کالوجی

پر ہے۔ اور شروع ہی سے یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیئے کہ جن چیزوں کی نقل کیجائے
وہ اصلی ہونی چاہیئے۔ رنگوں سے زیادہ لطف اٹھانے کا شوق نہ صرف
بچوں میں نمایاں طور پر پایا جاتا ہے بلکہ اکثر اشخاص میں یہ شوق عمر بھر قایم رہتا ہے
اور تصویر کی شکل کو پوری طرح سمجھنے کے لئے جو نسبتہً مشکل کام ہے اور دلچسپ بھی
نہیں ہے۔ اس شوق کو بطور قدرتی محرک کے ہمیشہ کام میں لانا چاہیئے اور اس کے
بعد تصویر میں رنگ بھرنے سے جو خوشی حاصل ہوتی ہے۔ اس کو خاکہ کشی کی محنت کا
آیندہ انعام سمجھنا چاہیئے۔ اور ہم کو چاہیئے کہ بچوں کو اس بات کی ڈھارس
بندھائیں کہ وہ دل کش ہوبہو تصویریں بنانے کی کوشش کریں۔ اور
اس بات کا یقین رکھنا چاہیئے کہ جس طرح وسیع تجربہ کی بدولت۔ سیدھی سادی اور
معمولی چیزیں دلچسپ بن جاتی ہیں۔ اسی طرح اُن کے لئے بھی کوشش کی جائے گی۔ اور
اسی لئے رفتہ رفتہ ایسی تصویریں بنانے لگیں گے جو اصلی چیزوں سے کسی قدر مشابہت
رکھتی ہوں۔ یہ جو شروع شروع میں بچوں کے ہاتھ کی بنی ہوئی تصویریں نہایت
بے کیتڈے ہوتی ہیں۔ یہ بات قانون ارتقا کے موافق ہے۔ اور اس
امر کی دلیل نہیں ہے کہ تصویروں کو نظر انداز کر دیا جائے۔ کچھ مضایقہ نہیں
کیسی ہی بے ہنگم شکلیں کیوں نہ بنیں۔ کچھ مضایقہ نہیں۔ کیسے ہی بھدے
اور بدنما رنگ کیوں نہ ہوں۔ سوال یہ نہیں ہے کہ بچہ عمدہ تصویریں
بنا رہا ہے یا نہیں۔ سوال یہ ہے کہ وہ اپنے قوائے عقلیہ کو ترقی دے رہا
ہے یا نہیں۔ اوّل تو اس بات کی ضرورت ہے کہ اُس کو اپنی انگلیوں پر ذرا قابو
حاصل ہو جائے۔ کچھ ادھورے اور نامکمل خیالات مشابہت کی بابت حاصل ہو جائیں
اور ان مقاصد کے لئے یہ مشق بہ نسبت کسی دوسری مشق کے بہتر ہے۔ کیوں کہ یہ قدرتی
اور دلچسپ مشق ہے۔ بچپن ہی میں باقاعدہ مصوری کے سبق ممکن نہیں ہیں

پس یہ جو بچے اپنی تربیت آپ کرنے کی کوششیں کرتے ہیں کیا ہم ان کی کوششوں کو روک دیں اور اُن کو مدد دینے سے غفلت کریں ؟ یا اس اعتبار سے کہ وہ ادرک اور قوائے دست کاری کی باضابطہ مشقیں ہیں اُن کو تقویت دیں اور سیدھی راہ پر ڈال دیں ؟ اگر سستے مصوّری کے نقشے رنگ بھرنے کے لئے۔ اور سادے خاکے حدود کی لکیروں پر رنگ پھیرنے کے لئے ہم پہنچا دیئے جائیں جس سے نہ صرف رنگ کا شعور پیدا ہو سکتا ہے جو بچّوں کی خوشی کا باعث ہے بلکہ چیزوں اور ملکوں کی حدود سے بھی ضمناً کسی قدر واقفیت حاصل ہو سکتی ہے اور موقلم کو استقلال سے حرکت دینے کی کسی قدر قابلیت بھی پیدا ہو سکتی ہے اور اگر ہم دلفریب چیزیں ہم پہنچا کر تصویریں بنانے کے اس قدرتی میلان کو قایم رکھ سکیں خواہ وہ تصویریں کیسی ہی بھدّی ہوں تو ایسا ضرور ہوگا کہ جب مصوّری کی تعلیم کا زمانہ آئیگا اُس وقت بچّوں کو ایسی سہولت پیدا ہو جائے گی جو اور کسی طرح حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔ اس سے وقت کی کفایت ہوگی اور معلم و متعلم دونوں کی محنت بچ جائے گی۔

مصوّری کا مروجہ طریقہ تعلیم اور اُس کی خرابیاں

جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے اُس سے یہ نتیجہ فی الفور نکل سکتا ہے کہ ہم کاپیوں سے تصویروں کی نقل اُتارنے کے عمل کو قابل الزام ٹھیرا لیتے ہیں۔ اور خطوط مستقیم خطوط منحنی۔ اور خطوط مرکب بنانے کی اُس معمولی تعلیم کو اور بھی زیادہ قابل الزام ٹھیراتے ہیں جس سے ابتدا کرنا بعض معلّموں کا دستور رہی۔ ہم کو افسوس ہے کہ سوسائٹی آف آرٹس (انجمن فنون) نے فن مصوّری کی ابتدائی تعلیم کے متعلق اپنے سلسلۂ کتب درسیہ میں مصوّری کی ایک ابتدائی کتاب کی تعریف کی ہے جو اصول کے لحاظ سے اُن کتابوں میں سب سے بدتر ہے جو ہماری نظر سے گذری ہیں۔ ہمارا اشارہ اُس کتاب کی طرف ہے جس کا عنوان ہے "آوٹ لائن فرام آوٹ لائن آر فرام دی فلیٹ" (خاکہ خاکے سے یا سطح مستوی سے)

اور جس کو جان ہیل بٹ تراش نے تصنیف کیا ہے۔ تمہید میں اس کتاب کی اشاعت کی غرض یہ بیان کی گئی ہے کہ طالب علم کے سامنے ایک آسان مگر منطقیانہ طریقہ تعلیم پیش کیا جائے۔ اور اس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے آغاز کتاب میں بہت سی حدود درج کی گئی ہیں۔ مثلاً

سادی لکیر مصوری میں اُس پتلے نشان کو کہتے ہیں جو ایک نقطہ سے دوسرے نقطہ تک کھینچا جائے۔

لکیریں مصوری میں اپنی خصوصیت کے اعتبار سے دو قسم کی ہو سکتی ہیں

۱۔ سیدھی لکیریں یعنی وہ نشان جو دو نقطوں کے بیچ میں چھوٹے سے چھوٹے فاصلہ تک گزرتے ہیں۔ جیسے اب (ا ــــ ب)

۲۔ یا ٹیڑھی لکیریں یعنی وہ نشان جو دو نقطوں کے بیچ میں چھوٹے سے چھوٹے فاصلہ تک نہیں گزرتے۔ جیسے ج د (ج ◡ د)

اور یہ تمہید اسی طرح متوازی الافق لکیروں، عمودی لکیروں، ترچھی لکیروں، کئی قسم کے زاویوں اور اُن مختلف شکلوں تک پہنچتی ہے جو لکیروں اور زاویوں سے بنتی ہیں۔ المختصر مصوری کی کتاب کیا ہے "شکلوں کی گرامر" ہے مع مشقوں کے۔ تعلیم کو اس خشک طریقہ سے شروع کرنا یعنی اجزائے اولیہ کی طرح تحلیل کرنا گویا مصوری کی تعلیم میں اسی طریقہ کا بحال کرنا ہے جس کو ہم زبان کی تعلیم میں رد کر چکے ہیں۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ مبہم خیالات کو چھوڑ کر قطعی خیالات سے بچوں کی تعلیم شروع کی جائے، مادیات سے پہلے عقلی و ذہنی باتوں کو رکھ دیا جائے، عملی تجارب سے پہلے ہی علمی تصورات بتا دئے جائیں۔ ہم کو اس بات کے دُہرانے کی ضرورت نہیں ہے کہ یہ طریقہ باضابطہ طریق تعلیم کا عکس ہے۔ یہ جو رواج پڑ گیا ہے کہ کسی زبان کی بول چال سکھانے سے پہلے کلمات اور اُن کے اعمال

کی تعلیم دی جاتی ہے اس کی بابت کیا خوب کہا ہے کہ یہ دستور قریب قریب ایسا ہی معقول ہے جیسا کسی شخص کو چلنے پھرنے سے پہلے ٹانگوں کی ہڈیوں۔ پٹھوں اور رگوں کی بابت بہت سے سبق پڑھا دیئے جائیں۔ اور یہی بات بہت کچھ اس تجویز کی بابت بھی کہی جاسکتی ہے کہ چیزوں کی تصویر بنانے سے پہلے اُن لکیروں کے نام اور تعریفیں یاد کرائی جائیں جو عندالتحلیل اُن چیزوں سے حاصل ہوتی ہیں۔ یہ مصطلحات ناگوار بھی ہوتی ہیں اور غیر ضروری بھی۔ مصطلحات کی تعلیم شروع ہی میں مطالعہ کو بے لطف بنا دیتی ہے۔ اور غرض اس تمام تعلیم سے یہ ہوتی ہے کہ بچوں کو اُس شئے کی تعلیم دی جائے جس کو وہ دوران مشق میں خود بخود نامعلوم طور پر سیکھ سکتے ہیں جس طرح بچہ معمولی الفاظ کے معنوں کو لغت کی مدد سے نہیں بلکہ اپنے گرد وپیش کی گفتگو سے ضمناً حاصل کرتا ہے اسی طرح چیزوں۔ تصویروں اور اپنے بنائے ہوئے نقش ونگار کی بابت بات چیت سننے سے اُن ہی علمی اصطلاحوں کو بے تصرف بغیر کسی کوشش کے بلکہ خوشی خوشی تھوڑی سی مدت میں حاصل کرلیتا ہے اور اگر پہلے پہل اُن اصطلاحوں کی تعلیم دی جائے تو وہ ایک عقدۂ لاینحل اور ملال کا باعث ہوتی ہیں۔

مصوری کی ابتدائی تعلیم سکھانے کا طریقہ اور ما طریقے

اگر تعلیم کے اُن عام اصول پر جو تجویز کئے گئے ہیں کچھ اعتماد کیا جا سکتا ہے تو مصوری سیکھنے کے عمل کو بچپن کی اُن ابتدائی کوششوں کے ساتھ مسلسل جاری رکھنا چاہیئے جن کی نسبت ہم اوپر بیان کر آئے ہیں کہ وہ اس قابل ہیں کہ بچوں کو اُن کا شوق دلایا جائے۔ یہ جو تصویریں بنانے کی مشق بچے اپنے شوق سے شروع کر دیتے ہیں جب اس مشق پر ذرا ہاتھ جم جائے اور تناسب کا خاصہ تصور پیدا ہو جائے اُس وقت اُن کو جسامت کا موہوم سا تصور پیدا ہو جائیگا کہ جسم کے ابعاد ثلثہ کو تصویر میں کیوں کر ظاہر کیا جاتا ہے اور کاغذ پر تصویر بنانے کی چند لاحاصل کوششوں کے

بعد جیسی کہ چینیوں کی تصویریں ہوتی ہیں جب بچوں کو خاصی صفائی سے اس بات کا ادراک حاصل ہو جائے کہ کیا کام کرنا چاہیئے اور اُس کو کرنے کی خواہش پیدا ہو جائے اُس وقت اُن آلات کے ذریعہ سے، جو من حیث العلم مصوری کی تشریح کے لئے وقتاً فوقتاً استعمال کئے جاتے ہیں علمی مصوری کے ابتدائی سبق کی تعلیم دی جا سکتی ہے۔ یہ بات کانوں کو خوفناک معلوم ہوگی۔ مگر یہ معمولی عقل کے کسی لڑکے یا لڑکی کے لئے قابل فہم ہے اور دلچسپ بھی ہے کہ ایک شیشے کے چپٹے ٹکڑے کو چوکھٹے میں اس طرح لگائیں کہ وہ میز پر عمود دار واقع ہو اور اُس کو شاگرد کے سامنے رکھدیں اُس کے دوسرے رُخ پر ایک کتاب یا اسی قسم کی کوئی دوسری سیدھی سادی چیز رکھکر شاگرد سے کہا جائے کہ نگاہ کو ایک جگہ جماکر شیشہ پر روشنائی کے نقطے اس طرح بنائے کہ وہ اس شئے کے کونوں پر منطبق ہو جائیں یا اُن کو پوشیدہ کریں۔ اب اُس سے کہا جائے کہ لکیروں کے ذریعہ سے اُن نقطوں کو ملائے۔ اس عمل سے اُس کو معلوم ہو جائیگا کہ جو لکیریں اُس نے کھینچی ہیں اُس شئے کی حدود اُن لکیروں سے پوشیدہ یا اُن پر منطبق ہو گئی ہیں۔ اور پھر شیشہ کی دوسری طرف ایک کاغذ کا تختہ رکھنے سے یہ بات اُس پر صاف ظاہر ہو جائے گی کہ جو لکیریں اُس نے اس طرح کھینچی ہیں وہ شئے مذکور کی اُس حالت کی تصویر ہیں جس حالت میں کہ وہ اُس کو نظر آئی تھی۔ صرف اتنی بات نہیں کہ وہ لکیریں اُس شئے سے مشابہ معلوم ہوتی ہیں بلکہ وہ یہ سمجھ لے گا کہ وہ لکیریں بالضرور اُس سے مشابہ ہونی چاہئیں کیوں کہ اُس نے ان لکیروں کو اُسی شئے کے نقشہ کے مطابق بنایا تھا۔ اور کاغذ کو ہٹا کر وہ اپنا اطمینان کر سکتا ہے کہ یہ لکیریں اُسی نقشہ کے مطابق ہیں۔ یہ بات نئی اور عجیب ہے اور بچے کے لئے اس امر کا عملی ثبوت ہے کہ خاص خاص طولوں کی لکیروں کو ایک سطح مستوی پر خاص خاص سمتوں میں رکھکر ایسی لکیریں بنا سکتے ہیں جن کے طول اور جن کی سمتیں بلحاظ

فاصلے کے مختلف ہوں۔ اگر اُس شئے کی جگہ بہ تدریج بدلتے رہیں تو شاگرد کو اس امر کا مشاہدہ کرایا جا سکتا ہے کہ بعض لکیریں کس طرح گھٹتی اور غائب ہو جاتی ہیں۔ اور بعض لکیریں نظر آنے لگتی اور بڑھتی جاتی ہیں۔ خطوط متوازی کا میلان بلکہ فی الحقیقت مصوری کی تمام بڑی بڑی باتیں وقتاً فوقتاً اسی طرح اس کو سمجھائی جا سکتی ہیں۔ اگر اُس کو باقاعدہ طور پر اپنی مدد آپ کرنے کی عادت ڈلوائی گئی ہے تو جس وقت کہا جائے وہ بخوشی کسی خاکہ کو صرف نگاہ سے کاغذ پر کھینچنے کی کوشش کرے گا۔ اور ممکن ہے کہ تھوڑے عرصہ میں بغیر کسی مدد کے۔ ایسی تصویر بنانے کا شوق پیدا ہو جائے جو تا بہ مقدور اُس تصویر کے مطابق ہو جس کا خاکہ شروع میں شیشہ پر اُتارا گیا تھا۔ غرض کہ دوسری کی بنائی ہوئی تصویروں کی نقل بے سمجھے بوجھے نہیں اُتاری جاتی اور کل کی طرح اس عمل کو جاری نہیں رکھا جاتا بلکہ ایک سادہ اور دلکش طریقہ سے یعنی ایسے طریقہ سے جو معقول ہے۔ مگر مشکل نہیں۔ شاگرد کو اشیاء کے خاکہ سے واقفیت اور اُن کے بنانے کی قابلیت بہ تدریج حاصل ہو سکتی ہے۔ ان فوائد کے علاوہ یہ فائدے بھی ہیں کہ اوّل تو شاگرد کو تقریباً نامعلوم طور پر بچپن ہی میں تصویر کا صحیح خیال پیدا ہو جاتا ہے (یعنی یہ بات کہ تصویر اشیاء کا ایک خاکہ ہے جیسی کہ وہ نظر آتی ہیں۔ جب کہ وہ خاکہ ایک ایسے سطح مستوی پر کھینچا جائے جو اُن اشیاء اور آنکھ کے مابین واقع ہے) اور دوسرے یہ کہ جب اُس کی عمر اس قابل ہو جائے گی کہ اُس کو علمی مصوری کی تعلیم شروع کرائی جا سکے تو اُس کو پہلے ہی اُن واقعات سے پوری واقفیت ہو گی جن پر منطقی حیثیت سے علمی مصوری کی بنیاد قایم ہے۔

علم ہندسہ کے ابتدائی تصورات بچوں کے ذہن نشین کرنے کا مسٹر وائز کا

اس امر کے ظاہر کرنے کی غرض سے کہ علم ہندسہ میں ابتدائی تصورات کی تعلیم کا معقول طریقہ کیا ہے اس سے بہتر کوئی تدبیر نہیں ہے کہ مسٹر وائز کے مضمون کا حسب ذیل اقتباس درج کیا جائے:-

حساب کے لئے مکعب چیزوں سے کام لینے کی عادت تو بچہ کو پہلے ہی سے ڈالوائی گئی ہے۔ اب علم ہندسہ کے ابتدائی اصول کے لئے بھی اُن ہی چیزوں کا استعمال کراؤ۔ میں اس تعلیم کو مجسمات سے شروع کرنا پسند کرتا ہوں جو معمولی طریقہ کے برعکس ہے۔ اس سے یہ فائدہ ہے کہ نقاط۔ خطوط اور سطوح جو محض ذہنی چیزیں ہیں۔ اُن کی بیہودہ تعریفیں اور خراب تشریحیں کرنے میں جو دقت پیش آتی ہو اُس سے نجات ہو جاتی ہے ٭ ٭ ٭ مکعب شکل میں علم ہندسہ کے بہت سے بڑے بڑے اصول اولیہ موجود ہیں۔ نقاط۔ خطوط مستقیم۔ خطوط متوازی۔ زوایا۔ اشکال متوازی الاضلاع وغیرہ وغیرہ یہ سب چیزیں ایک ساتھ مکعب میں صاف صاف نظر آتی ہیں۔ ان مکعبوں کو مختلف حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ گنتی سکھانے میں طالب العلم کو پہلے ہی ان حصوں سے واقفیت پیدا کرا دی گئی ہے۔ اور اب وہ اس امر کی طرف رجوع کرتا ہے کہ اُن کے مختلف حصوں کا مقابلہ کرے اور ان حصوں کے باہمی تعلق کو سمجھے ٭ ٭ ٭ ٭ یہاں سے آگے بڑھ کر کُروں کی طرف آتا ہے جن سے دائرہ کا اور بالعموم اشکال قوسیہ وغیرہ وغیرہ کا ابتدائی تصور حاصل ہوتا ہے۔ مجسمات سے خاصی واقفیت حاصل کرکے اب اُن کی جگہ مسطحات کو لے سکتا ہے۔ یہ تبدیلی بہت آسانی سے ہو سکتی ہے۔ مثلاً مکعب کے پتلے پتلے ٹکڑے کاٹ کر کاغذ پر رکھدیئے جائیں تو اب اُس کو اتنی قائم الزاویہ شکلیں نظر آئیں گی جتنے ٹکڑے ہیں۔ علی ہذا القیاس باقی سب ٹکڑوں کی یہی کیفیت ہوگی۔ کُروں کے ساتھ بھی اسی طرح عمل کر سکتے ہیں۔ پس اُس کو معلوم ہو جائیگا کہ سطحیں دراصل کیوں کر پیدا ہو سکتی ہیں علاوہ وہ ہر ایک مجسم شکل میں آسانی سے اُن سطحوں کا تصور اپنے ذہن میں کرے گا۔ پس اُس کو علم ہندسہ کی ابجد اور اُس کا پڑھنا تو آگیا۔ اب وہ اس کے سمجھنے کی طرف توجہ کرتا ہے۔"

سُب سے آسان اور اسی لیے سب سے پہلا عمل یہی ہے کہ ان مستوی سطحوں کو ایک کاغذ کے ٹکڑے پر رکھکر اُن کے گرد پنسل سے خط کھینچ دیا جائے۔ کئی مرتبہ ایسا عمل کرنے کے بعد اُس مسطح ٹکڑے کو ذرا فاصلہ پر رکھکر بچہ سے کہنا چاہیے کہ اُس کی نقل کرے اور اسی طرح اس عمل کو جاری رکھے"۔

طریقہ مذکورہ بالا کی مزید تشریح اور اُس کے قواعد

مسٹر وائز کے اس طریقہ سے جب تصورات ہندسہ کا ذخیرہ حاصل ہو جائے تو اس سے آگے اس طرح چلنا چاہیئے کہ طالب علم کو اس بات کی مشق کرائی جائے کہ جو شکلیں اُس نے کھینچی ہیں اپنی نگاہ سے اُن کی صحت کا انتظام کرے۔ پس اس ترکیب سے اُس کو صحیح شکلیں بنانے کا حوصلہ پیدا ہو گا۔ اور اُس حوصلہ کے پورا کرنے کی وقت بھی ہمیشہ پیش نظر رہے گی۔ اس بات میں شبہ نہیں ہو سکتا کہ جیومیٹری[1] (علم ہندسہ) کی بنیاد (جیسا کہ درحقیقت اس لفظ سے ظاہر ہے) وہ قواعد ہیں جن کو دستکاروں اور دوسرے لوگوں نے مکانوں کی بنیادوں احاطوں کے رقبوں اور اسی قسم کے کاموں کی صحیح پیمائش کرنے کے لئے دریافت کیا تھا اور اس علم کے حقایق کا ذخیرہ صرف اس غرض سے جمع کیا گیا تھا کہ اُن سے براہ راست مفاد حاصل ہوتا ہے۔ پس ضرور ہے کہ اُن حقایق کو اُسی قسم کے تعلقات سے طالب علم کے سامنے پیش کیا جائے۔ اگر طالب علم کو کاغذ کے مکانات بنانے کے لئے کاغذوں کے ٹکڑے کاٹنے ہیں۔ رنگ بھرنے کے لئے خوبصورت شکلیں کھینچنی ہیں اور ان مختلف قسم کے مفید مشاغل میں جو ایجاد پسند معلّم اُس کے واسطے تجویز کرے کچھ عرصہ تک مصروف رکھا جائے تو یہ بات مفید ہے جیسا کہ مبتدی معمار کو کچھ عرصہ تک آزمایشی عملوں میں مصروف رکھتے ہیں۔ پس تجربہ کی بدولت

---

[1] لفظ جیومیٹری (                ) دو لفظوں (جی اور میٹرون) سے مرکب ہے جی کے معنی ہیں زمین اور میٹرون کے معنی پیمائش کرنا۔ پس جیومیٹری کے لفظی معنی ہوئے "زمین کی پیمائش کا علم"۔ مترجم

طالب علم اُس مشکل کو محسوس کرے گا جو اُس کو اپنے مقاصد کے حاصل کرنے میں پیش آتی ہے جب کہ اُس کے حواس کو کسی قسم کی مدد نہ ملے۔ جب اس اثنا میں ادراک کی تربیت عمدہ طور پر ہو جائے اور بچہ اُس عمر کو پہنچ جائے کہ پرکار کا استعمال کر سکے تو وہ پرکار کی واجبی قدر کرے گا کیوں کہ پرکار سے اُس کے نظری اندازہ کی تصدیق ہوتی ہے پھر بھی تخمینی عمل کے نقص حصول مدعا میں سدّراہ ہوں گے۔ بچہ کو کچھ اور زیادہ عرصہ تک اسی منزل پر چھوڑ دینا چاہیئے۔ اس کی وجہ کچھ تو یہ ہے کہ وہ ابھی اس قدر کم سن ہے کہ کسی بڑے کام پر اُس کو لگا نہیں سکتے۔ اور کچھ یہ کہ اس بات کی ضرورت ہے کہ کاموں کو باضابطہ ہنرمندی سے پورا کرنے کی ضرورت اُس کے دل پر اور بھی زیادہ نقش ہو جائے اگر ہم کو یہ منظور ہے کہ تحصیل علم مسلسل دلچسپی کا باعث ہو اور اگر نوع انسان کے ابتدائی تمدن کی طرح بچہ کے ابتدائی تمدن میں بھی سائنس کی قدر محض اس وجہ سے کی جاتی ہے کہ اُس سے آرٹ (فن) میں مدد ملتی ہے تو صاف ظاہر ہے کہ علم ہندسہ کی مناسب تمہید یہی ہے کہ طالب علم کو مدت تک اپنے ہاتھ سے شکلیں بنانے کی مشق کرائی جاہیئے جس سے علم ہندسہ میں سہولیت پیدا ہو جائے گی۔ دیکھو یہاں بھی قدرت رستہ بتاتی ہے۔ بچے اس بات کی طرف قوی میلان ظاہر کرتے ہیں کہ کاغذ کو کتر کر کچھ چیزیں بنائیں۔ اپنے ہاتھ سے کوئی چیز بنائیں یا تعمیر کریں۔ یہ ایسا میلان ہے کہ اگر اُس کو تقویت دی جائے اور راہ راست پر ڈال دیا جائے تو اُس سے نہ صرف علمی تصورات کا رستہ صاف ہو جائے گا بلکہ دستکاری کی اُن قوتوں کو بھی ترقی ہوگی جو اکثر آدمیوں میں بہت کم پائی جاتی ہیں۔

ہندسہ علمی کی تعلیم کس وقت اور کس طریقہ سے دینی چاہیئے

جب قوائے مشاہدہ اور قوائے موجدہ میں مطلوبہ قوت پیدا ہو جائے اُس وقت طالب علم کو ہندسہ علمی کی تعلیم شروع کرائی جا سکتی ہے۔ ہندسہ علمی وہ ہے جس میں مسائل کو علمی قواعد کے ذریعہ حل کرنے سے بحث کی جاتی ہے اور اُن کے علمی ثبوت

سے کچھ بحث نہیں ہوتی جس طرح طریقۂ تعلیم میں اور سب تبدیلیاں ہوتی ہیں یہ عمل بھی
قصداً نہیں بلکہ بلا قصد ہونا چاہیئے۔ اور (بچوں کے) ہاتھ سے شکلیں بنوانے
کے تعلق کو اب بھی قایم رکھنا چاہیئے۔ ایک مفروضہ مثلث[1] متساوی السطوح
کے برابر کاغذ کے پٹھے کو کاٹ کر دوسرا مثلث بنانا ایسا عمل ہے جس سے طالب علم
کو دلچسپی پیدا ہوگی اور ہندسۂ عملی کی تعلیم کے لیے یہ ایک آسان تمہید کا کام دے گا
طالب علم کو معلوم ہو جائے گا کہ اس شکل کے بنانے کے لئے ضرور ہی کہ چار مثلث
متساوی الاضلاع کھینچے جائیں اور خاص خاص موقعوں پر اُن کو ترتیب دے کر رکھا
جائے۔ چوں کہ اُس کو صحیح طریقہ معلوم نہیں ہے اور وہ اُس شکل کو ٹھیک ٹھیک نہیں
بنا سکتا اس لیے اُن مثلثوں کو اُن کی خاص جگہ پر رکھتے وقت اُس کو یہ بات
معلوم ہوگی کہ اُن کے ضلع ٹھیک نہیں بیٹھتے اور اُن کے زاویے راس پر نہیں
ملتے۔ اب وہ دائرے کھینچ کر ان میں سے ہر ایک مثلث کو پوری صحت کے ساتھ
بنانے کا طریقہ اُس کو بتا سکتے ہیں جس میں قیاس لگانے کی ضرورت نہیں ہے
اور اپنی ناکامی کے بعد بچہ کو اس معلومات کی قدر ہوگی۔ اس ابتدائی سوال کے
حل کرنے میں اس طرح مدد دینے کے بعد آیندہ کے لئے اس کو چھوڑ دیا جاتا ہے کہ جو
سوال اُس سے کئے جائیں جس طرح ہو سکے خود اُن کو حل کرے تاکہ اُس کو قواعد
ہندسیہ کی ماہیت واضح طور پر معلوم ہو جائے۔ خط کی تنصیف کرنا۔ عمود
قایم کرنا۔ مربع بنانا۔ زاویہ کی تنصیف کرنا۔ ایک خط مفروض کا
متوازی دوسرا خط کھینچنا۔ مسدس بنانا۔ یہ ایسے سوالات ہیں
جن کو وہ تھوڑے صبر سے حل کر سکے گا۔ اُن ہی باتوں سے اُس کو
آہستہ آہستہ مشکل سوالوں تک لے جا سکتے ہیں اور اگر عقلمندی سے اس کا انتظام

[1] مثلث متساوی السطوح اُس شکل مجسم کو کہتے ہیں جو چار متساوی الاضلاع مثلثوں سے محدود ہو۔ مبترجم

کیا جائے تو وہ بغیر مدد کے ان سب سوالوں کو کسی قدر تردد کے بعد آپ حل کرلے گا۔ جن لوگوں نے پرانے دستور العمل کے موافق تربیت پائی ہے۔ بے شک اُن میں سے بہت سے آدمی اس بیان کو شبہ کی نظر سے دیکھیں گے مگر ہمارا بیان واقعات پر مبنی ہے اور وہ واقعات نہ تو قلیل ہیں اور نہ خاص ہیں۔ ہم نے لڑکوں کی ایک جماعت کو ایسے سوالات کے حل کرنے میں ایسا محو ہوتے دیکھا ہے کہ وہ علم ہندسہ کے سبق کو ہفتہ بھر کا ایک اہم واقعہ سمجھتے ہیں۔ پچھلے مہینے ہم نے ایک مدرسۂ نسواں کا ذکر سُنا تھا جہاں بعض نوجوان لڑکیاں مدرسہ کے گھنٹوں کے بعد اپنی مرضی سے علم ہندسہ کے سوالات میں مشغول رہتی ہیں اور ایک دوسرے مدرسۂ نسواں کی بابت یہ سُنا تھا کہ وہاں کی لڑکیاں صرف اسی بات پر قناعت نہیں کرتیں بلکہ ایک لڑکی تو تعطیل کے دنوں میں بھی حل کرنے کے لئے سوالات مانگتی ہے۔ یہ دونوں باتیں ہم اُستاد کی شہادت پر بیان کرتے ہیں۔ یہ واقعات اس امر کی قوی ثبوت ہیں کہ خود بخود ترقی کرنا ممکن ہے اور اس سے بے حد فائدہ ہوتا ہے۔ علم کی کوئی سی شاخ جو معمولی طور پر سکھانے کی وجہ سے خشک بلکہ ناگوار بھی معلوم ہوتی ہے، اگر اُسی شاخ کی تعلیم قدرت کے طریقہ کے مطابق دی جائے تو وہ نہایت دلچسپ اور نہایت مفید ہوتی ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ "نہایت مفید" ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ نتائج مسائل ہندسیہ کے حاصل کرنے پر محدود نہیں ہیں بلکہ بسا اوقات نفس کی حالت میں انقلاب عظیم پیدا کر دیتے ہیں۔ بارہا ایسا اتفاق ہوا ہے کہ جو طلبہ مدرسہ کی معمولی تربیت کی وجہ سے یعنی اُس کے عقلی اصولوں اُس کے تھکا دینے والے کاموں اور علم کو دماغ میں ٹھونس لینے کی وجہ سے بدحواس اور احمق بن گئے ہیں اگر اُن کو اس طرح تعلیم دی جائے کہ علم کاہلوں کی طرح حاصل نہ کریں بلکہ اس بات کی ترغیب دی جائے کہ مستعدی سے خود تحقیقات کرنے لگیں تو اُن کی

عقلیں یکا یک بیدار ہو جائیں گی جب بچوں کے ساتھ ذرا ہمدردی کی جاتی ہے تو پست ہمتی۔ جو خراب تعلیم کا نتیجہ ہے۔ کم ہو جاتی ہے۔ اور ابتدائی کامیابی حاصل کرنے کے لئے کافی استقلال پیدا ہو جاتا ہے۔ اُس وقت جذبات میں سخت تغیر واقع ہوتا ہے جس کا اثر تمام طبیعت پر پڑتا ہے۔ اب وہ اپنے آپ کو نالایق نہیں پاتے۔ اب وہ بھی کچھ نہ کچھ کر سکتے ہیں۔ جب ایک کامیابی کے بعد دوسری کامیابی بہ تدریج حاصل ہوتی ہے تو ناامیدی کا کابوس کافور ہو جاتا ہے اور وہ اپنے دوسرے سبقوں کی مشکلات پر ایسی دلیری سے حملہ کرتے ہیں جس میں کامیابی کا یقین ہوتا ہے۔

علم ہندسہ کی تعلیم کو دلچسپ بنانے کے لئے پروفیسر ٹنڈل کی رائے

جس وقت مضمون مندرجۂ بالا ابتداءً شائع ہوا تھا اس کے چند ہفتے بعد پروفیسر ٹنڈل نے ایک لکچر میں جو رائل انسٹیٹیوشن (شاہی مدرسہ) میں دیا گیا تھا اور جس کا عنوان تھا "علم طبعی کے مطالعہ کی عظمت اس اعتبار سے کہ وہ تعلیم کی شاخ ہے" اسی بات کا کسی قدر شافی ثبوت دیا تھا۔ صاحب موصوف کی شہادت جو ذاتی مشاہدہ پر مبنی ہے اُس کی قدر و قیمت اس قدر زیادہ ہے کہ ہم اُس کو درج کرنے سے باز نہیں رہ سکتے۔ وہ یہ ہے۔

جس زمانہ کا میں نے ذکر کیا ہے اُس زمانہ میں منجملہ اُن کاموں کے۔ جو میرے حصّہ میں آئے تھے۔ ایک کام ایک جماعت کو ریاضی کی تعلیم دینا تھا اور میں نے عموماً یہ بات دیکھی کہ جب بچوں کو اقلیدس اور ہندسۂ قدیم کی تعلیم سمجھا کر دی جاتی تھی تو ان مضامین کا مطالعہ اُن کے لئے بالعموم بہت دلکش ہوتا تھا۔ مگر میری عادت تھی کہ بچوں کو معمولی کتابی تعلیم سے ہٹا کر اُن سوالوں کے حل کرنے کے لئے۔ جو اُس تعلیم میں شامل نہیں ہیں۔ ذاتی لیاقت سے کام لینے کی ہدایت کرتا تھا۔ پرانی ڈگر کو چھوڑ کر نئی راہ پر چلنے سے پہلے طلبہ کو عموماً تھوڑی بہت نفرت ہوتی تھی اور اُن کو وہی کیفیت محسوس ہوتی تھی جو کسی بچہ کو اجنبی آدمیوں میں چھوڑ دینے سے ہوتی ہے

مگر میں نے ایک بھی ایسی مثال نہیں دیکھی کہ یہ نفرت قایم رہی ہو جب کوئی لڑکا بالکل ہمت ہار دیتا تھا تو میں نیوٹن[1] کی حکایت سے اُن کی ڈھارس بندھاتا تھا۔ جہاں اُس نے یہ بیان کیا ہے کہ "مجھ میں اور دوسرے آدمیوں میں جو فرق ہے وہ زیادہ تر میرے اپنے صبر و استقلال کا نتیجہ ہے" یا مرابو[2] کی حکایت سے اُس کی ہمت بندھاتا تھا کہ جب اُس کے نوکر نے کہا کہ فلاں بات ناممکن ہے تو اُس نے حکم دیا کہ "اس احمقانہ لفظ کو پھر کبھی استعمال نہ کرنا" اس طرح خوش ہو کر اور مسکرا کر وہ کام پر متوجہ ہو جاتا تھا۔ اس تبسم میں شاید کچھ شبہ سا پایا جاتا تھا۔ مگر پھر بھی دوبارہ کوشش کرنے کا مصمم ارادہ ظاہر ہوتا تھا۔ میں نے دیکھا ہے کہ لڑکے کی آنکھیں خوشی کے مارے چمک اُٹھی ہیں اور آخر کار ایسی خوشی سے کہ ارشمیدس[3] کی حالت بیخودی" بالکل وہی خوشی ایک وسیع پیمانے پر تھی اُس کو یہ کہتے سنا ہے کہ "جناب! میں نے اس کو پا لیا ہے" پس طلبہ کو اپنی ذاتی طاقت کا شعور پیدا ہو جاتا تھا اور یہ نہایت ہی مفید بات تھی اور اس طرح نئی زندگی پا کر جماعت کی ترقی درحقیقت تعجب خیز ہوتی تھی۔ اکثر میرا یہ دستور تھا کہ

---

[1] سر آئزک نیوٹن انگلستان کا مشہور و معروف فلسفی اور ریاضی داں گزرا ہے سنہ ۱۶۴۲ء میں پیدا ہوا تھا اور سنہ ۱۷۲۷ء میں انتقال کیا۔ مترجم

[2] مرابو۔ ملک فرانس کا ایک مقرر اور انقلاب سلطنت کا خواہش مند تھا۔ سنہ ۱۷۴۹ء میں پیدا ہوا تھا اور سنہ ۱۷۹۱ء میں فوت ہوا۔ مترجم

[3] ارشمیدس۔ زمانہ قدیم میں ملک یونان میں ایک مشہور ریاضی داں گزرا ہے سنہ ۲۸۷ قبل مسیح میں پیدا ہوا تھا اور سنہ ۲۱۲ قبل مسیح میں انتقال کیا۔ جس قصہ کی طرف متن میں اشارہ کیا گیا ہے اُس کی حقیقت یہ ہے کہ جزیرہ صقلیہ میں شہر سیرا کیوز کے بادشاہ ہیرو نے ایک سونے کا تاج بنوایا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ تاج تو ثابت رہے مگر کسی تدبیر سے اُس کا کھوٹا کھرا ہونا معلوم ہو جائے۔ بادشاہ نے حکیم ارشمیدس سے کہا کہ اس کی کوئی ترکیب نکالو۔ اُس نے بہت سوچا مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ ایک روز حمام میں نہا رہا تھا کہ یکایک وہ ترکیب اُس کے ذہن میں آگئی اور مارے خوشی کے ایسی بیخودی کی حالت اُس پر طاری ہوگئی کہ "پا لیا پا لیا" کہتا ہوا حمام سے ننگا ہی نکل بھاگا۔ مترجم

لڑکوں کو اختیار دے دیتا تھا کہ چاہے وہ اپنی کتابی شکلیں حل کریں چاہے دوسری شکلوں پر جو کتاب میں نہیں ہیں۔ طاقت آزمائی کریں۔ مجھے ایک بھی ایسی مثال معلوم نہیں ہے کہ لڑکوں نے کتابی شکلوں کو پسند کیا ہو۔ میں ہمیشہ مدد کرنے کو تیار رہتا تھا۔ جب میں سمجھتا تھا کہ مدد کی ضرورت ہے۔ مگر میں عادۃً مدد دینے سے انکار کرتا تھا۔ لڑکوں کو عقلی فتح کی مٹھاس کی چاٹ لگ گئی تھی اور وہ ذاتی فتوحات کے طالب ہوتے تھے۔ میں نے اُن شکلوں کو دیکھا ہے جو اُنھوں نے دیواروں پر طرح طرح کی اور رزش کے میدان میں گڑی ہوئی لکڑیوں پر کھود کر بنائی ہیں اور جو زندہ دلچسپی بچے اس مضمون سے رکھتے ہیں اُس کی بے شمار مثالیں اور بھی دیکھی ہیں۔ اگر میری بابت پوچھو تو جہاں تک تعلیم کے تجربہ کا تعلق ہے میں تو محض اُس پرندہ کی مانند تھا جس کے پر و بال ابھی نکلے ہوں میں علم التعلیم کے قواعد کو مطلق نہیں جانتا تھا۔ مگر میں اُس نفس مطلب کو کبھی نہیں چھوڑتا تھا جو اِس مضمون کے شروع میں بیان کیا گیا ہے اور اس بات کی کوشش کرتا تھا کہ علم ہندسہ کو تعلیم کی شاخ نہیں۔ بلکہ تعلیم کا وسیلہ بنایا جائے اس تجربہ میں مجھے کامیابی ہوئی اور میری زندگی کے سب سے زیادہ پُر لطف گھنٹوں میں سے بعض گھنٹے اس بات کے دیکھنے میں صرف ہوئے ہیں کہ بچوں کی عقلی طاقت میں قوی اور فرحت بخش وسعت پیدا ہو جاتی ہے جب کہ اس طاقت سے اس طرح کام لیا جائے جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے۔

ہندسہ عملی کی تعلیم کو مختلف عمر کے بچوں میں عرصہ تک جاری رکھنا چاہیئے

ہندسہ عملی میں سوالات کا ایک غیر محدود سلسلہ موجود ہے۔ دیگر مضامین کے مطالعہ کے ساتھ اس کی تعلیم برسوں تک جاری رکھنی چاہیئے۔ مادیات علم ہندسہ کے لئے بمنزلہ تمہید کے ہیں اور اگر ہندسہ عملی کے ساتھ ساتھ اصول ہندسیہ کو مادیات پر استعمال کرنے کا عمل برابر جاری رکھا جائے تو یہ بات مفید ہوگی جب مکعب مثمن مجسم اور شکل مخروطی اور منشور کی مختلف صورتیں بخوبی سمجھ میں آجائیں۔ اِس کے

بعد اُن اجسام منتظم کو لے سکتے ہیں جو زیادہ مشکل ہیں۔ مثلاً ایسی شکل مجسم جس میں بارہ مخمس ہوں۔ یا ایسی شکل جس میں بیس مخروطی شکلیں ہوں۔ ان شکلوں کو وصلی کے ٹکڑوں سے کاٹ کر بنانے میں بڑی ذہانت درکار ہے۔ ان کے بعد اجسام منتظم کی ایسی تبدیل شدہ شکلوں کی طرف خود بخود رجوع کر سکتے ہیں جو کرسٹل (بلور نما قلم) میں دیکھی جاتی ہیں۔ یعنی مکعب مقطوع الراس۔ ایسا مکعب جس کے مسطح اور نیز مجسم زاویے مقطوع الراس ہوں۔ مثمن مجسم اور مختلف قسم کی منشور جن کی شکل اسی طرح بدلتی رہتی ہے اور مختلف قسم کی دھاتیں اور مختلف قسم کے نمک (ٹھوس بننے کے وقت) جن بے شمار شکلوں کو اختیار کرتے ہیں اُن شکلوں کی نقل اُتارنے میں علم معدنیات سے بھی ضمناً واقفیت حاصل ہو جاتی ہے۔[1]

ندسۂ عملی
ے بعد ہندسۂ
قلی کی تعلیم
ہی چاہیے

اس قسم کی مشقوں میں زیادہ عرصہ تک مصروف رہنے کے بعد ہندسۂ عقلی کی تعلیم میں جیسا کہ اندیشہ کیا جا سکتا ہے۔ کوئی دقت پیش نہیں آئے گی۔ چوں کہ طالب علم کو شکل اور مقدار کے تعلقات پر غور کرنے کی عادت ہو جاتی ہے جو بعض وسائل سے اُس کو حاصل ہوئے ہیں اور چوں کہ وہ اُن نتائج کی ضرورت کو وقتاً فوقتاً مبہم طور پر معلوم کرتا ہے اس لئے وہ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ جن عملی شکلوں سے اُس نے واقفیت پیدا کی ہے اقلیدس کے ثبوت اُن ہی شکلوں کے گم شدہ ضمیمے ہیں۔ اُس کے قوائے عقلیہ جن کی تربیت عمدہ طور پر ہوئی ہے۔ اُس کو اس لائق بنا دیں گے کہ اشکال ہندسیہ پر یکے بعد دیگرے بآسانی عبور حاصل ہو سکے۔ اُن کی قدر و قیمت کو خوب سمجھ سکے۔ اور وقتاً فوقتاً یہ بات معلوم کر کے کہ اُس کے بعض قاعدے صحیح ثابت ہو گئے ہیں اُس کو

[1] جو لوگ اس طریقہ کو عمل میں لانے کے لئے۔ جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ مدد کے خواہاں ہیں۔ اُن کو ایک چھوٹی سی کتاب جس کا نام "انونشنل جیومیٹری" (ایجادی ہندسہ) ہے اس کام میں مدد ملے گی۔ اس کتاب کو جی اینڈ سی مورنے لے۔ پیٹر ناسٹر رو۔ لندن نے چھاپ کر مشتہر کیا ہے۔ مصنف

خوشی حاصل ہو گی پس وہ اُن باتوں کا حظ اُٹھائے گا جو ایسے شخص کے لئے بے لطف ہیں جو اُن کے لئے تیار نہیں ہے۔ اب ہم کو صرف اتنی بات اور بیان کرنی ہے کہ تھوڑی سی مدت میں طالب علم اس حالت تک پہنچ جائے گا جب کہ اُس کو منجملہ تمام مشقوں کے جو اوپر متذکرہ کے لئے گئے سب سے زیادہ قابل قدر مشق حاصل ہو سکے گی۔ اب طالب علم اس قسم کی نظری شکلوں کو، جیسی مسٹر جیمبرز کی اقلیدس کے مختلف مقالوں کے ساتھ ملحق ہیں جلد حل کر سکے گا اور اُن کے ثابت کرنے سے نفس ناطقہ کو جو ترقی ہو گی وہ محض عقلی نہیں بلکہ اخلاقی بھی ہو گی۔

طریقۂ تعلیم کا جو خاکہ اوپر کھینچا گیا ہے اس کے فائدے

اگر ان امور کی پوری تصریح کی جائے تو ہم کو تعلیم پر ایک مفصل رسالہ لکھنا پڑے گا اور یہ ہمارا مقصد نہیں ہے۔ بچپن کے ابتدائی زمانہ میں ادراک کی مشق کے لئے اسباق الاشیاء کا باقاعدہ انتظام کرنے کے لئے مصوری اور علم ہندسہ کی تعلیم دینے کے لئے تجاویز کا جو خاکہ اوپر بیان ہو چکا ہے اس کو ایسا سمجھنا چاہیئے کہ وہ اس طریقۂ تعلیم کی مثالیں ہیں جس کی طرف متذکرۂ بالا اصول عام ہدایت کرتے ہیں۔ ہم کو یقین ہے کہ اگر ان اصول تعلیم کی جانچ پرتال کی جائے تو یہ بات معلوم ہو گی کہ وہ نہ صرف آسان سے مشکل تک مبہم سے معین تک مادیات سے مجردات تک عملی سے عقلی تک ترقی کرتے ہیں بلکہ ان مزید شرائط کو بھی پورا کرتے ہیں کہ تعلیم میں کسی قدر تمدن کا اعادہ ہو تعلیم حتی الامکان ایسے طریقہ سے دی جائے کہ بچے خود بخود ترقی کر سکیں اور اُس سے مسرت حاصل ہو۔ چوں کہ ایک ہی قسم کا طریقہ ان سب شرطوں کو پورا کرتا ہے اس لئے ان شرطوں کی تصدیق ہو جاتی ہے اور یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہی طریقہ صحیح ہے۔ اس بات پر بھی غور کرو کہ یہ طریقہ اُس رجحان کا منطقی نتیجہ ہے جس میں تمام نئے ترقی یافتہ تعلیمی طریقوں کی خصوصیتیں پائی جاتی ہیں۔

اس میں اسی قدرتی طریقہ کو پوری طرح اختیار کیا گیا ہے جس کو ان نئے طریقوں نے جزوی طور پر اختیار کیا ہے اور یہ بات کہ وہ قدرتی طریقہ کو کامل طور پر اختیار کیا گیا ہے دو وجوہ سے ظاہر ہے۔ اوّل اس وجہ سے کہ یہ طریقہ اصول مذکورۂ بالا سے مطابقت رکھتا ہے، دوم اس وجہ سے کہ وہ ان تجاویز کی پیروی کرتا ہے جن کو نشوونما پانے والا نفس خود سمجھاتا ہے۔ اس سے نفس کی قدرتی مستعدی میں سہولت پیدا ہوگی اور اس نشوونما پانے مدد ملے گی جس میں قدرت مصروف ہے۔ پس یہ نتیجہ نکالنے کے لئے کافی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ جس طریق عمل کی مثالیں اوپر بیان کی گئی ہیں وہ سچے طریقہ تعلیم سے نہایت قریب ہے۔

تعلیم کے دو نہایت اہم اصول جن پر عموماً بہت ہی کم توجہ کی جاتی ہے

دو عام اصول ایسے ہیں جو سب سے زیادہ ضروری ہیں اور جن پر سب سے کم توجہ کی جاتی ہے۔ ان دونوں اصولوں پر زیادہ زور دینے کی غرض سے ضرور ہے کہ چند فقرے اضافہ کئے جائیں۔ ایک اصول یہ ہے کہ ابتدائے طفولیت اور زمانہ بلوغ کی طرح تمام جوانی میں بھی وہی طریقہ اختیار کرنا چاہیئے جس سے نفس کی تعلیم خودبخود ہو سکے۔ دوسرا اصول جو پہلے اصول میں داخل ہے یہ ہے کہ جس عقلی کام کی ترغیب دی جائے وہ فی حد ذاتہ ہمیشہ مرغوب طبع ہونا چاہیئے۔ اگر ہم اس بات کو سمجھ لیں کہ آسان سے مشکل تک۔ مبہم سے معین تک۔ مادیات سے مجردات تک ترقی کرنا ایسی ضروری شرطیں ہیں جن کی طرف عقلی سائی کالوجی ہدایت کرتی ہے تو یہ شرطیں کہ علم کو از خود حاصل کرنا چاہیئے اور اس طرح حاصل کرنا چاہیئے جس سے طبیعت کو حظ حاصل ہو، ایسی کسوٹیاں بن جاتی ہیں جن سے اس بات کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ عقلی سائی کالوجی کی ہدایتوں کی تعمیل ہوتی یا نہیں۔ اگر شرائط مقدم الذکر عقلی ارتقا کے علم (سائنس) کے بڑے بڑے اصول کلیہ میں تو شرائط متاخر الذکر عقلی ارتقا کی تقویت کا فن (آرٹ) ہیں۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہو اگر ہم اسے

نصاب کے سلسلہ کو اس طرح ترتیب دیا جائے کہ طالب علم بلا امداد یا تھوڑی سی مدد سے بتدریج
اُس کو خود طے کر سکے تو ضرور ہی کہ وہ سلسلہ قوائے عقلیہ کے مدارج ارتقا سے مطابقت
رکھتا ہو۔ اور اگر اس سلسلہ کا بہ تدریج حاصل کرنا طالب علم کے لیے فی الحقیقت باعث تفریح
ہے تو صریحاً یہ نتیجہ نکلتا ہی کہ اس سلسلہ کے لئے اور کسی شئے کی ضرورت نہیں بجز اس
کے کہ طالب علم اپنے قویٰ کو باقاعدہ استعمال کرے۔

از خود تعلیم حاصل کرنے سے کیا کیا فائدے ہیں

مگر ایسے طریقہ سے تعلیم دینا جس سے از خود ترقی ہو۔ اس سے علاوہ اس
فائدے کے کہ ہمارے سبق باقاعدہ رہتے ہیں اور بھی فائدے ہیں۔ اوّل تو یہ طریقہ
اس بات کا ضامن ہی کہ خیالات کو صفائی کے ساتھ ہمیشہ کے لئے دل پر نقش کر دے
اور معمولی طریقوں سے یہ بات کبھی حاصل نہیں ہوسکتی۔ کوئی سا علم جو طالب علم نے بطور
خود حاصل کیا ہو۔ مثلاً کوئی سوال۔ جو اُس نے آپ حل کیا ہو۔ بہ نسبت کسی دوسرے
طریقہ کے زیادہ کامل طور پر اُس کے قابو میں آجاتا ہے کیوں کہ اُس نے اپنی قوت سے
اس پر تسخیر حاصل کی ہی۔ نفس کی ابتدائی مستعدی جس پر اُس کی کامیابی دلالت کرتی
ہے۔ خیال کا ایک طرف جمانا۔ جو اس کے لئے ضروری ہے اور وہ جوش
جو فتح مندی کا نتیجہ ہے یہ سب چیزیں مل کر واقعات کو اُس کے حافظہ کی کتاب میں
اس طرح درج کر دیتی ہیں کہ جو معلومات صرف معلم سے سُن کر یا مدرسہ کی کتابوں میں پڑھکر
حاصل ہوتی ہی وہ ایسی محفوظ نہیں رہ سکتی۔ اگر طالب علم ناکام رہے تو بھی اس کشش
و کوشش کی وجہ سے جو اُس کے قوائے عقلیہ نے کی ہے، اس امر کا اطمینان ہو جاتا
ہے کہ جب اُس کو کوئی شے حل کرنے کے لئے دی جائے تو وہ خوب اچھی طرح
اُس کو یاد رکھے گا بہ نسبت اس کے کہ اُس کو چھ مرتبہ دہرائے پھر اس بات پر
بھی غور کرو کہ اس تربیت کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جو علم اُس نے حاصل کیا ہے وہ
سلسلہ وار منضبط رہتا ہے۔ جو واقعات اور نتائج اس باضابطہ طریقہ سے ذہن نشین

ہوتے ہیں اُن کی ماہیت ہی میں یہ بات داخل ہے کہ وہ بہ تدریج مزید نتائج کی بنیاد
یعنی مزید سوالات حل کرنے کا وسیلہ بن جاتے ہیں۔ کل کے سوال کا حل آج کے
سوال کے سمجھنے میں طالب علم کو مدد دیتا ہے۔ پس علم ذہن میں آتے ہی ایک ملکہ
بن جاتا ہے اور غور و فکر کے عام فرض کو پورا کرنے میں مدد دیتا ہے۔ یعنی صرف اندرونی
کتب خانہ (دل) کے صفحوں پر لکھا ہوا نہیں پڑا رہتا۔ جیسا کہ رٹ لینے کی حالت میں
ہوتا ہے۔ اس فائدہ کے علاوہ ہمیشہ اپنی مدد آپ کرنے سے جو اخلاقی تربیت
حاصل ہوتی ہے اُس پر بھی غور کرو۔ دلیری سے مشکلات پر حملہ کرنا۔ توجہ کو صبر کے
ساتھ ایک طرف لگا۔ ناکامیوں میں استقلال رکھنا۔ یہ ایسی خصوصیتیں ہیں
جو آیندہ زندگی میں خاص کر مطلوب ہیں اور اگر نفس کو ایسی عادت ڈلوائی جائے کہ
وہ اپنی خوراک کے لئے خود کام کرے تو یہی خصوصیتیں اس طریقہ سے خاص طور پہ
حاصل ہوتی ہیں۔ ہم خود اس بات کی تصدیق کر سکتے ہیں کہ اس طریقہ سے تعلیم دینا
بالکل ممکن العمل ہے کیوں کہ فن مصوری کے مشکل سوالات کو بچپن میں اسی طرح ہم سے
حل کرایا گیا تھا۔ اور یہ بات کہ سربرآوردہ معلموں کا میلان اسی طرف رہا ہے فیلن
برگ کے اس قول سے ثابت ہے کہ طالب علم کی ذاتی اور آزادانہ مستعدی اُن بہت
سے لوگوں کی معمولی مصروفیت اور جسارت کی نسبت زیادہ وقعت رکھتی ہے جو معلمی کا
پیشہ اختیار کرتے ہیں،" اور ہارس مین[1] کی اس رائے سے کہ "بدقسمتی ہے آج کل
ہم لوگوں میں تعلیم زیادہ تر اسی کا نام ہے کہ طالب علم کو بتا دیتے ہیں۔ سکھاتے
نہیں،" اور مسٹر لارسل کے اس مقولے سے کہ "جو باتیں متعلم عقلی کوشش سے دریافت
کرتا ہے۔ بہ نسبت اُن باتوں کے جو اُس کو بتائی جاتی ہیں۔ زیادہ عمدہ طور پر یاد رہتی ہیں۔

[1] ہارس مین۔ امریکا کا ایک عالم تھا۔ فن تعلیم سے دلچسپی رکھتا تھا۔ ۱۷۹۶ء میں پیدا ہوا۔ اور ۱۸۵۹ء میں
انتقال کیا۔ مترجم

تعلیم کو دلکش اور باعث مسرت بنانے کے فوائد

علیٰ ہذا القیاس دوسری شرط جو پہلی شرط کے لئے لازم ہے اُس کی بھی یہی کیفیت ہے یعنی "تربیت کا جو طریقہ اختیار کیا جائے۔ وہ ایسا عمل ہونا چاہیئے جو فی الواقع مسرت انگیز ہو" یہ مسرت اُس ذاتی معاوضہ کی وجہ سے نہیں ہے جو ملنے والا ہے۔ بلکہ اُس کی ذاتی سودمندی کی وجہ سے ہے۔ اس شرط کے مطابق عمل کرنے سے ایک تو یہی فائدہ ہے کہ وہ ہم کو باقاعدہ عمل ارتقا میں مزاحمت کرنے سے باز رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی مہتم بالشان قطعی فوائد ضمناً حاصل ہوتے ہیں۔ جوانی کی خوشی کا قائم رکھنا بجائے خود ایک قابل قدر مقصد سمجھنا چاہیئے بجز اُس صورت کے کہ ہم راہبانہ اخلاق (بلکہ یوں کہو کہ بداخلاقی) کی طرف اُلٹے ہٹ جائیں۔ مگر ہم اس بحث کو طول نہیں دیتے اور اس بات کو بیان کرتے ہیں کہ عمل ذہن کے لئے جذبات نشاط انگیز حالت بے اعتنائی یا نفرت کی حالت سے بہت زیادہ مساعد ہوتی ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ جو باتیں ذوق وشوق سے پڑھی سُنی یا دیکھی جاتی ہیں وہ ان باتوں کی نسبت جو نفرت سے پڑھی سُنی یا دیکھی جاتی ہیں زیادہ اچھی طرح یاد رہ سکتی ہیں۔ جن قویٰ سے کام لیا جاتا ہے وہ پہلی حالت میں تو مستعدی سے مصروف ہوتے ہیں مگر دوسری حالت میں سُستی سے مصروف ہوتے ہیں اور ہمیشہ زیادہ دلکش خیالات کی طرف توجہ مبذول ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ توجہ کی زیادتی یا کمی کے اعتبار سے تاثرات قوی یا ضعیف ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ کسی مطالعہ میں ذوق وشوق نہ رکھنے کی وجہ سے طالب علم میں جو عقلی سُستی پیدا ہو جاتی ہے اُس پر سزا کا خوف اور زیادہ کرنا چاہیئے جو قوائے عقلیہ کو بے کار اور مُردہ کر دیتا ہے۔ اس سے توجہ پریشان ہو جاتی ہے اور جن باتوں سے اُس کے قوائے عقلیہ کو نفرت ہے اُن پر قوائے عقلیہ کو لگانے سے جو دقت پیش آتی ہے وہ اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ پس صاف ظاہر ہے کہ جس خوشی سے طالب علم اپنا کام پورا کرتا ہے

اُسی خوشی کی مناسبت سے تعلیم کارگر ہوتی ہے بشرطیکہ باقی امور مساوی ہوں۔

یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیئے کہ سنجیدہ اخلاقی نتائج اُس خوشی یا تکلیف پر منحصر ہیں جو روزانہ سبقوں سے عادۃً حاصل ہوتی ہے کون ہے جو دو لڑکوں کے چہروں اور اطوار کا مقابلہ کرے۔ یعنی ایک اُس لڑکے کے جو دلچسپ مضامین کے ذہن نشین کرنے کی وجہ خوش و خرم رہتا ہے اور دوسرے اُس لڑکے کے جو اپنے مطالعہ سے نفرت کرنے کی وجہ سے اپنی نالیاقتی کی وجہ سے جو اُسی نفرت کا نتیجہ ہے۔ نظر سردمہری کی وجہ سے زجر و توبیخ کی وجہ سے مصیبت زدہ رہتا ہے اور اُس کو یہ بات معلوم نہ ہو جائے کہ پہلے لڑکے کے مزاج کو فائدہ اور دوسرے کے مزاج کو نقصان پہنچ رہا ہے؟ جس شخص نے اس بات پر غور کیا ہے کہ کامیابی اور ناکامیابی سے نفس پر کیا کیا اثرات ہوتے ہیں اور اس بات پر بھی کہ نفس کو جسم پر کس قسم کا اقتدار حاصل ہے وہ دیکھ لے گا کہ پہلی حالت میں مزاج اور صحت دونوں پر عمدہ اثر پڑتا ہے مگر دوسری حالت میں اس بات کا اندیشہ ہے کہ اُس کے مزاج میں زود رنجی، بزدلی بلکہ خلقی افسردگی بھی مستقل طور پر پیدا نہ ہو جائے۔ ابھی ایک بالواسطہ نتیجہ اور باقی ہے جس کی وقعت کچھ کم نہیں ہے۔ جس مناسبت سے طریقۂ تعلیم مسرت یا مصیبت کا موجب ہوتا ہے اُسی مناسبت سے معلّمین اور متعلمین کے باہمی تعلقات دوستانہ اور موثر یا مخالفانہ اور کمزور ہوتے ہیں بشرطیکہ باقی امور مساوی ہوں۔ سب انسان بالکل اُن ہی خیالات کے قابو میں ہوتے ہیں جن سے اُن کا تعلق ہوتا ہے۔ جو شخص ہر روز تکلیف پہنچائے ممکن نہیں کہ اُس کو پوشیدہ طور پر ناپسندیدگی کی نظر سے نہ دیکھا جائے۔ اور اگر وہ تکلیف وہ خیالات کے سوا اور کسی قسم کے خیالات پیدا نہیں کرتا تو اُس سے یقیناً نفرت کی جائے گی۔ برعکس اس کے جو شخص بچوں کو اُن کے مقاصد میں ہمیشہ مدد دیتا ہے۔ فتح کی خوشیاں

اخلاقی فائدے تعلیم کو دلکش بنانے سے حاصل ہوتے ہیں

ہر وقت اُن کے لئے مُہیا کرتا ہی مشکلات کے حل کرنے میں ہر وقت اُن کی ہمت بندھاتا ہی اور اُن کی کامیابی میں ہمدردی ظاہر کرتا ہی۔ ایسے شخص کو بچے **پسند** کرتے ہیں۔ بلکہ اگر اُس کا برتاؤ ہمیشہ یکساں ہو تو ضرور اُس سے **محبت** کرنے لگیں گے۔ اور جب ہم اس بات کو یاد رکھیں کہ جس اُستاد کو شاگرد دوست سمجھتے ہیں اُس کا دباؤ بمقابلہ اُس اُستاد کے جس کو **نفرت** یا کم سے کم **بے اعتنائی** کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ کیسا موثر اور نرم ہوتا ہی تو ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ تعلیم کو مسرت کے اصول پر جاری رکھنے سے جو بالواسطہ فوائد حاصل ہوتے ہیں وہ بلا واسطہ فوائد سے کچھ کم نہیں ہیں۔ جس طریقہ تعلیم کی ہم نے یہاں حمایت کی ہی اگر لوگ یہ اعتراض کریں کہ اُس پر عمل درآمد ممکن نہیں ہی تو ہم حسب سابق اُن کو یہ جواب دیتے ہیں کہ نہ صرف **خیال** ہم کو اس طریقے کی طرف ہدایت کرتا ہی بلکہ **تجربہ** بھی اُس کی تائید کرتا ہی۔

**پستالوتزی** کے زمانے سے لے کر اس وقت تک جن ممتاز معلّموں نے اس طریقہ تعلیم کی تصدیق کی ہی اُن کی آرا کے ساتھ ہم **پروفیسر ملینز**[1] کی رائے کو یہاں شامل کر سکتے ہیں جن کا یہ قول ہی:—

دلکش طریقہ تعلیم نے ہی پروفیسر ملینز

"جہاں چھوٹے بچوں کو اس طرح تعلیم دی جاتی ہی جس طرح کہ دینی چاہیئے وہاں وہ مدرسے میں بالکل ایسے ہی خوش رہتے ہیں جیسے کھیل میں۔ اور شاذ و نادر ہی مدرسے کی نسبت کم خوش رہتے ہونگے یہیں بلکہ اکثر اوقات جسمانی ورزشوں کی نسبت عقلی قوتوں کی باقاعدہ مشق سے زیادہ خوش ہوتے ہیں"[2]

---

[1] جیمز ملینز ایڈن برگ یونیورسٹی کا پروفیسر اور فن تعلیم کا عالم تھا ۱۸۲۵ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۹۳ء میں انتقال کیا۔ مترجم

[2] اس مطلب کو نظیری نیشاپوری نے اس طرح ادا کیا ہی شعر

درسِ ادب اگر بود زمزمۂ محبتے — جمعہ بہ مکتب آورد طفلِ گریز پائے را

مترجم

ایک اور وجہ جس سے تعلیم کے بر دو اصول مذکورۂ بالا کی عظمت معلوم ہوتی ہے

ایسے طریقے سے تعلیم دینا جس سے **از خود** علم حاصل ہو سکے۔ جس کا یہی نتیجہ ہے کہ تعلیم ایک عمل **نشاط انگیز** ہو۔ اس کی آخری وجہ پیش کرنے کے لئے ہم اس بات پر غور کر سکتے ہیں کہ تعلیم جس قدر اس طریقے کے مطابق ہوگی اسی قدر ظن غالب ہے کہ وہ اختتام زمانۂ تعلیم کے بعد ختم نہ ہوگی۔ جب تک بچے تحصیل علم سے **عادۃً نفرت** کرتے رہیں گے اس وقت تک یہی میلان غالب رہے گا کہ والدین اور استادوں کے دباؤ سے آزاد ہوتے ہی علم کو خیرباد کہیں اور جب تحصیل علم **عادۃً** باعث مسرت ہوتی ہے اس وقت بغیر **نگرانی** کے بھی اپنے نفس کو آپ تعلیم دینے کا میلان جاری رہتا ہے جو پیشتر زیر **نگرانی** جاری تھا۔ یہ نتائج اٹل ہیں۔ جب کہ قوانین ائتلاف یا ذہنی تعلق کے قوانین صحیح ہیں یا بہ عبارت دیگر جب کہ لوگ ان چیزوں اور مقاموں کو ناپسند کرتے ہیں جن سے دردانگیز باتیں یاد آتی ہیں اور ان چیزوں اور ان مقاموں کو پسند کرتے ہیں جن سے گزری ہوئی خوشیاں یاد آتی ہیں تو اسی طرح دردانگیز سبق علم کو ناگوار اور نشاط انگیز سبق اس کو دلکش بناتے ہیں۔ جن لوگوں نے طفولیت میں بے لطف سبقوں کے ذریعے معلومات حاصل کی ہیں جس کے ساتھ سزا کی دھمکی بھی شامل تھی اور جن کو آزادانہ تحقیقات کی عادت کبھی نہیں ڈلوائی گئی۔ ایسے لوگ آئندہ عمر میں غالباً مطالعہ جاری نہیں رکھتے مگر جن لوگوں نے قدرتی طریق اور مناسب وقت پر ان معلومات کو حاصل کیا ہے اور جو معلومات کو نہ صرف اس حیثیت سے یاد رکھتے ہیں کہ وہ بذات خود دلچسپ ہیں بلکہ اس حیثیت سے بھی کہ وہ نشاط انگیز کامیابیوں کے ایک دراز سلسلے کی یادگاریں ہیں ایسے لوگ اپنے نفس کو آپ تعلیم دینا جاری رکھیں گے جس کا آغاز طفولیت میں ہوا تھا۔

# باب سوم

## تعلیم اخلاق

موجودہ نظام تعلیم کا سب سے بڑا نقص جو عموماً نظرانداز کردیا جاتا ہے

ہمارے نصاب تعلیم میں جو نقص سب سے بڑا ہی اس کو بالکل ہی نظرانداز کر دیا گیا ہی۔ ہمارے طرق تعلیم کی تفصیلی ترقی کے لئے مضمون اور طریقہ دونوں کے اعتبار سے بہت کچھ کوشش ہورہی ہی۔ مگر جو ضرورت نہایت سخت ہی اُس کو اب تک بہ حیثیت ضرورت تسلیم ہی نہیں کیا گیا۔ اس بات کو تو بے چون وچرا تسلیم کیا جاتا ہی کہ "نوجوانوں کو فرائض زندگی کے لئے تیار کرنا" ایسا مقصد ہی جو والدین اور معلموں کو پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ اور خوش قسمتی سے جو چیزیں پڑھائی جاتی ہیں اُن کی قدر و قیمت کا اور اُن چیزوں کی تعلیم میں جو طریقے اختیار کئے جاتے ہیں اُن کی عمدگی کا اندازہ بھی آج کل صریحاً اس بات سے کیا جاتا ہی کہ آیا وہ چیزیں اور وہ طریقے اس مقصد کے واسطے مناسب ہیں یا نہیں اسی بنا پر خالص السنہ قدیم کی تعلیم کو ایسی تعلیم سے بدلنے پر دلیلیں پیش کی جاتی ہیں جس میں زمانہ حال کی زبانیں بھی شامل ہوں۔ نصاب تعلیم میں سائنس کی مقدار بڑھانے کی ضرورت پر بھی اسی سبب سے زور دیا جاتا

ہے۔ لیکن اگرچہ لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کو اپنے شہر اور جماعت کے قابل بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ تاہم اُن کو **منصب والدین** کے لائق بنانے کے لئے کچھ بھی احتیاط نہیں کی جاتی۔ یہ بات دیکھی جاتی ہے کہ حصول معاش کی غرض سے پوری پوری تیاری کی ضرورت ہے۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ تربیت اطفال کے لئے کسی قسم کی تیاری ضرور نہیں سمجھی جاتی۔ ایک لڑکے کے بہت سے سال اُس علم کے حاصل کرنے میں صرف ہوجاتے ہیں جس کی بڑی قیمت یہ ہے کہ وہ "ایک شریف آدمی کی تعلیم" کے لئے مخصوص ہے۔ اور ایک لڑکی کے بہت سے سال اُن آرائشی فنون کی تحصیل میں صرف ہوجاتے ہیں جو اُس کو شبانہ جلسوں میں شامل ہونے کے لائق بناتے ہیں۔ مگر سب سے بھاری ذمہ داری یعنی **انتظام خانہ داری** کی تیاری میں کسی لڑکے یا لڑکی کا ایک گھنٹہ بھی صرف نہیں ہوتا کیا یہ ذمہ داری **ایسی ہے** جس کے عائد ہونے کا ایک بعید احتمال ہے؟ برعکس اس کے دس میں سے نو پر یہ ذمہ داری یقیناً عائد ہوگی۔ کیا یہ **بات ہے** کہ اس ذمہ داری کا پورا کرنا آسان ہے؟ یقیناً نہیں۔ جو فرائض جوان آدمی کو ادا کرنے پڑتے ہیں اُن میں سب سے زیادہ مشکل یہی ہے۔ **کیا یہ بات ہے** کہ ہم ہر ایک لڑکے یا لڑکی پر بھروسہ کرسکتے ہیں کہ وہ از خود تعلیم حاصل کرکے اپنے آپ کو باپ یا ماں کا فرض ادا کرنے کے لائق بنا سکتا یا بنا سکتی ہے؟ نہیں۔ صرف یہی بات نہیں کہ اس طرح از خود تعلیم حاصل کرنے کی ضرورت کو کسی نے تسلیم نہیں کیا بلکہ یہ مضمون اپنی پیچیدگی کی وجہ سے من جملہ دیگر مضامین کے ایسا بن گیا ہے جن میں از خود تعلیم حاصل کرنے سے کامیابی کا احتمال بہت ہی کم ہے فن تعلیم و تربیت کو نصاب سے خارج رکھنے کے لئے کوئی معقول عذر پیش نہیں کیا جا سکتا۔ ہم کو یہ بات تسلیم کرنی چاہیئے کہ بچوں کی جسمانی عقلی اور اخلاقی تربیت کے صحیح طریقوں کا علم نہایت ہی مہتم بالشان علم ہے خواہ اس حیثیت سے کہ خود والدین کی خوشی پر اُس کا اثر پڑتا ہے اور خواہ اس حیثیت سے کہ وہ اُن کی اولاد اور بعید

نسلوں کی خصلت اور زندگی پر موثر ہوتا ہے۔ یہ مضمون اُس نصاب تعلیم کا آخری مضمون ہونا چاہیئے جو ہر مرد و زن کو طے کرنا پڑتا ہے۔ جس طرح حالت بلوغ اولاد پیدا کرنے کی قابلیت سے پہچانی جاتی ہے اسی طرح ذہنی پختگی اُس اولاد کو تربیت کرنے کی قابلیت سے پہچانی جاتی ہے۔ وہ مضمون جو سب مضمونوں پر حاوی ہے۔ اور اسی لئے وہ مضمون جس سے تعلیم معراج کمال پر پہنچنی چاہیئے تعلیم کا خیال اور عمل ہے۔

اخلاقی تعلیم انتظام کی خرابی اور اُس کی

چونکہ اس تعلیم کے لئے تیاری نہیں ہوتی اس لئے بچّوں کا انتظام اور بالخصوص اخلاقی انتظام ایسا خراب ہے کہ اسے دیکھ کر افسوس ہوتا ہے۔ والدین یا تو اس معاملہ پر کبھی غور نہیں کرتے یا اُن کے مشاہدات و اصول نامکمل اور متناقض ہوتے ہیں۔ اکثر حالتوں میں۔ اور خاص کر ماؤں کی طرف سے جو برتاؤ ہر موقع پر اختیار کیا جاتا ہے وہی ہوتا ہے جو بروقت سوجھ جائے۔ یہ برتاؤ کسی ایسے یقین پر مبنی نہیں ہوتا جو بحث و دلیل سے حاصل ہو کہ بچّے کو سب سے زیادہ فائدہ کس چیز سے پہنچے گا۔ بلکہ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ والدین کے خیالات کا رجحان کس طرف ہے۔ اور جوں جوں یہ خیالات بدلتے رہتے ہیں وہ برتاؤ بھی گھڑی گھڑی بدلتا رہتا ہے یا اگر جذبات کی ہدایتوں کے ساتھ بعض قطعی اصول و طرق کو بھی بطور ضمیمہ شامل کرلیا جاتا ہے۔ تو یہ اصول و طرق وہی ہوتے ہیں جو سلف سے سینہ بسینہ چلے آتے ہیں یا بچپن کی یاد کی ہوئی باتوں سے دل میں پیدا ہوتے ہیں یا اناؤں اور نوکروں سے حاصل ہوتے ہیں۔ یہ ایسے طریقے ہیں جو زمانہ کی روشنی نے نہیں بلکہ جہالت نے تجویز کئے ہیں ضبط نفس کے متعلق لوگوں کی رائے اور اُن کے بے سرو پا عمل پر بحث کرتے ہوئے رکرٹ[ل] نے یہ لکھا ہے:۔

ل رکرٹ ملک جرمنی کا ایک مصنف ہے ۱۷۶۳ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۲۶ء میں فوت ہوا۔ مترجم

اخلاقی تعلیم کی ابتر حالت کے متعلق رکرٹ شناؔ کا بیان

" اگر بہت سے معمولی باپوں کے پوشیدہ تلونّات کو ظاہر کیا جائے اور اخلاقی تعلیم کے لئے ان کو مرتب کرکے مطالعہ اور خواندگی کا دستورالعمل بناکر پیش کیا جائے تو اُن تلونات کی صورت کچھ اس طرح ہوگی **پہلے گھنٹے** میں خالص اخلاقی اصول بچّے کو پڑھا کر سُنائے جائیں۔ خواہ میں خود سُناؤں خواہ اتالیق سُنائے، **دوسرے گھنٹے** میں مخلوط اخلاقی اصول یعنی وہ اصول جو کسی کے ذاتی فائدے کے متعلق ہوں، **تیسرے گھنٹے** میں کیا تم نہیں دیکھتے کہ تمہارا باپ فلاں فلاں کام کرتا ہے؟ **چوتھے گھنٹے** میں تم چھوٹے بچے ہو اور یہ کام صرف بڑے آدمیوں کے لائق ہے۔ **پانچویں گھنٹے** میں۔ بڑی بات یہ ہے کہ تم کو دنیا میں کامیاب ہونا چاہیئے اور سلطنت میں کچھ نہ کچھ بن جانا چاہیئے۔ **چھٹے گھنٹے** میں۔ آدمی کی قدر کا فیصلہ عالم فانی میں نہیں بلکہ عالم جاودانی میں ہوتا ہے۔ **ساتویں گھنٹے** میں اس لئے بہتر یہ ہے کہ ظلم کی برداشت کرو اور مہربانی سے پیش آؤ۔ **آٹھویں گھنٹے** میں۔ اگر کوئی تم پر حملہ کرے تو بہادری سے اپنے آپ کو بچاؤ **نویں گھنٹے** میں، پیارے بچّے غل نہ کرو **دسویں گھنٹے** میں بچے کو ایسا چپ چاپ نہیں بیٹھنا چاہیئے **گیارہویں گھنٹے** میں تم کو زیادہ اچھی طرح اپنے ماں باپ کے حکموں کو ماننا چاہیئے۔ **بارہویں گھنٹے** میں اپنے آپ کو تعلیم دو۔ اس طرح اپنے اصول کو گھڑی گھڑی بدلنے سے باپ ان کی لغویت اور یک رُخی کو چھپاتا ہے۔ اب رہی اُس کی بیوی وہ نہ تو اپنے خاوند کی مانند ہے اور نہ اس نقال ہی کی مانند ہے جو دونوں بغلوں میں کاغذات کا لبتہ لئے ہوئے اسٹیج (تماشہ گاہ) پر آموجود ہوا تھا اور اس سوال کے جواب میں کہ "تمہاری داہنی بغل میں کیا ہے" اُس نے کہا "احکام"، اور اس سوال

کے جواب میں کہ تمہاری بائیں بغل میں کیا ہے؟ اُس نے کہا مخالف احکام۔ مگر
بچے کی ماں کا مقابلہ بریارُوس[1] دیو سے کیا جائے تو بہت بہتر ہے جس کے
سو ہاتھ تھے اور ہر ہاتھ کی بغل میں کاغذات کا ایک بستہ تھا ...”

کسی امر میں اصلاح کی توقع جلد نہ کرنی چاہیے

یہ حالت جلد تبدیل نہیں ہوسکتی قبل اس کے کہ اس حالت میں کسی بڑی اصلاح کی توقع کی جاسکے کئی نسلوں کا گزر جانا ضروری ہے ملکی قوانین کی طرح تعلیمی اصول بھی بنائے نہیں جاتے بلکہ آہستہ آہستہ نشوونما پاتے ہیں۔ اور تھوڑے تھوڑے عرصہ میں نشوونما محسوس نہیں ہوسکتا۔ ہر ایک ترقی آہستہ آہستہ تو ہوا ہی کرتی ہے تاہم یہی ترقی اپنے وسائل کے استعمال پر دلالت کرتی ہے اور منجملہ دیگر وسائل کے ایک وسیلہ مباحثہ بھی ہے۔

فطرت انسانی کی بابت لارڈ پامرسٹن کی رائے اور اس بارہ میں حکم اختلاف

ہم اُن لوگوں میں نہیں ہیں جو لارڈ پامرسٹن[2] کے اس اصول کے معتقد ہیں کہ ”تمام بچے نیک پیدا ہوتے ہیں“ بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مخالف اصول بہ حیثیت مجموعی راستی سے اس قدر دور نہیں ہے، اگرچہ مستحکم وہ بھی نہیں ہے ہم اُن لوگوں سے بھی متفق نہیں ہیں جو یہ خیال کرتے ہیں کہ عاقلانہ تربیت سے بچوں کو بالکل ایسا ہی بنا سکتے ہیں جیسا اُن کو ہونا چاہیے۔ برخلاف اس کے ہم کو اطمینان ہے اگرچہ فطرت کے عیوب عاقلانہ انتظام سے کم ہوسکتے ہیں مگر دور نہیں ہوسکتے۔ یہ خیال کہ ”کامل طریقہ تعلیم سے انسان کامل فوراً پیدا ہوسکتا ہے“ قریب قریب اسی خیال کے موافق ہے جو شیلی[3] کی نظموں میں کنایۃً ظاہر کیا گیا ہے کہ اگر نوع انسان اپنے قدیم آئین اور تعصبات کو ترک کردے تو دنیا

[1] قدیم یونانیوں کے قصے کہانیوں میں بریارس ایک دیو کا نام ہے جس کے پچاس سر اور سو ہاتھ تھے ۱۲ مترجم

[2] لارڈ پامرسٹن۔ انگلستان کا ایک سربرآوردہ امیر اور وزیر اعظم تھا ۱۷۸۴ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۶۵ء میں انتقال کیا ۱۲ مترجم

[3] شیلی انگلستان کا ایک مشہور شاعر تھا ۱۷۹۲ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۲۲ء میں انتقال کیا ۱۲ مترجم

کی تمام برائیاں فی الفور کافور ہوجائیں۔ جن لوگوں نے انسانی معاملات کا مطالعہ بے تعصبانہ طریق سے کیا ہے وہ ان دونوں خیالوں میں سے کسی ایک خیال کو بھی قبول نہیں کر سکتے۔[1]

تاہم جو لوگ اس قسم کی نہایت پُرجوش اُمیدیں رکھتے ہیں ہم کو اُن کے ساتھ ہمدردی کرنی مناسب ہے **جوش** اگر دیوانگی کی حد کو پہنچ جائے تو بھی وہ ایک مفید بلکہ شاید نہایت ضروری **قوت محرکہ** ہے۔ یہ بات ظاہر ہے کہ مدبر سلطنت کبھی اُن مشقتوں کو نہ جھیلتا اور اُن نقصانات کو گوارا نہ کرتا جو کہ وہ جھیلتا اور گوارا کرتا ہے اگر اُس کو یہ یقین نہ ہوتا کہ جس بات کی اصلاح کے لئے وہ لڑ رہا ہے وہ ہی ایک شے ضروری ہے جو شخص مسکرات سے قطعاً پرہیز کرتا ہے اگر اُس کو اس بات کا یقین نہ ہوتا کہ **نشہ بازی** تمام قومی برائیوں کی جڑ ہے تو وہ اُس قدر زور شور سے ترکِ مسکرات کی تحریک نہ کر سکتا مثل دیگر کاموں کے "محبِ انسانی" کے کاموں میں بھی **تقسیم محنت** سے بڑا نفع حاصل ہوتا ہے اور محنت کی تقسیم جب ہی ہو سکتی ہے کہ "محبانِ انسانی" کی ہر ایک جماعت اپنے فرض کی کم و بیش تابع ہو جائے یعنی اُس جماعت کو اپنے کام کا بہت ہی زیادہ اعتقاد ہو۔ یہی جو لوگ عقلی یا اخلاقی تعلیم کو ایسا سمجھتے ہیں کہ یہی تعلیم ہر مرض کی دوا ہے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اُن کی ناواجب توقعات "بے فائدہ نہیں ہیں" اور شاید خدا تعالیٰ کے رحیمانہ نظام کائنات کا ایک جزو یہ بھی ہے کہ ان لوگوں کے اعتقاد میں تزلزل واقع

کسی مفید کام کی دُھن اگر دیوانگی تک پہنچ جائے تو بھی مفید ہے

---

[1] یہ مسئلہ فلسفۂ اخلاق کے نہایت اہم مسائل میں سے ہے اور تمام فلسفۂ اخلاق کی بنیاد ہے ہم بخوف طوالت یہاں اس مسئلہ پر بحث نہیں کر سکتے۔ اخلاق ناصری اور اخلاق جلالی میں بڑی تفصیل سے اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے علیٰ نہایت قابلیت کے ساتھ حکما کے اقوال اور اُن کے دلائل کو بیان کر کے ہی قول فیصل لکھا ہے۔ ناظرین بطور خود ان کتابوں میں اس مسئلہ کا مطالعہ کر سکتے ہیں ۱۲ مترجم

نہیں ہو سکتا[1]

والدین کا علم رویہ اور اولاد کے ساتھ اُن کے سخت برتاؤ کی چند مثالیں

اگر یہ بات سچ ہو کہ "اخلاقی انتظام کے کسی ممکن طریقے سے بچّوں کو جس قالب میں چاہیں ڈھال سکیں" اور یہ طریقہ ہر ایک ماں باپ کے ذہن نشین کر دیا جائے تو بھی جو مقصد مدنظر ہے ہم اس کے حاصل کرنے سے دور رہیں گے لوگ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ اس قسم کے کسی طریقے کا عمل میں لانا گویا پہلے سے اس بات کا فرض کر لینا ہے کہ بالغوں میں **عقل، نیکی** اور **ضبط نفس** بدرجۂ کمال موجود ہیں حالانکہ وہ کسی میں نہیں ہوتیں۔ جو لوگ خانگی تربیت کے مسائل پر بحث کرتے ہیں ان کی غلطی یہ ہے کہ وہ جملہ عیوب و مشکلات کو بچّوں کی طرف منسوب کرتے ہیں اور والدین کی طرف ایک کو بھی منسوب نہیں کرتے **انتظام عیال** کی بابت، جیسا کہ **قومی گورنمنٹ** کے متعلق خیال کیا جاتا ہے یہ بات عموماً فرض کر لی جاتی ہے کہ خوبیاں خوبیاں تو حاکم میں ہیں اور برائیاں برائیاں **محکوم** میں ہیں۔ اگر تعلیمی خیال سے اندازہ کیا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ مردوں اور عورتوں کو جو تعلقات اپنی اولاد کے ساتھ ہیں ان کی شکل بالکل بدل گئی ہے جن باشندگان شہر سے ہم معاملہ کرتے ہیں اور جن لوگوں سے ہم دنیا میں ملتے جلتے ہیں ہم جانتے ہیں کہ وہ بہت ناقص مخلوق ہیں آئے دن کی **تکا فضیحتی** سے، دوستوں کے **جھگڑوں قصّوں** سے **دیوالوں** کی حقیقت کھل جانے سے، **مقدمہ بازی** سے، **پولیس رپوٹوں** سے، لوگوں کی **خودغرضی**، **بددیانتی**، اور **بے رحمی** جو چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے ہمیشہ ہمارے مشاہدہ میں آتی رہتی ہے۔ مگر جب ہم انتظام تربیت اطفال پر نکتہ چینی کرتے ہیں اور بچّوں کی بدراہی پر بحث کرتے ہیں تو ہم عادۃً یہ بات تسلیم کر لیتے

---

[1] مولانا روم نے اسی مضمون کی طرف اس شعر میں اشارہ کیا ہے ؎

ہر یکے را بہر کارے ساختند ۔ میل او را در دلش انداختند

(مترجم)

ہیں کہ یہ مجرم اشخاص اپنے لڑکوں اور لڑکیوں کے ساتھ برتاؤ کرتے ہیں اخلاقی جرم
سے بری ہیں! یہ بات حقیقت سے اس قدر بعید ہے کہ خانگی ابتری کے ایک بڑے
حصّے کی بات جس کو عموماً بچّوں کی کجروی سے منسوب کیا جاتا ہے،
ہم والدین کی بدعملی پر الزام لگانے میں پس وپیش نہیں کرتے۔ ہم
یہ بات اُن لوگوں کی نسبت نہیں کہتے جو بچّوں کے ساتھ زیادہ ہمدردی کرنے والے
اور اپنے نفس پر زیادہ قابو رکھتے ہیں (اور ہم کو اُمید ہے کہ اس کتاب کے پڑھنے والوں میں
سے اکثر آدمی اس جماعت میں داخل ہونگے) بلکہ ہم عوام الناس کی بابت ایسا کہتے
ہیں جو ماں اپنے ننھے بچّے کو گھڑی گھڑی اس وجہ سے خفا ہو کر جھنجھوڑتی ہے کہ وہ دودھ
نہیں پیتا اُس سے کس قسم کی اخلاقی تربیت کی توقع کی جاسکتی ہے؟ اور ہم نے ایک
ماں کو ایسا کرتے دیکھا ہے جب باپ کی توجہ بچّے کی چیخ سے اس امر کی طرف مائل ہوئی
ہے کہ بچّے کی اُنگلی کھڑکی کے کواڑ اور چوکھٹ کے بیچ میں آکر کچلی گئی ہے اور وہ بچّے کو
اس مصیبت سے رہائی دینے کے بجائے پیٹنا شروع کرے۔ بھلا ایسا باپ انصاف کا
احساس غالباً کس قدر اپنے بچّے کے دل میں ڈال سکتا ہے؟ تاہم اس بات کی تصدیق
کہ ایسے باپ موجود ہیں ہم کو ایک عینی گواہ سے ہوئی ہے یا اس سے بھی زیادہ سخت حالت
کو، اس کی تصدیق بھی بلاواسطہ شہادت سے ہو چکی ہے۔ وہ یہ ہے کہ جس لڑکے کی ران کی
ہڈی اُتر گئی ہو اور اُس کو اٹھا کر گھر میں لائیں تو بید سے اُس کی مزاج پرسی کی جائے
اُس کی تربیت کی کیا خاک اُمید ہو سکتی ہے؟ یہ سچ ہے کہ یہ انتہائی کجروی کی مثالیں ہیں
یعنی یہ مثالیں نوع انسان میں اُس کورانہ طبیعی میلان کو ظاہر کرتی ہیں جو حیوانات
کو اپنی نسل کے کمزوروں اور صدمہ رسیدوں کو ضائع کرنے کی طرف راغب
کرتا ہے۔ اگرچہ یہ مثالیں حد درجے کی ہیں۔ پھر بھی اُن خیالات اور اُس چال چلن کا نمونہ
جو بہت سے گھرانوں میں دیکھا جاتا ہے۔ کون ہے جس نے اناؤں یا ماں کے ہاتھ سے بچّے کو دق

کرنے کی وجہ سے، جو غالباً کسی جسمانی تکلیف کا نتیجہ ہے، طمانچہ کھاتے ہوئے بارہا نہیں دیکھا ہے؟ جب ننھا بچہ گر پڑا ہو اور ماں اس کو اٹھاتے وقت سخت طریقہ اور درشت الفاظ میں یکایک یہ کلمہ زبان پر لائے کہ "ارے احمق چھوٹے بچے"! تو کون ہے جس نے اس بات سے اکثر اوقات اس رد و رنج کا پتا نہ لگایا ہو جو آئندہ کی بے انتہا کل کل جھک جھک کی پیشین گوئی کرتی ہے؟ جس **کرخت لہجے** میں ماں باپ بچوں کو خاموش رہنے کا حکم دیتا ہے کیا وہ لہجہ اس بات کا ثبوت نہیں کہ وہ بچوں کے ساتھ کم ہمدردی رکھتا ہے؟ کیا دائمی اور بسا اوقات بالکل غیر ضروری **روک ٹوک** جو بچوں پر کی جاتی ہے **مثلاً** نچلے بیٹھے رہنے کا حکم جس کی تعمیل سخت عصابی تکلیف اٹھائے بغیر چونچال بچہ کر نہیں سکتا **یا مثلاً** یہ حکم کہ ریل کے سفر کے وقت کھڑکی سے باہر منہ نکال کر نہ دیکھو، اس کو ذی سمجھ والا بچہ بھی سخت محرومی سمجھتا ہے۔ ہم پوچھتے ہیں کیا یہ روک ٹوک اس بات کی علامت نہیں ہے کہ بچوں کے ساتھ بہت ہی کم ہمدردی برتی جاتی ہے۔

بزرگوں کے خصائل اُن کی نسلوں کو وراثۃً پہنچتے

سچ یہ ہے کہ **اخلاقی تعلیم کی دقتوں کی بنیاد دراصل دو چیزیں ہیں، یعنی یہ دقتیں والدین اور اولاد دونوں کے مشترک عیبوں سے پیدا ہوتی ہیں**۔ اگر عادات وخصائل کا ابا عن جد اولاد تک وراثۃً پہنچنا **قدرت کا قانون ہے** جیسا کہ **علم حیوانات** کے ہر ایک عالم کو معلوم ہے اور جس کو ہماری روز مرہ گفتگو اور مروجہ **ضرب المثلیں**[1] تسلیم کرتی ہیں تو علی العموم **بچوں کے عیب اُن کے والدین کے عیبوں کا آئینہ ہیں**۔ ہم نے لفظ "علی العموم" کہا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ بعید مورثوں کے خط وخال جو اولاد تک پہنچتے ہیں اُن کی وجہ سے نتائج پیچیدہ ہو جاتے ہیں۔ اس لئے یہ مطابقت خاص امور میں نہیں بلکہ صرف عام امور میں ہوتی

[1] اردو میں ایسے موقعے پر یہ مثل بولی جاتی ہے "باپ پر پوت پتا پر گھوڑا۔ بہت نہیں تو تھوڑا تھوڑا" اور عربی میں کہتے ہیں الولد سر لابیہ (بیٹا باپ کا بھید ہے) مترجم

ہی۔ اور اگر یہ موروثی عیب علی العموم موجود رہتے ہیں تو وہ خراب جذبات جن کی روک ٹوک والدین کو اپنی اولاد میں کرنی پڑتی ہی۔ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ ویسے ہی خراب جذبات خود والدین میں موجود ہیں گو ممکن ہی کہ عوام الناس کی نظروں سے چھپے ہوئے یا شاید دیگر خیالات میں دبے ہوئے ہوں مگر ہوتے ضرور ہیں۔ پس صاف ظاہر ہی کہ **کسی کامل طریقہ تربیت کے عام طور پر رواج پانے کی امید نہیں ہی**۔ کیونکہ والدین ایسے نیک نہیں ہیں جیسے ہونے چاہئیں۔

اخلاقی تعلیم قوم کی عام خصلت اور انسانی فطرت کی تمام حالت کے موافق ہوتی ہی

علاوہ بریں اگر ایسے طریقوں کا کہیں وجود ہوتا جن کے ذریعے سے مقصد مطلوب فوراً پورا ہوسکتا اور ماں باپ میں اس قدر **بصیرت**، **ہمدردی** اور تحمل ہوتا کہ وہ ان طریقوں کو معقول طور پر کام میں لاسکتے۔ تو بھی یہ بحث کی جاسکتی ہی کہ جتنی مدت میں دیگر امور کی اصلاح ہوتی ہی اُس سے جلد **انتظام عیال** کی اصلاح کرنے سے کچھ فائدہ نہیں ہی۔ غور تو کرو کہ ہمارا مقصد کیا ہی؟ کیا تعلیم کا بلاواسطہ مقصد ہی نہیں ہی کہ بچے کو زندگی کے کاروبار کے لئے تیار کیا جائے" یا یوں کہو کہ ایک ایسا باشندۂ شہر پیدا کیا جائے جو **نیک چلن** بھی ہو اور دنیا میں اپنے **گزارہ کی سبیل** بھی نکال سکے! اور کیا دنیا میں گزارہ کی سبیل نکالنا (جس سے ہماری مراد دولت کا حاصل کرنا نہیں بلکہ اُس سرمایہ کا حاصل کرنا ہی جو خاندان کی پرورش کے لئے ضروری ہی) اس امر پر دلالت نہیں کرتا کہ دنیاوی معاشرت کے لئے جیسی کہ دنیا کی موجودہ حالت ہی۔ ایک خاص طرح کی قابلیت پیدا کی جائے؟ اور اگر تعلیم و تربیت کے کسی طریقے سے "انسانِ کامل" کا نمونہ پیدا ہوسکتا تو کیا یہ بات مشتبہ نہیں ہی کہ وہ حالت موجودہ کے اعتبار سے دنیا کے قابل ہوتا یا نہیں؟ برعکس اس کے کیا ہم یہ گمان نہیں کرسکتے کہ ضرورت سے زیادہ راستی کا احساس اور اعلیٰ چال چلن کا معیار زندگی کو دبال بلکہ محال نہ بنا دیتا؟ اگر **شخصی** حیثیت سے غور کیا جائے تو اس کا نتیجہ خواہ کیسا ہی قابلِ تعریف ہوتا مگر جہاں تک کہ **قوم**

اور نسل کا تعلق ہے، کیا وہ نتیجہ آپ اپنی نا می کا باعث نہ ہوتا؟ اس خیال کی کافی وجہ موجود ہے کہ قوم میں کیا۔ اور خاندان میں کیا۔ حکومت کی نوعیت بہ حیثیت مجموعی اتنی ہی عمدہ ہوتی ہے جتنی کہ فطرت انسانی کی حالت اُس کو عمدہ ہونے کی اجازت دیتی ہے۔ ہم دلیل سے ثابت کر سکتے ہیں کہ پہلی اور دوسری دونوں صورتوں میں لوگوں کی عام خصلت ہی اس بات کا فیصلہ کرتی ہے کہ اُن پر کس قسم کی حکومت کی جائے۔ دونوں صورتوں میں یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ "عام خصلت کی اصلاح طریقہ کی اصلاح کی طرف ہدایت کرتی ہے۔ اس کے علاوہ اگر طریقہ کی اصلاح عام خصلت کی اصلاح سے قبل ممکن ہوتی تو اس سے خرابی پیدا ہوتی نہ کہ بھلائی"۔ جس درجے کی سختی والدین اور معلموں کے ہاتھوں بچے آج کل جھیلتے ہیں ہم خیال کر سکتے ہیں کہ وہ صرف اُس بڑی سختی کے لئے تیاری ہے جس سے اُن کو دنیا میں مقابلہ کرنا پڑے گا۔ اور اور اس بات پر بھی زور دیا جا سکتا ہے کہ اگر والدین اور معلموں کے لئے یہ بات ممکن ہوتی کہ وہ کامل انصاف اور پوری ہمدردی سے بچوں کے ساتھ سلوک کریں تو اس سے وہ تکلیفیں اور بھی سخت ہو جاتیں جو آئندہ زندگی میں لوگوں کی خودغرضی کی وجہ سے اُن کو ضرور جھیلنی پڑتی ہیں[1]۔

[1] عام مدارس میں لڑکوں کے ساتھ جو سخت برتاؤ کیا جاتا ہے بعض آدمی اس کی تائید میں اسی قسم کا عذر پیش کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ لڑکے مدرسہ میں داخل ہو کر گویا ایک چھوٹی دنیا میں داخل ہوتے ہیں اور اس دنیا کی سختیاں اُن کو اصلی دنیا کی سختیوں کے لئے تیار کرتی ہیں۔ یہ بات ضرور ماننی چاہیئے کہ یہ عذر کسی قدر قوت رکھتا ہے۔ مگر یہ بہت ناکافی عذر ہے۔ وجہ یہ ہے کہ خانگی تعلیم اور مدرسی تعلیم زمانۂ بلوغ کی تعلیم کی نسبت اگرچہ بہت بہتر نہیں ہونی چاہئے پھر بھی کسی قدر بہتر تو ہونی چاہیئے مگر ایٹن - ونچسٹر - ہیرو وغیرہ مدرسوں میں جس تعلیم سے لڑکوں کو پالا پڑتا ہے وہ تعلیم زمانہ جوانی کی نسبت زیادہ خراب ہے بلکہ زیادہ "نا منصفانہ اور بے دردانہ ہے۔ ہمارے عام مدارس کی تعلیم انسانی ترقی میں ممد و معاون ہونے کے بجائے جیسا کہ ہر قسم کی تعلیم کو ہونا چاہیئے۔ لڑکوں کو ظالمانہ طرز حکومت اور ایسے تعلقات کا عادی بنا دیتی ہے جو وحشیانہ طاقت سے منضبط رہتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے اس تعلیم کا میلان اس امر کی طرف ہے کہ قوم کی جو حالت موجودہ ہے اُس سے ادنیٰ درجے کی حالت کے لئے لڑکوں کو تیار کیا جائے۔ اور چونکہ ہمارے واضعان قوانین کی جماعت خاص کر اُن لوگوں میں سے بھرتی کی جاتی ہے جنہوں نے ایسے ہی مدرسوں میں تعلیم پائی ہے۔ اس لئے وحشیانہ اثر قومی ترقی میں سد راہ ہوتا ہے"۔ مصنف

بیانِ مذکورہ بالا پر ایک اعتراض اور اس کا جواب

مگر ایک شخص یہ **سوال** کرسکتا ہے کہ "کیا اس بیان سے ایسی باتیں ثابت نہیں ہوتیں جن کی ضرورت نہیں ہے؟ اگر اخلاقی تعلیم کا کوئی طریقہ بچوں کو ایسا نہیں بنا سکتا جیسا کہ اُن کو ہونا چاہیے۔ اگر کوئی ایسا طریقہ موجود ہو جو اُن کو ایسا بنا سکے تو بھی موجودہ والدین اس قدر ناقص ہیں کہ اُس کو عمل میں نہیں لاسکتے اور اگر ایسے طریقے کو کامیابی کے ساتھ عمل میں لاسکیں تو بھی اُس کے نتائج قوم کی موجودہ حالت سے سخت ناموافق ہونگے **تو کیا** اس کا یہی نتیجہ نہیں ہے کہ طریقۂ مروجہ کی اصلاح نہ تو ممکن ہے اور نہ ضروری؟ نہیں۔ بلکہ **صرف یہ نتیجہ** نکلتا ہے کہ خانگی انتظام کی اصلاح دوسری اصلاحوں کے قدم بہ قدم چلنی چاہیئے۔ **صرف یہ نتیجہ** نکلتا ہے کہ تربیت کے طریقوں میں بجز اس کے کہ اصلاح بتدریج کی جائے نہ تو اصلاح ہوسکتی ہے اور نہ ہونی چاہیے۔ **صرف یہ نتیجہ** نکلتا ہے کہ مجرد راستی عملی حیثیت سے فطرتِ انسانی کی موجودہ حالت یعنی اولاد والدین اور تمام قوم کے عیوب کی یقیناً تابع رہیگی اور زیادہ عمدہ طور پر صرف اُس وقت پوری ہو سکے گی جب کہ عام خصلت بہتر ہوجائے۔

اسی بیان پر ایک اعتراض اور اس کا جواب

ہمارا معترض یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ "پھر کم از کم یہ تو صاف ظاہر ہے کہ تربیت خاندان کا کوئی **کامل معیار** قائم کرنا صریحاً بے فائدہ ہے۔ جو طریقے زمانہ کی رفتار سے آگے بڑھے ہوئے ہیں محنت اُٹھا کر اُن کی تکمیل کرنے اور لوگوں کو اُن کی طرف رغبت دلانے سے کچھ فائدہ نہ ہوگا"۔ ہم اس **اعتراض** کی بھی مخالفت کرتے ہیں جس **طرح** ملکی حکومت میں گو **خالص راستی** سردست ناممکن العمل ہو لیکن اس بات کا جاننا کہ حق کیا ہے اس لئے ضروری ہے کہ جو تغیرات واقع ہوں وہ **حق کی طرف** مائل ہوں نہ کہ **حق سے منحرف** ہوں۔ **اسی طرح** خانگی حکومت میں کامل نمونہ قائم کرنا چاہیئے تاکہ رفتہ رفتہ اس نمونہ کے قریب قریب پہنچ سکیں۔ ہم کو ایسے کامل نمونے کے قائم کرنے سے خراب نتائج کا اندیشہ نہیں کرنا چاہیے۔ قدیم رسوم و آئین کو برقرار رکھنے کا طبیعی میلان

نسل انسانی میں اس قدر قوی ہی کہ کسی شے میں بہت جلد تغیر واقع ہونے کو روکتا ہی۔ سب کاموں کا انتظام کچھ اسی قسم کا ہی کہ جب تک لوگ آہستہ آہستہ اعلیٰ اعتقاد کی سطح تک نہ پہنچ جائیں وہ اُس کو قبول نہیں کرسکتے۔ گو یہ ممکن ہی کہ برائے نام اُس کو تسلیم کرلیں مگر حقیقتہً تسلیم نہیں کرسکتے۔ اور جب کوئی حقیقت مسلّم قرار پاجاتی ہی تو بھی اُس پر عمل کرنے کی مزاحمتیں اِس قدر سخت ہوتی ہیں کہ "محبانِ نوعِ انسان" بلکہ حکما کے صبر سے بھی تجاوز کرجاتی ہیں۔ پس ہم کو یقین ہی کہ اولاد کے باقاعدہ انتظام کی راہ میں جو دقتیں حائل ہیں اُن کی وجہ سے اس پر عمل کرنے میں ہمیشہ پوری رکاوٹ پیدا ہوگی

اس باب... اخلاقی تع... عام اص... تربیت ا... صحیح طر... کیے جائیں

اِن تمہیدی بیانات کے بعد اب ہم کو اخلاقی تعلیم کے صحیح مقاصد اور طریقوں پر غور کرنا چاہیئے۔ ہم اصول عامہ کے تصفیہ کے لئے چند صفحے مخصوص کرینگے اور ناظرین سے التماس ہی کہ صبر و تحمل سے اُن کو ملاحظہ کریں۔ اس کے بعد ہمارا مقصد یہ ہوگا کہ تمثیلوں سے اس امر کی توضیح کریں کہ انتظام اولاد میں جو مشکلیں ہر گھڑی پیش آتی ہیں ان میں والدین کے برتاؤ کے صحیح طریقے کیا ہونے چاہئیں۔

جب کوئی بچہ گر پڑتا ہی یا میز سے سر ٹکرا لیتا ہی تو اُس کو تکلیف ہوتی ہی جس کو یاد کرکے وہ اور زیادہ محتاط رہنا چاہتا ہی۔ اور بار بار ایسے تجربے کرنے سے آخر کار اُس کی ایسی تربیت ہوتی ہی کہ اپنی حرکتوں کو مناسب طور پر قابو میں رکھے۔ اگر وہ آتش دان کی گرم سلاخوں کو پکڑلے یا شمع کے شعلے میں اپنا ہاتھ گھسائے یا اپنی جلد کے کسی حصے پر کھولتا پانی گرالے تو جلن یا آبلہ جو اس سے پیدا ہوتا ہی ایسا سبق ہی جس کو وہ آسانی سے نہیں بھول سکتا۔ اسی قسم کے ایک دو حادثوں کا ایسا گہرا اثر ہوتا ہی کہ پھر کوئی اُس کو اس امر پر مائل نہیں کرسکتی کہ اپنی جسمانی ساخت کے قوانین سے اس طرح غفلت کرے۔

قدرتی... کی چند...

اب دیکھو۔ ان صورتوں میں اخلاقی تربیت کے سچے خیال اور عمل کو نہایت

آسان طریق سے قدرت نے ہمارے سامنے واضح طور بیان کر دیا ہے۔ یہ ایسا خیال اور عمل ہے جو سرسری نظر میں اُس خیال اور عمل سے جس کو عام لوگوں نے قبول ہے، خواہ کیسا ہی مشابہ معلوم ہو مگر عندالامتحان ہم کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ معمولی خیال و عمل سے بہت کچھ مختلف ہے۔

جسمانی حرکتوں کو بھی حق یا ناحق کی ذیل میں داخل کر سکتے ہیں اور اس بات کی دلیل

سب سے پہلے اس بات پر غور کرو کہ جسم کی چوٹیں اور اُن کی سزائیں کیا ہیں۔ وہی **بداعمالی** اور اُس کے نتائج تو ہیں جن کو نہایت ہی سیدھی سادی صورتوں میں ظاہر کیا گیا ہے۔ اگرچہ **حق** اور **ناحق** ایسے الفاظ ہیں جن کا اطلاق عام معنوں کے لحاظ سے شاذ و نادر ایسے **افعال** پر ہوتا ہے جن سے صرف جسمانی اثرات براہ راست پیدا ہوتے ہیں تاہم جو شخص ان معاملے پر غور کرے گا اُس کو معلوم ہو جائے گا کہ جس طرح دیگر افعال ان دونوں **مدوں** میں داخل کیا جاتا ہے اس قسم کے افعال کو بھی ضرور داخل کرنا چاہیے۔ علم اخلاق کے تمام **نظریے** خواہ وہ کسی **اصول** مفروضہ سے شروع کیے جائیں اس بات پر متفق ہیں کہ **جس چال چلن کے مجموعی اور قریب بعید نتائج مفید ہوں وہ چال چلن اچھا ہے**۔ اور **جس چال چلن کے مجموعی نتائج قریب و بعید مضر ہوں وہ چال چلن بُرا ہے**۔ جس آخری معیار پر سب لوگ چال چلن کو پرکھتے ہیں وہ یہی **خوشی یا غم** ہے جو اُس سے حاصل ہوتا ہے۔ ہم **شراب خواری** کو اس وجہ سے "ناحق" کہتے ہیں کہ اس سے جسمانی انحطاط ہوتا ہے اور **اخلاقی خرابیاں** بھی اس کے ساتھ لگی ہوئی ہیں جو شراب خوار اور اس کے متعلقین کو پیش آتی ہیں۔ اگر سرقہ مال چرانے والے اور کھونے والے دونوں کی خوشی کا باعث ہوتا تو ہم اس کو گناہوں کی فہرست میں نہ پاتے، اگر یہ بات ہماری سمجھ میں آسکتی کہ مہربانی کے کاموں سے لوگوں کی تکلیفیں بڑھتی ہیں تو ہم اُن کاموں کو قابل الزام ٹھہراتے یعنی اُن کو مہربانی کے کام نہ سمجھتے جس طرح **افراد** کے کاموں کی بابت پہلے سے یہ سوچ کر لے

قائم کی جاتی ہے کہ اُن کا نتیجہ کیا ہوگا۔ آیا اُن سے لوگوں کی **خوشی** کو ترقی ہوگی یا رنج کو اسی طرح **قوانین پارلیمنٹ**، **ملکی تحریکات** اور حب انسانی کے متعلق جوش پھیلانے کی بابت بھی رائے قائم کی جاتی ہے اور یہ بات صرف کسی اخبار کے پہلے لیڈر (مضمون) کے پڑھنے یا مجلسی معاملات پر کسی گفتگو کے سُننے سے معلوم ہو سکتی ہے اور اگر اُن تمام خیالات کی چھان بین کرنے جو دوم درجے کے اور ضمنی ہیں ہم کو یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہی خوشی اور رنج حق اور ناحق کے معیار ہیں تو جسمانی حرکتوں کو بھی مفید یا مضر نتائج کے اعتبار سے جو اُن سے پیدا ہوتے ہیں حق یا ناحق کی ذیل میں شامل کرنے سے انکار نہیں کر سکتے۔

جسمانی خطا قدرتی سزا ملی۔

**دوسرے** اس بات پر غور کرو کہ وہ کس قسم کی سزائیں ہیں جو اِن **جسمانی گناہوں** کو ملتی ہیں۔ ہم کسی بہتر لفظ کے نہ ملنے کی وجہ سے اُن کو سزا کہتے ہیں کیونکہ لفظی معنی کے اعتبار سے وہ سزائیں نہیں ہیں۔ یہ **مصنوعی** اور **غیر ضروری** ایذا رسانی نہیں ہے بلکہ اُن افعال کی محض خیر خواہانہ **روک ٹوک** ہے جو فی الحقیقت جسمانی آرام و آسائش کے مخالف ہیں۔ ایسی روک ٹوک کہ اگر وہ نہ ہو تو جسمانی صدمے جلد زندگی کا خاتمہ کر دیں۔ اِن سزاؤں کی **خصوصیت**، اگر اُن کو سزائیں کہنا ضروری ہے یہی ہے کہ وہ صرف **اٹل نتیجے** اُن کاموں کے ہیں جن کے بعد وہ واقع ہوتی ہیں یہ سزائیں اور کچھ نہیں صرف وہی **ناگزیر مزاحمتیں** ہیں جو بچے کے افعال کا نتیجہ ہیں۔

قدرتی، جرم کے ... ہوتی۔

**علاوہ بریں** یہ بات بھی ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ یہ **تکلیف دہ مزاحمتیں جرم کے متناسب ہوتی ہیں**۔ **خفیف حادثہ** سے **خفیف** اور **سخت حادثہ** سے **سخت تکلیف ہوتی ہے**۔ یہ **قانون** نہیں ہے کہ مثلاً جو لڑکا دروازہ سیڑھی پر سے گر جائے اُس کو ضروری مقدار سے زیادہ تکلیف اس لئے اُٹھانی پڑی کہ ضروری تکلیف جس قدر محتاط بنا سکتی ہے وہ اُس سے زیادہ محتاط ہو جائے بلکہ اُس کو

اس بات کا علم حاصل کرنے کے لئے چھوڑ دیا جاتا ہے کہ اپنے روزانہ تجربے سے چھوٹی بڑی غلطیوں کو معلوم کرکے اُن کے موافق اپنا برتاؤ اختیار کرے۔

قدرتی سزاؤں کی بعض اور خصوصیتیں

پھر آخر میں اس بات پر بھی غور کرو کہ یہ **قدرتی سزائیں جو بچے کے بیجا کاموں کا نتیجہ ہیں مستقل، بلا واسطہ اور یقینی ہیں اور اُن سے چھٹکارا نہیں ہو سکتا**۔ یہاں زجر و توبیخ کا کچھ کام نہیں بلکہ چپ چاپ سختی سے کام پورا کیا جاتا ہے اگر بچہ اپنی انگلی میں سوئی چبھوئے تو نتیجہ یہ ہے اُس کو تکلیف ہوتی ہے، اگر دوبارہ ایسا کرتا ہے تو پھر وہی نتیجہ ہوتا ہے اور اسی طرح ہمیشہ ہوتا رہتا ہے۔ بچہ موجودات غیر ذی روح کے ساتھ اپنے تمام معاملات میں یہ بات معلوم کرتا ہے کہ وہ اپنی خاصیت سے منحرف نہیں ہوتے۔ کوئی عذر نہیں سُنتے اور اُن کی داد ہے نہ فریاد۔ اس سخت مگر فیضانہ تربیت کو پہچان کر بچہ نہایت ہی ہوشیار ہو جاتا ہے کہ آیندہ خلاف ورزی نہ کرے۔

قدرت کا طریق تربیت بچوں اور بڑوں کے ساتھ ایک سا ہے

جب ہم اس بات کو یاد کرتے ہیں کہ یہ عام اصول اسی طرح عمر بھر قائم رہتے ہیں جس طرح تمام بچپن کے زمانے میں تو اُن کی وقعت اور بھی زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ **قدرتی نتائج** کا علم جو تجربے سے حاصل ہوتا ہے وہ علم ہے جو مردوں اور عورتوں کو کج روی سے باز رکھتا ہے خانگی تعلیم ختم ہونے کے بعد جب والدین اور معلم روک ٹوک کرنے کے لئے نہیں ہوتے کہ یہ کام نہ کرو، وہ کام نہ کرو اُس وقت وہی تربیت کام دیتی ہے جس سے کم سن بچوں کو اپنے نفس کی آپ ہدایت کرنا سکھایا جاتا ہے۔ اگر وہ نوجوان جو زندگی کے کاروبار میں قدم رکھتا ہے اپنے وقت کو **سستی** میں گنوائے اور فرائض مفوضہ کو کاہلی یا بے سری سے انجام دے تو رفتہ رفتہ **قدرتی** سزا مل جاتی ہے۔ یعنی اُس کو آزاد کردیا جاتا ہے اور مفلسی کی مصیبتیں کچھ عرصہ تک جھیلنے کے لئے چھوڑ دیا جاتا ہے جو شخص وقت کا پابند نہیں ہوتا اور اپنے کاروبار اور تفریح کے مقررہ وقت ہمیشہ گنواتا

ہے تو نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کو بے آرامی، نقصان اور ناکامی ہمیشہ نصیب ہوتی ہے۔ جو سوداگر منافع کی شرح بہت زیادہ لگاتا ہے وہ اپنے گاہکوں کو کھو بیٹھتا ہے اور اس کا کام اس طمع میں رک جاتا ہے۔ طبابت کی کساد بازاری غافل ڈاکٹر کو سکھاتی ہے کہ اپنے مریضوں کے علاج میں زیادہ محنت اٹھائے۔ جو لین دین کرنے والا جھٹ پٹ لوگوں کا اعتبار کر لیتا ہے اور جو سوداگر بہت زیادہ نفع کی پوری امید میں روپیہ لگاتا ہے یہ دونوں ان دقتوں کی وجہ سے جو جلد بازی کا نتیجہ ہیں، اس امر کی ضرورت محسوس کرتے ہیں کہ اپنے کاروبار میں زیادہ محتاط رہیں۔ ہر ایک باشندۂ شہر کو زندگی بھر میں ایسے ہی واقعات پیش آتے ہیں۔ مثل مشہور ہے کہ دودھ کا جلا چھاچھ کو پھونک پھونک پیتا ہے۔ اس مثل سے جو بسا اوقات ایسی حالتوں میں خوب چسپاں ہوتی ہے صرف اتنی ہی بات معلوم نہیں ہوتی کہ یہ معاشرتی تربیت اور بچوں کی ابتدائی تربیت جو قدرت کرتی ہے ان دونوں تربیتوں کی باہمی مشابہت سب نے تسلیم کر لیا ہے۔ بلکہ کنایتہً اس بات کا بھی یقین حاصل ہوتا ہے کہ یہی تربیت سب سے زیادہ موثر ہے۔ نہیں حقیقت میں یہ یقین کنایتہً نہیں بلکہ اس سے بڑھکر ہے یہ تو صراحتہً بیان کر دیا گیا ہے۔ ہر شخص نے لوگوں کو یہ کہتے سنا ہوگا کہ فلاں خراب یا احمقانہ طریق عمل جس کو پہلے سے ہم نے اختیار کر رکھا تھا بہت کچھ نقصان اٹھانے کے بعد ہم کو اس کے ترک کرنے کی ترغیب ہوئی تھی۔ کسی مسرف یا منصوبہ باز کے افعال پر نکتہ چینی کرتے وقت ہر شخص نے یہ بات سنی ہوگی کہ "اجی اس کو نصیحت کرنی فضول ہے۔ خود ٹھوکریں کھا کر سنبھل جائے گا۔ کوئی دوسری تدبیر اس پر کارگر نہ ہوگی یعنی ناگزیر سزاؤں کی تکلیف بھگتنے کے سوا دوسری تدبیر کام نہیں دے گی اور اس بات کا مزید ثبوت درکار ہو کہ قدرتی مزاحمت نہ صرف سب سے زیادہ کارگر سزا بلکہ انسان کی تجویز کردہ سزا اس کی جگہ کام ہی نہیں دے سکتی" تو یہ مزید ثبوت ہمارے

سزا کے مختلف طریقوں کی مشہور ناکامیابی سے مل سکتا ہے۔ مجرموں کی اصلاح کے
بہت سے تعزیری طریقے تجویز کئے گئے ہیں اور قانوناً اُن کی تعمیل کرائی جاتی ہے ان میں
سے کسی طریقے نے اپنے حامیوں کی توقعات کو پورا نہیں کیا۔ مصنوعی سزائیں
اصلاح میں قاصر رہی ہیں بلکہ بہت سی حالتوں میں ان سزاؤں سے جرائم میں اور
زیادتی ہو گئی ہے۔ مجرموں کی اصلاح کامیابی کے ساتھ صرف اُن ہی تادیب خانوں میں
ہو سکتی ہے جو نئے طور پر قائم کئے گئے ہیں اور جن کا دستور العمل قدرت کے طریقے
کے قریب قریب پہنچتا ہے۔ جہاں جرم کی قدرتی سزا دی جاتی ہے اور اس سے زیادہ
کچھ نہیں کیا جاتا وہ سزا یہی ہے کہ مجرم کے فعل کی آزادی کو جہاں
تک کہ نوع انسان کی حفاظت کے لئے ضروری ہو۔ کم کیا جائے
اور جب تک وہ قید میں رہے ایسا بندوبست کیا جائے کہ وہ اپنی
کمائی سے گزارہ کرے، پس دو باتیں ہم کو معلوم ہوئیں ایک یہ کہ جس
تربیت سے چھوٹے بچوں کو اپنی حرکتوں کا باقاعدہ رکھنا سکھایا جاتا ہے اسی تربیت سے
بڑے آدمیوں کو قابو میں رکھا جاتا ہے اور کم و بیش اُن کی اصلاح کی جاتی ہے۔ اور دوسری
یہ کہ بدترین نوجوانوں کی اصلاح کے لئے انسانی مجوزہ تربیت جب کبھی خدائی قانون
سے منحرف ہوتی ہے۔ ناکامیاب رہتی ہے اور جوں جوں اس کے قریب پہنچتی جاتی ہے
کامیاب ہونے لگتی ہے۔

کیا اخلاقی تعلیم کا ہدایتی اصول ہم کو یہاں نہیں مل گیا ہے، کیا ہم کو یہ نتیجہ
نہیں نکالنا چاہیے کہ جو طریقہ اپنے نتائج کے اعتبار سے شیرخواری اور بلوغ کے
زمانہ میں بہت مفید ثابت ہوا ہے وہ تمام زمانۂ طفولیت میں بھی اسی قدر مفید ہوگا
کیا کوئی شخص یقین کر سکتا ہے کہ جس طریقے سے زندگی کے پہلے اور پچھلے حصے میں
بہت عمدگی سے کام نکلتا ہے زندگی کے درمیانی حصے میں اس سے کام نہیں چلے گا

اخلاقی تعلیم کا گر یہی ہے کہ قدرتی طریقہ کی پیروی کی جائے

کیا یہ بات صاف ظاہر نہیں ہے کہ "قدرت کے کارکن اور ترجمان" ہونے کی حیثیت سے اس امر کا دیکھنا والدین کا فرض ہے کہ اُن کے بچے عادۃً اپنے چال چلن کے **حقیقی نتائج** یعنی قدرتی سزاؤں کا تجربہ حاصل کریں اور والدین نہ تو ان سزاؤں کو ٹالیں اور نہ اُن کو سخت بنائیں اور نہ مصنوعی سزاؤں کو ان کی جگہ رکھیں؟ کوئی غیر متعصب پڑھنے والا اس بات سے اتفاق کرنے میں پس و پیش نہیں کرے گا۔

بیان ہی کو ایک اعتراض اُس کا جواب

مگر غالباً بہت سے آدمی یہ **حجت** پیش کریں گے کہ اکثر والدین پہلے ہی سے ایسا کرتے ہیں یعنی جو سزائیں وہ دیتے ہیں اکثر حالتوں میں وہ سزائیں بدچلنی کے سچے نتیجے ہوتے ہیں مثلاً والدین کا غصہ جو درشت الفاظ و افعال میں ظاہر ہوتا ہے بچے کے قصور کا نتیجہ ہے۔ اور اُس جسمانی یا اخلاقی تکلیف سے جو بچے کو جھیلنی پڑتی وہ اپنی بدچلنی کی قدرتی سزا بھگت لیتا ہے" اس بیان میں جہاں بہت کچھ غلطی ہے کسی قدر سچ بھی ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ ماں باپ کی ناراضی بچوں کے قصور کا سچا نتیجہ ہے اور یہ کہ اُن کی ناراضی کا اظہار اُس قصور کی باضابطہ روک ہے۔ بچوں کے ستانے سے جب ماں باپ کو غصہ آتا ہے تو وہ اُن کو گھُرکتے ہیں، دھمکاتے ہیں اور پیٹتے ہیں بیشک یہ ایسی سزائیں ہیں جو بچوں کے قصوروں پر ماں باپ کو دینی پڑتی ہیں اور اس وجہ سے اُن سزاؤں کو بچوں کی بداعمالیوں کی قدرتی روک سمجھنا چاہیے۔ ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ برتاؤ کے یہ طریقے نسبتہً صحیح نہیں ہیں **صحیح اس معنی میں** کہ وہ طریقے اُن لوگوں کے بچوں سے متعلق ہیں جو اپنے نفس پر اچھی طرح قابو نہیں رکھتے اور جن کے بچے خودسر ہیں اور **صحیح اس معنی میں بھی** کہ وہ اُس قوم کی حالت سے متعلق ہیں جس میں زیادہ تر ایسے بڑے بوڑھے شامل ہیں جو اپنے نفس پر اچھی طرح قابو نہیں رکھ سکتے۔ تعلیمی طریقے جیسا کہ پہلے اشارۃً بیان ہو چکا ہے۔ ملکی اور دیگر قوانین کی طرح بالعموم اسی قدر عمدہ ہوتے ہیں جس قدر کہ فطرت انسانی اُن کو

عمدہ ہونے کی اجازت دیتی ہی۔ وحشی والدین کے وحشی بچّوں کی روک تھام غالباً وحشیانہ طریقوں ہی سے ہوسکتی ہی جو اُن کے والدین فطرۃً استعمال کرتے ہیں اور اُس وحشی قوم سے معاشرت کرنے کے لئے جس سے عنقریب بچّوں کو سابقہ پڑنے والا ہی۔ شاید سب سے بہتر تیاری یہی ہی کہ وہ اِن وحشیانہ طریقوں (والدین کی سخت گیری) کی برداشت کریں۔ برعکس اس کے شائستہ قوم کے شائستہ آدمی اپنی ناراضی کا اظہار فطرۃً ایسے طریقوں سے کرینگے جو نسبتہً کم سخت ہیں یعنی فطرۃً زیادہ نرم تدبیروں سے کام لیں گے اور یہ تدبیریں اُن کے نیک طینت بچّوں کے لئے کافی ہونگی۔ پس یہ بات صحیح ہی کہ جہاں تک والدین کے اظہار خدمات کا تعلق ہی قدرتی سزا کے اصول کی پیروی ہمیشہ کم و بیش کی جاتی ہی اور خانگی انتظام کا طریقہ اپنی صحیح شکل کی طرف مائل ہوتا جاتا ہی

اخلاقی تربیت کے متعلق دو ضروری باتیں

مگر اب **دو ضروری باتوں** پر غور کرو۔ **پہلی بات** یہ ہی کہ جب **فوری انقلاب** ہوتا ہی۔ جیسا کہ ہماری تعلیمی حالت میں ہو رہا ہی جس کا ثبوت یہ ہی کہ قدیم و جدید **خیالوں** اور قدیم و جدید **عملوں** میں برابر جنگ چھڑی ہوئی ہی۔ تو یہ بات قرین قیاس ہی کہ مروجہ تعلیمی طریقے مقتضائے وقت کے بہت کچھ ناموافق ہوں۔ بہتیرے ماں باپ تو اُن اصول کی پیروی کرکے جو اُسی زمانے کے لئے موزوں تھے جب کہ وہ تجویز کئے گئے تھے بچّوں کو ایسی سزائیں دیتے ہیں جن سے خود ماں باپ کے دل کو تکلیف پہنچتی ہی اور اُن کی روک ٹوک ایسے طریقے سے کرتے ہیں جو **فطرت کے خلاف** ہی۔ اور بعض والدین اس اُمید میں کہ اصلاح فوراً ہو جائے مقابل کی **انتہائی** حد کی طرف دوڑ جاتے ہیں۔ **دوسری بات** یہ ہی کہ جو تربیت خاص کر قابل قدر ہی وہ یہ نہیں ہی کہ "بچّے والدین کی رضامندی یا ناراضامندی کا تجربہ حاصل کریں" بلکہ یہ ہی کہ "والدین کی رائے یا مداخلت کی عدم موجودگی میں چال چلن کے جو نتیجے آخر کار پیدا ہونگے اُن کا تجربہ حاصل کریں"۔ درحقیقت مفید اور کارآمد سزائیں وہ نہیں

ہیں جو والدین بچّوں کو دیتے ہیں جب کہ وہ قدرت کے کارکن بن کر اس کام کو اپنے ذمہ لیتے ہیں بلکہ وہی سزائیں حقیقتہً مفید اور کارآمد ہیں جو **قدرت** خود دیتی ہی ہم اس فرق کو چند تمثیلوں سے واضح کرنے کی کوشش کریں گے اور ان تمثیلوں سے، یہاں یہ ظاہر ہوگا کہ لفظ "**قدرتی سزا**" سے جو **مصنوعی سزا** کے مقابلے میں بولا جاتا ہی ہماری کیا مراد ہی، چند عملی ہدایتیں بھی حاصل ہو جائینگی۔

اخلاقی تربیت کی چند عام مثالیں پہلی مثال

ہر ایک خاندان میں جہاں چھوٹے بچّے ہوتے ہیں روزمرّہ ایسی حالتیں پیش آتی ہیں جن کو مائیں اور نوکر چاکر "چیزیں بکھیرنا" کہتے ہیں۔ بچہ اپنے کھلونوں کے صندوق میں سے کھلونے باہر نکال کر فرش پر چاروں طرف پھیلا دیتا ہی یا مٹھی بھر پھول جو صبح کی ہوا خوری کے وقت جمع کرکے بچہ گھر لاتا ہی۔ تھوڑی دیر میں وہی پھول میزوں اور کرسیوں پر بکھرے ہوئے دیکھے جاتے ہیں یا ایک چھوٹی لڑکی گڑیا کے کپڑے بناتے وقت دھجیاں بکھیر کر کمرے کو بدنما بنا دیتی ہی۔ اکثر حالتوں میں اس بے ترتیبی کو درست کرنے کی مصیبت جس شخص کو اٹھانی چاہیئے اُس کے سوا کسی دوسرے شخص کو اُٹھانی پڑتی ہی۔ اگر دایہ خانے میں یہ صورت پیش آئی ہی تو خود انّا گری پڑی چیزوں کو سمیٹتی ہی اور "چھوٹے موذیوں" پر بڑبڑاتی جاتی ہی اور مکان کے نیچے کے حصّے میں ایسا ہوا ہی تو یہ کام عموماً یا تو کسی بڑے بھائی بہن کے سر پڑتا ہی یا گھر کی ماما کے۔ اور قصوروار کو دھمکی کے سوا اور کوئی سزا نہیں دی جاتی۔ مگر بہت سے والدین ایسے عقلمند ہیں کہ ایسی سیدھی سادی حالت میں تھوڑی بہت معقولیت سے باقاعدہ طریقہ کی پیروی کرتے ہیں۔ یعنی اُن کھلونوں یا دھجیوں کو بچوں ہی سے جمع کرتے ہیں **چیزوں کو ترتیب وار رکھنے کی محنت اُن کو بے ترتیب کرنے کی سزا ہی**۔ ہر ایک سوداگر کو اپنے دفتر میں ہر ایک بیوی کو اپنے گھر میں روزمرّہ اس بات کا تجربہ ہوتا ہی۔ اگر تعلیم کا مقصد "زندگی کے کاروبار کے لیے

تیار کرنا ہی تو ہر ایک بچے کو شروع سے روزمرہ اس بات کا تجربہ حاصل کرنا چاہیے اگر قدرتی سزا پر بچہ سرکشی سے پیش آئے (یہ صورت شاید ایسی جگہ ظہور میں آئے جہاں پہلے سے اخلاقی تعلیم کا خراب نتیجہ اختیار کیا گیا ہو) تو مناسب طریقہ یہ ہی کہ بچہ انتہائی سزا بھگتنے کے لیے چھوڑ دیا جائے جو اُس کی نافرمانی کا نتیجہ ہی جن چیزوں کو بچے نے تتر بتر کیا ہی اگر وہ اُن کے اٹھانے یا ترتیب وار رکھنے سے انکار یا غفلت کرے اور اس وجہ سے اس کام کی محنت کسی دوسرے شخص کو اٹھانی پڑے تو آیندہ موقعوں پر بچے کو اس تکلیف دینے کے وسیلہ ہی سے محروم کر دینا چاہیے۔ جب وہ دوبارہ کھلونوں کا صندوق مانگے تو ماں کو یہ جواب دینا چاہیے کہ "پچھلی مرتبہ تم کو کھلونے دیئے گئے تھے تو تم نے اُن کو فرش پر چھوڑ دیا تھا، اور **جین** کو وہ کھلونے اٹھانے پڑے تھے، **جین** کو بہت کام ہیں وہ روز روز ان چیزوں کو نہیں اٹھا سکتی جن کو تم اِدھر اُدھر ڈال دیتے ہو اور میں خود یہ کام نہیں کر سکتی۔ پس چونکہ تم اپنے کھلونوں سے کام لینے کے بعد اُن کو اٹھا کر نہیں رکھتے ہو اس لیے میں تم کو کھلونے نہیں دے سکتی" یہ صریحاً **قدرتی سزا** ہی، نہ کم نہ زیادہ، اور بچہ بھی اس کو ایسا ہی سمجھے گا۔ سزا بھی ایسے وقت پر دی گئی ہی جب کہ اس کا اثر بہت زیادہ ہوگا۔ ایک نئی خواہش، جو بچے کے دل میں پیدا ہوئی تھی، اس سے ایسے وقت مایوسی ہوگی جب کہ اس کے پورے ہونے کی توقع تھی اور اس طرح جو گہرا **نقش** دل پر پیدا ہوگا بچے کے آیندہ چال چلن پر اس کا اثر ہوئے بغیر نہ رہے گا۔ اور استقلال کے ساتھ بار بار ایسا ہی کیا جائے تو اس سے حتی الامکان قصور کی اصلاح ضرور ہو جائے گی۔ اس کے علاوہ یہ فائدہ ہوگا کہ اس طریقے سے بچے کو بچپن ہی میں یہ سبق مل جائے گا کہ" اس **دنیا کی خوشیاں محنت ہی سے ٹھیک ٹھیک حاصل ہوتی ہیں**" اور یہ سبق جتنا جلد سکھا جائے اتنا ہی بہتر ہی۔

دوسرا

ایک مثال لو۔ چند ہی روز کا ذکر ہی کہ ایک لڑکی کی ماں اس کو ہمیشہ زجر و ملامت کیا کرتی تھی، اور ہم کو بارہا اُس کے سُننے کا اتفاق ہوتا تھا، یہ لڑکی جس کا نام کانسٹنس تھا روزانہ ہوا خوری کے لئے شاید ہی کبھی وقت پر تیار ہوئی ہو۔ چونکہ کانسٹنس کے مزاج میں سرگرمی تھی اور جو کام اُس کے آگے ہوتا تھا اُس میں ہمہ تن مصروف ہو جاتی تھی اس لئے اُس کو یہ خیال نہیں آتا تھا کہ اپنی چیزوں کو سمیٹ کر رکھے یہاں تک کہ اور بچے ہوا خوری کے لئے تیار ہو جاتے تھے۔ اُستانی اور دوسرے بچوں کو تقریباً ہمیشہ انتظار کرنا پڑتا تھا، اور ماں تقریباً ہمیشہ اُس کو زجر و ملامت کیا کرتی تھی، اگرچہ اِس طریقے میں ہمیشہ ناکامیابی ہوئی تھی مگر ماں کو یہ خیال کبھی نہیں آتا تھا کہ کانسٹنس کو قدرتی سزا کا تجربہ کرائے۔ بلکہ درحقیقت جب کبھی اُس کو یہ بات سمجھائی جاتی تھی تو بھی اِس سزا کا امتحان کرنا نہیں چاہتی تھی۔ وقت پر تیار نہ ہونے سے دنیا میں کوئی نہ کوئی فائدہ ہاتھ سے جاتا رہتا ہی جو بصورت دیگر حاصل ہو جاتا، مثلاً ریل چلی گئی، آگ بوٹ لنگر اُٹھا رہا ہی، بازار میں سب عمدہ چیزیں فروخت ہو گئیں یا محفل سرود کی اچھی اچھی نشستیں پُر ہو گئیں۔ ہر شخص ایسی حالتوں میں جو ہمیشہ پیش آتی رہتی ہیں یہ بات دیکھ سکتا ہی کہ آیندہ کی محرومی ہی لوگوں کو دیر کرنے سے روکتی ہی۔ کیا اِس کا نتیجہ صاف ظاہر نہیں ہی؟ کیا ایسا ہی یہیں ہونا چاہئیے کہ یہی آیندہ کی محرومی بچے کے چال چلن کو بھی قابو میں رکھے؟ اگر کانسٹنس وقت مقررہ پر تیار نہیں ہوتی تو اِس کا قدرتی نتیجہ یہی ہی کہ اِس کو پیچھے چھوڑ دیا جائے اور ہوا خوری سے محروم رکھا جائے۔ جب وہ ایک دو مرتبہ گھر پر رہ جائے گی اور دوسرے بچے کھیتوں کی سیر کا لطف اُٹھائیں گے اور اُس کو معلوم ہوگا کہ اِس قیمتی تفریح کا نقصان صرف میری سستی کا نتیجہ ہی تو اُس کے بعد ظن غالب ہی کہ اصلاح ہو جائے گی۔ کم سے کم اتنا تو ہوگا کہ یہ تجویز اُس ہمیشہ کی زجر و ملامت کی

نسبت زیادہ کارگر ہوگی جس کا نتیجہ صرف یہ ہے کہ بچے چلنے گھڑے بن جاتے ہیں۔

جب بچے غیر معمولی بے پروائی سے وہ چیزیں جو اُن کو دی گئی ہیں توڑ ڈالیں یا کھو دیں تو قدرتی سزا وہی بے آرامی ہے جو اُس نقصان سے حاصل ہوتی ہے اور یہی سزا بڑے آدمیوں کو بھی زیادہ محتاط بناتی ہے۔ گم شدہ یا ٹوٹی پھوٹی چیز کی محتاجگی اور اُس کی جگہ دوسری چیز خریدنے کا خرچ یہ ایسے تجربے ہیں جن کے ذریعے سے مردوں اور عورتوں کو ان معاملات میں تربیت حاصل ہوتی ہے اور بچوں کے تجربے بھی حتی الامکان بڑوں کے تجربوں کی مانند ہونے چاہئیں۔ ہمارا یہ بیان بچپن کے اُس زمانے سے متعلق نہیں ہے جب کہ بچے کھلونوں کے جسمانی خواص سیکھتے وقت اُن کو توڑ پھوڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ہیں بلکہ اُس زمانہ مابعد سے متعلق ہے جب کہ مال کا مفہوم اور اُس کے فوائد بچوں کو معلوم ہو جاتے ہیں۔ مثلاً کوئی لڑکا، جس کی عمر اس قابل ہے کہ وہ چاقو اپنے پاس رکھ سکے، چاقو کو ایسی بری طرح استعمال کرے کہ اُس کا پھل ٹوٹ جائے یا گھاس میں کسی جھاڑی کے قریب بھول کر چھوڑ آئے جہاں وہ ایک چھڑی کاٹ رہا تھا تو غافل باپ یا ناز بردار رشتہ دار بالعموم فوراً دوسرا چاقو خرید کر دیدیگا اور یہ نہیں دیکھے گا کہ ایسا کرنے سے ایک قیمتی نصیحت ضائع ہو جائے گی۔ ایسی حالت میں مناسب ہے کہ باپ بیٹے کو سمجھا دے کہ "چاقو خریدنے میں روپیہ صرف ہوتا ہے، روپیہ کمانے میں محنت درکار ہے، مجھے اتنا مقدور نہیں کہ جو شخص چاقو کھوئے یا توڑے اُس کے لئے نئے چاقو خریدوں" اور جب تک اس امر کا ثبوت مشاہدہ میں نہ آجائے کہ بچہ زیادہ محتاط ہو گیا ہے باپ کو لازم ہے اس نقصان کی تلافی سے انکار کرے۔ اسی قسم کی تربیت فضول خرچی کے روکنے میں کارآمد ہوگی۔

مثلۂ مذکورہ قدرتی اور مصنوعی سزاؤں کا فرق ظاہر ہے

ان چند عام مثالوں سے، جن کو یہاں اس وجہ سے درج کیا گیا ہی کہ ان سے باسانی ہمارے مفہوم کی توضیح ہوتی ہی، ہر شخص پر صاف ظاہر ہو جائے گا کہ ان **قدرتی سزاؤں** میں جن کی بابت ہم زور کے ساتھ کہتے ہیں کہ کارگر سزائیں درحقیقت یہی ہیں اور اُن **مصنوعی سزاؤں** میں جن کو عموماً قدرتی سزاؤں کی جگہ برتا جاتا ہی کیا فرق ہی؟ اس اصول کے **اعلیٰ** اور **دقیق استعمال** کی مثالیں بیان کرنے سے پہلے ہم کو چاہیئے کہ اُن چند بڑی بڑی **فضیلتوں** کو قلمبند کریں جو اس اصول کو اُس اصول پر بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ اُس **عملی دستور** پر حاصل ہیں جو اکثر خاندانوں میں جاری ہی۔

قدرتی طریقہ تربیت کے فوائد پہلا فائدہ

پہلی **فوقیت** یہ ہی کہ اس طریقے کی پیروی سے **علت** اور **معلول کا صحیح تصور پیدا ہوتا ہی**۔ اور یہ تصور بار بار اور استقلال کے ساتھ تجربہ کرنے سے معین اور مستحکم ہو جاتا ہی۔ جب افعال کے **نیک و** بد نتائج سمجھ میں آجاتے ہیں تو اس بات کا بہت اچھی طرح اطمینان ہو جاتا ہی کہ آیندہ زندگی میں چال چلن عمدہ رہے گا۔ بہ نسبت اس کے کہ محض دوسرے شخص کے اعتبار پر اُن نتائج کا یقین کر لیا جائے جس بچے کو یہ معلوم ہو جاتا ہی کہ چیزوں کو تتر بتر کرنے کی وجہ سے اُن کو ترتیب وار رکھنے کی محنت اُٹھانی پڑے گی۔ جو اپنے تساہل کی وجہ سے کسی تفریح سے محروم رہتا ہی یا جس کی بے پروائی کے سبب کوئی بڑی عزیز شے ہاتھ سے نکل جاتی ہی اُس کو نہ صرف **سخت نتیجہ** بھگتنا پڑتا ہی بلکہ **علل و اسباب** کا علم بھی حاصل ہو جاتا ہی۔ اور یہ دونوں باتیں بالکل اُن ہی باتوں کے مشابہ ہیں جو اُس کو بڑی عمر میں پیش آئیں گی۔ مگر جب بچے کو ایسی حالتوں میں جھڑک دیا جائے یا کوئی مصنوعی سزا دی جائے تو اس سے صرف یہی نقصان لازم نہیں آتا کہ اُس کو ایسی سزا ملتی ہی جس کی وہ بہت ہی کم پروا کرتا ہی بلکہ نیک و بد چال چلن کی اصل حقیقت کا علم بھی اُس کو حاصل نہیں ہوتا جو بصورت

دیگر حاصل ہو سکتا تھا مصنوعی انعاموں اور سزاؤں کے معمولی طریقے کی ایک خرابی جس پر صاحبان بصیرت مدت سے غور کرتے چلے آتے ہیں یہ ہی کہ طریقہ بدراہی کے قدرتی نتیجوں کے بجائے خاص مشقتیں یا سزائیں تجویز کرتا ہی جس سے بداہتہً ایک **غلط اخلاقی معیار پیدا ہوتا ہی**۔ چونکہ شیرخواری اور طفولیت کے تمام زمانے میں بچہ ہمیشہ یہی سمجھتا رہا ہی کہ جس کام کی ممانعت کی جاتی ہی اُس کا خاص نتیجہ والدین یا اُستاد کی ناراضی ہی، اس لئے اُس کے ذہن میں یہ بات جم جاتی ہی کہ اُس **فعل** اور اُس **ناراضی** علت اور معلول کی حیثیت سے خیالات کا ایک مقررہ تعلق ہی۔ اسی وجہ سے جب والدین اور معلم اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاتے ہیں اور بچوں کو اُن کی ناراضی کا خوف نہیں رہتا تو افعال ممنوعہ کی روک ٹوک بہت کچھ دُور ہو جاتی ہی اور سچی روک ٹوک یعنی قدرتی سزا کا علم افسوسناک تجربے کے ذریعے سے ابھی حاصل کرنا ہوتا ہی چنانچہ ایک شخص، جس نے اس ناقص طریقہ تربیت سے ذاتی واقفیت حاصل کی اس طرح لکھتا ہی:

"وہ نوجوان جو مدرسے سے رہائی پاکر نکلتے ہیں، خاص کر وہ جن کے والدین نے اپنے دباؤ سے پوری طرح کام لینے میں غفلت کی ہی، ہر طرح کی لغویات میں مبتلا ہو کر حد سے گزر جاتے ہیں وہ کسی دستور العمل کو نہیں جانتے وہ اخلاقی چال چلن کی وجوہات سے ناواقف ہوتے ہیں اُن کے پاس کوئی بنیاد نہیں ہوتی جس پر تکیہ کریں۔ اور جب تک زمانہ اُن کو سختی کے ساتھ تادیب نہیں کرتا اُس وقت تک وہ قوم کے نہایت ہی خوفناک افراد ہوتے ہیں۔"

اس قدرتی تربیت کا ایک اور بڑا **فائدہ** یہ ہی کہ وہ خالص **انصاف کی تربیت ہی** اور ہر ایک بچہ اُس کو ایسا ہی سمجھے گا جس شخص کو اتنی ہی تکلیف

ازفائدہ

اُٹھانی پڑتی ہی جو نظام اشیاء کی رو سے اُس کی ذاتی بد راہی کا نتیجہ ہونا چاہیے۔ اُس کو بہ نسبت اس کے کہ وہ مصنوعی سزا کی تکلیف برداشت کرے۔ یہ خیال بہت کم ہوگا کہ میرے ساتھ ناواجب سلوک کیا گیا ہی۔ اور یہ بات جس طرح بڑوں پر صادق آتی ہی اسی طرح بچوں پر بھی صادق آتی ہی۔ ایک ایسے لڑکے کی مثال کو جو عادۃً اپنے کپڑوں سے رہتا ہی۔ مثلاً بغیر احتیاط کے جھاڑیوں میں سے نکل جاتا یا کیچڑ کی بالکل پروا نہیں کرتا، اگر اُس کو مار پیٹ کریں یا سونے کے لئے بھیج دیں تو وہ غالباً یہ خیال کرے گا کہ میرے ساتھ بدسلوکی کی گئی ہی بلکہ زیادہ احتمال اس امر کا ہی کہ وہ اپنی تکلیفوں کا خیال کرے گا اور اپنے قصوروں پر پشیمان نہ ہوگا۔ مگر فرض کرو کہ اس سے یہ کہا جائے کہ جہاں تک ممکن ہو اس نقصان کی تلافی کرے جو اُس نے کیا ہی یعنی کپڑے کو کیچڑ سے صاف کرے جس میں وہ آلودہ ہو گیا ہی یا جیسا کچھ اُس سے ہو سکے پھٹے کپڑے کو سئے۔ تو کیا اُس کو معلوم نہ ہوگا کہ یہ خرابی میری ہی پیدا کی ہوئی ہی؟ کیا اس سزا کے بھگتتے وقت اُس کو متواتر اس بات کا شعور نہ ہوگا کہ اس سزا اور اُس کی علت میں باہمی تعلق ہی؟ اور کیا باوجود اپنے غصے کے وہ اس انتظام کے انصاف کو کم و بیش صراحت کے ساتھ نہیں سمجھے گا؟ اگر اس قسم کی متعدد نصیحتیں اصلاح میں قاصر رہیں یعنی اگر کپڑوں کا جوڑا قبل از وقت خراب ہو جائے اگر باپ اسی طریقۂ تربیت کی پیروی کر کے نئے جوڑے کے لئے روپیہ خرچ کرنے سے انکار کرے جب تک کہ معمولی وقت نہ گزر جائے اور اگر اس اثناء میں ایسے مواقع پیش آئیں کہ لڑکے کے پاس معقول لباس نہ ہو اور اسی لئے تعطیل کی سیر و تفریح اور تیوہار کے دنوں میں عزیزوں سے ملنے جلنے سے اُسے روک دیا جائے تو یہ بات ظاہر ہی کہ جس طرح اس سزا کا اُس کے دل پر

گہرا اثر ہوگا اسی طرح سببیت کے سلسلے کا پتا لگانے میں اور اس بات کے معلوم کرنے میں کہ یہ میری ہی بے پروائی کا نتیجہ ہے وہ شاید ہی ناکامیاب ہے اور جب وہ یہ بات سمجھے گا تو اس کو کسی ایسی **بے انصافی** کا احساس پیدا نہ ہوگا کہ گویا قصور اور اس کی سزا کے درمیان کوئی ظاہری تعلق ہی نہیں ہے۔

دوسرا فائدہ

پھر اس بات پر غور کرو کہ معمولی طریقے کی نسبت اس طریقے سے والدین اور اولاد دونوں کے **دلوں میں بل پڑنے کا بہت کم احتمال ہے** جب خود والدین بجائے اس کے کہ بچوں کو ان تکلیف دہ نتائج کا تجربہ کرنے چھوڑ دیں جو بے جا چال چلن سے خود بخود پیدا ہوتے ہیں بعض دوسری تکلیف دہ سزائیں ان کو دیں تو اس سے **دوہرا نقصان** ہوتا ہے۔ چونکہ وہ بچوں کے لئے بے شمار قوانین بناتے ہیں اور ان قوانین کے قائم و برقرار رکھنے میں اپنی فوقیت اور **عظمت** سمجھتے ہیں اس لئے ہر ایک خطا کو ایسا سمجھتے ہیں کہ یہ جرم ہمارے برخلاف ہے اور ہمارے غصے کا باعث ہے۔ اس کے سوا وہ **کوفت** ہے جو اس وجہ سے پیدا ہوتی ہو کہ والدین زائد محنت یا زائد خرچ کی شکل میں ان سزاؤں کو اپنے اوپر لے لیتے ہیں جو بے جا کرنے والوں کو ملنی چاہیئے تھیں۔ اسی طرح کی دقت بچوں کو پیش آتی ہے وہ سزائیں جو کاموں کی لازمی مزاحمت سے ان پر عائد ہوتی ہیں۔ یعنی وہ جو **شخصی وساطت** کے بغیر دی جاتی ہیں۔ ان کی تکلیف نسبتہً **خفیف** اور **عارضی** ہوتی ہے۔ مگر جو سزائیں ماں باپ اپنی مرضی سے دیتے ہیں اور جن کی بابت بچے بعد میں سمجھتے ہیں کہ ماں باپ ہی ان کا باعث ہیں ان سزاؤں سے ایسی تکلیف ہوتی ہے جو پہلی تکلیف سے زیادہ **سخت** اور زیادہ **دیرپا** ہوتی ہے۔ ذرا

غور تو کرو، اگر یہ عملی طریقہ ابتدا ہی سے اختیار کیا جاتا تو اس کا نتیجہ کیسا آفت ناک ہوتا۔ **فرض کرو** کہ یہ بات ممکن ہوتی کہ بچّوں کو اپنے ناواقفیت یا ناتجربہ کاری کی وجہ سے جو **جسمانی تکلیفیں** اُٹھانی پڑتی ہیں اُن کو والدین اپنے اوپر لے لیتے اور وہ اُن سزاؤں کو آپ بھگت کر بچوں کو دوسری قسم کی سزائیں دیتے ہیں تاکہ اُن کو اپنے چال چلن کا ناواجب ہونا معلوم ہوجائے **فرض کرو** کہ جب کوئی بچہ جس کو **کیتلی** کے چھیڑنے سے منع کیا گیا ہے کھولتا پانی اپنے پاؤں پر گرائے اور اس کے بدلے ماں کے پاؤں میں آبلہ پڑجائے اور ماں اس کے بدلے بچے کے ایک مکّا لگا دے اور سب حالتوں میں ایسا ہی ہوا کرے تو کیا یہ آئے دن کی مصیبتیں موجودہ حالت کی بہ نسبت بہت زیادہ غیظ و غضب کا ذریعہ نہیں ہوجائیں گی؟ کیا دونوں طرف سے سخت بدمزاجی نہ ہوگی؟ بااین ہمہ آیندہ عمر میں بچّوں کے ساتھ بعینہٖ اسی قسم کی **حکمت عملی** برتی جاتی ہے۔ جو باپ اپنے لڑکے کو اس وجہ سے مارتا پیٹتا ہے کہ اُس نے غفلت یا خودسری سے بہن کا کھلونا توڑ دیا ہے اور پھر خود ہی نئے کھلونے کے دام ادا کرتا ہے وہ بالکل اصول بالا پر کام کرتا ہے۔ یعنی قصوروار کو **مصنوعی سزا** دیتا ہے اور **قدرتی سزا** اپنے اوپر لیتا ہے۔ خود اس کا دل اور قصوروار کا دل خواہ مخواہ آزردہ ہوتا ہے۔ اگر وہ صرف اتنا کرتا کہ بچے سے اُس کے عوض میں دوسرا کھلونا دلا دیتا ہے تو دونوں کا دل اتنا نہ جلتا اگر وہ بچے سے یہ کہہ دیتا کہ "نیا کھلونا تم کو اپنے داموں سے خریدنا چاہیے۔ اور داموں کے ادا ہونے تک تمھارا جیب خرچ ضرور بند کیا جائے گا"۔ تو دونوں طرف طبیعت کی بدمزگی بہت کم ظہور میں آتی۔ اور بعد میں **جیب خرچ** سے محروم رہنے کے سبب بچہ منصفانہ اور مفید مزا یا سزا بھگت لیتا۔ المختصر قدرتی

روک ٹوک کے ذریعے سے تربیت کا طریقہ **دو وجہ** سے مزاج کے لئے کمتر مضر ہے: **ایک** اس وجہ سے کہ وہ **خالص منصفانہ** طریقہ سمجھا جاتا ہے اور **دوسرے** اس وجہ سے کہ وہ زیادہ تر قدرت کی **غیر شخصی** وساطت کو والدین کی **شخصی** وساطت کا قائم مقام بنا دیتا ہے۔

اسی سے یہ **بدیہی** نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ اس طریقہ تربیت سے **والدین اور اولاد کا تعلق زیادہ تر دوستانہ اور اسی لیے زیادہ تر موثر ہوتا ہے،** **غصہ** خواہ ماں باپ کا ہو خواہ بچے کا، خواہ کسی وجہ سے پیدا ہو اور خواہ کسی شخص پر ہو، ایک مضر شے ہے۔ مگر ماں باپ کا غصہ بچے پر یا بچے کا غصہ ماں باپ پر خصوصیت کے ساتھ مضر ہے۔ کیوں کہ وہ ہمدردی کے اُس علاقے کو کم زور کرتا ہے جو اولاد کو مہربانی سے قابو میں رکھنے کے لئے ضروری ہے، تسلسل **خیالات** کے قوانین سے یہ نتیجہ لازمی طور پر نکلتا ہے کہ جوانوں اور بڈھوں دونوں کو اُن چیزوں سے **نفرت** ہوتی ہے جن کا تعلق عملاً ایسے تاثرات و جذبات سے ہے جو عادۃً ناگوار ہوتے ہیں۔ یا جہاں ابتدا سے **محبت** موجود ہوتی ہے وہاں جس قدر دردانگیز خیالات پیدا ہوتے ہیں اُسی قدر وہ محبت کم ہو جاتی ہے یا نفرت سے بدل جاتی ہے والدین کا غصہ، جو زجر و توبیخ اور زد و کوب کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اگر بار بار اس کا اعادہ کیا جائے تو یہ نتیجہ ضرور پیدا ہوگا کہ **فرزندانہ رشتہ محبت** قطع ہو جائے گا۔ اور بچوں کے غصہ اور آزردگی کا بھی ضرور یہ نتیجہ ہوگا کہ اُن کے ساتھ جو محبت کی جاتی ہے وہ کم زور ہو جائے گی۔ بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ آخر کار زائل ہو جائے۔ اسی لئے بہت سے بچے والدین کو (اور خاص کر دایوں کو جن کو سزا دینے کا کام عموماً سپرد کیا جاتا ہے) اگر **نفرت** کی نظر سے نہیں

تو بے اعتنائی کی نظر سے ضرور دیکھتے ہیں۔ اور اسی لئے بہت سے والدین بچوں کو گوشمالی کی چیز سمجھتے ہیں۔ پس جب کہ ہم نے یہ بات سمجھ لی، جیسا کہ سب لوگوں نے ضرور سمجھ لی ہوگی، کہ "اس طرح محبت کا قطع ہوجانا مفید اخلاقی تربیت کے لئے سم قاتل ہے"۔ تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ بچوں کے ساتھ براہ راست مخالفت پیدا کرنے کے موقعوں سے بچنے کے لئے والدین جس قدر زیادہ خیال رکھیں اسی قدر بہتر ہے۔ اور اسی لئے قدرتی نتائج کی اس تربیت سے جس قدر توجہ کے ساتھ فائدہ اٹھائیں اسی قدر بہتر ہے۔ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ والدین کو تعزیری فرائض کی بجا آوری سے سبک دوشی ہوجائے گی اور والدین و اولاد کی باہمی ناراضی اور بیگانگی دور ہوجائے گی۔

فوائد ما بعد مذکور کا خلاصہ

پس ہم دیکھتے ہیں کہ اخلاقی تربیت کا یہ طریقہ، جس سے باقاعدہ مزاحمت کا تجربہ ہوتا ہے اور جو زمانۂ شیرخواری اور زمانۂ بلوغ دونوں کے لئے خدا تعالیٰ کا یکساں مقرر کیا ہوا طریقہ ہے، طفولیت اور شباب کے درمیانی زمانے میں بھی برابر اسی طرح صادق آتا ہے۔ اس طریقے کے بعض فوائد حسب ذیل ہیں:-

**اوّل**۔ اس سے صحیح اور غلط چال چلن کا وہ معقول علم حاصل ہوتا ہے جو چلنوں کے نیک و بد نتائج کا بذات خود تجربہ کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔

**دوم**۔ چوں کہ بچے خود اپنی غلط کاریوں کے دردانگیز نتائج کے سوا اور کوئی تکلیف نہیں اٹھائے گا۔ اس لئے ضرور ہے کہ وہ کم و بیش صراحت کے ساتھ ان سزاؤں کے قرین انصاف ہونے کو تسلیم کرے۔

**سوم**۔ جب وہ سزاؤں کے قرین انصاف ہونے کو تسلیم کرے گا اور کسی دوسرے کے ہاتھ سے نہیں بلکہ اپنے ہی اعمال کا خمیازہ بھگتے گا تو اس کا مزاج

کم برہم ہوگا۔ اور جب والدین خاموشی کے ساتھ اس فرض کو پورا کریں گے کہ بچہ قدرتی سزاؤں کو محسوس کرے تو والدین اور اولاد میں نسبتہً یک دلی دیگانگی قایم رہے گی۔

چہارم۔ جب باہمی ناراضی اس طرح رُک جائے گی تو والدین اور اولاد میں بہت زیادہ فرحت انگیز اور موثر تعلقات قائم ہو جائیں گے

ت شرارت حالات میں کرنا چاہیئے

مگر بعض اشخاص یہ سوال کریں گے کہ "زیادہ سخت شرارت کی حالتوں میں کیا کرنا چاہیئے؟ جب بچہ خفیف سی چوری کرے یا جھوٹ بولے یا کسی چھوٹے بھائی بہن سے بُری طرح پیش آئے اُس وقت اس طریقے کو کس طرح عمل میں لانا چاہیئے؟"

قاعدہ اخلاقی بیت کی چند تمثیلیں

ان سوالوں کا جواب دینے سے پہلے ہم کو چند تمثیلوں پر غور کرلینا چاہیئے۔ جو ان سوالوں کے جواب سے تعلق رکھتی ہیں۔

ہمارے ایک دوست نے جو اپنے بہنوئی کے گھر میں رہتا تھا، اپنے چھوٹے بھانجے اور بھانجی کی تربیت کا بیڑا اُٹھایا تھا۔ اُس نے اُس کا انتظام اُسی طریقے کے موافق کیا تھا جو اوپر بیان کیا گیا ہے۔ یہ طریقہ زیادہ تر قدرتی ہمدردی پر مبنی تھا نہ کہ اُن نتائج پر جو بحث و دلیل کے بعد نکالے جاتے ہیں۔ دونوں بچے گھر میں اُس کے شاگرد اور باہر اُس کے رفیق تھے۔ وہ ہر روز سیر و تفریح میں نیز اُس وقت جب کہ وہ نباتات کی تحقیقات کے لئے باہر جاتا تھا اُس کے ساتھ رہتے تھے۔ اور سرگرمی سے اُس کے لئے پودے تلاش کرتے تھے۔ جب وہ ان پودوں کو دیکھتا بھالتا یا شناخت کرتا تھا تو وہ بھی غور سے دیکھا کرتے تھے اور اس طریقے اور دوسرے طریقوں سے اُس کی صحبت میں لطف اور تعلیم حاصل کرتے تھے۔ مختصر کو تاہ اخلاقی حیثیت سے غور کیا جائے تو وہ ماں

باپ سے بڑھکر اُن کا ماں باپ تھا۔ اس طریقۂ تربیت کے نتائج بیان کرتے
وقت اُس نے من جملہ دیگر مثالوں کے ایک مثال ہمارے سامنے یہ بیان کی تھی
کہ ایک دن شام کو مجھے کسی چیز کی ضرورت ہوئی جو مکان کے دوسرے
حصّے میں رکھی تھی میں نے اپنے بھانجے سے کہا کہ وہ چیز لے آؤ۔ چوں کہ لڑکے
کا دل اُس کام میں لگا ہوا تھا جو اُس وقت اُس کے آگے تھا۔ اس لئے اس نے
خلاف عادت یا تو سخت ناخوشی ظاہر کی یا انکار کیا۔ ہم کو یاد نہیں (یہ شک مصنف
کو ہے) چوں کہ ماموں جابرانہ طریقہ پسند نہیں کرتا تھا خود ہی وہ چیز لینے چلا گیا
جس کی اُس کو ضرورت تھی۔ اور صرف اتنا کیا کہ لڑکے کے اس بُرے برتاؤ سے
جو تکلیف اُس کو پہنچی تھی اپنے تیور سے اس کا اظہار کر دیا۔ شام کو تھوڑی دیر
کے بعد جب لڑکے نے معمولی کھیل کی بات چیت شروع کی تو اُس کو سنجیدگی سے
روک دیا گیا۔ یعنی ماموں نے اسی سرد مہری کا اظہار کیا جو قدرتی طور پر
اس میں پیدا ہو گئی تھی۔ اور اس طرح لڑکے کو چھوڑ دیا کہ اپنے برتاؤ کا لازمی نتیجہ
بھگتے۔ اگلے دن صبح کو اٹھنے کے معمولی وقت پر ہمارے دوست نے دروازہ کے
باہر ایک نئی آواز سُنی۔ اتنے میں اُس کا چھوٹا بھانجا گرم پانی لئے اندر آیا۔ لڑکے
نے یہ دیکھنے کے لئے کہ اور کیا کام کر سکتا ہوں کمرے کے چاروں طرف نظر ڈالی اور پھر
یہ کہہ اٹھا "آہا! آپ کو اپنے جوتے کی ضرورت ہے" اور اُس کے لانے کے لئے
فوراً جھپٹ کر زینے کے نیچے اُتر گیا۔ اس طریقے سے اور دوسرے طریقوں سے
اُس نے ثابت کر دیا کہ وہ اپنے نادا جب برتاؤ کی وجہ سے پچ مچ پشیمان ہے اُس نے
غیر معمولی خدمتوں سے اُس خدمت کی تلافی کی کوشش کی جس سے اُس نے انکار کیا تھا
اُس کے اعلیٰ جذبات نے ادنیٰ جذبات پر واقعی غلبہ پا لیا تھا اور اس فتح کی بدولت
قوت حاصل کر لی تھی۔ اور یہ بات معلوم کر کے کہ "بغیر دوستی کے زندگی بسر کرنے سے

کیا کچھ تکلیف ہوتی ہے" اس کو اس دوستی کی قدر، جسے اُس نے کھو کر دوبارہ حاصل کیا تھا، پہلے سے زیادہ ہوگئی تھی۔

یہ شخص اب خود صاحب اولاد ہے اور اُسی طریقے پر عمل کرتا ہے۔ اُس کو یہ بات معلوم ہوگئی ہے کہ اس طریقے سے پوری پوری مطلب برآری ہوتی ہے۔ وہ بالکل اپنے بچّوں کا دوست بنا ہوا ہے۔ بچّے اس بات کے آرزومند رہتے ہیں کہ کب شام ہو اور ہمارا باپ گھر آئے۔ اور وہ اتوار کا لطف خاص کر اس وجہ سے اُٹھاتے ہیں کہ اُن کا باپ دن بھر اُن کے پاس رہتا ہے۔ چوں کہ بچّوں کو اُس پر پورا اعتماد ہے اور وہ اُس سے پوری محبت رکھتے ہیں اس لئے وہ دیکھتا ہے کہ محض رضامندی یا نارضامندی کے اظہار کی وجہ سے بچّوں کو قابو میں رکھنے کی کافی قوت مجھ کو حاصل ہے۔ اگر کبھی گھر واپس آکر وہ یہ سنتا ہے کہ کسی لڑکے نے شرارت کی ہے تو وہ اُسی سرد مہری کے ساتھ اُس سے برتاؤ کرتا ہے جو لڑکے کی شرارت کے علم سے خود بخود پیدا ہوتی ہے۔ اور وہ دیکھتا ہے کہ یہ نہایت کارگر سزا ہے۔ معمولی لاڈ پیار نہ کرنے سے بچّوں کو بہت تکلیف ہوتی ہے۔ یعنی اس طریقے سے بہ نسبت مار پیٹ کے بیچ کا جوش زیادہ عرصے تک قائم رہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس خالص اخلاقی سزا کا خوف میری عدم موجودگی میں بھی ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ یہاں تک کہ بچّے اکثر اوقات دن میں اپنی ماں سے پوچھتے ہیں کہ "آج ہمارا چال چلن کیسا رہا ہے" اور اُن کی بابت اچھی رپورٹ گزرے گی یا نہیں"؟

حال کا ذکر ہے کہ سب سے بڑے نے جو پانچ سال کا ایک مستعد لڑکا ہے، حیوانی زندہ دلی کے جوش میں، جو سب تندرست بچّوں میں پایا جاتا ہے۔ ماں کی عدم موجودگی میں چند بے عنوانیاں کی تھیں۔ یعنی اپنے باپ کے سنگار دان میں سے

اُسترہ نکال کر بھائی کے بالوں کی لٹ کاٹ لی تھی اور اپنے آپ کو زخمی کر لیا تھا۔
جب باپ نے اپنی واپسی کے وقت اِن وقوعوں کو سُنا تو اُس نے لڑکے سے
بات تک نہیں کی، نہ اُس شب کو اور نہ اگلی صبح کو، علاوہ فوری تکلیف کے اس کا
یہ نتیجہ ہوا کہ چند روز بعد جب ماں باہر جانے والی تھی لڑکے نے منت کی کہ ایسا
نہ کیجئے۔ اور جب اُس سے سبب پوچھا گیا تو معلوم ہوا کہ اُس کو یہ خوف تھا کہ ماں
کی عدم موجودگی میں کہیں دوبارہ ایسا ہی قصور اُس سے سرزد نہ ہو جائے۔

قدرتی طریقہ تربیت سے والدین اور اولاد کے درمیان دوستانہ تعلقات قائم رہتے ہیں

ہم نے اس سوال کا جواب دینے سے پہلے کہ "زیادہ سخت قصوروں
پر کیا کرنا چاہیئے"، یہ واقعات بطور تمہید کے اس غرض سے بیان کئے ہیں کہ پہلے
اُس تعلق کو ظاہر کر دیا جائے جو والدین اولاد کے درمیان قائم ہو سکتا ہے اور قائم
ہونا چاہیئے۔ کیوں کہ ان زیادہ سخت قصوروں کا کامیابی کے ساتھ تدارک کرنا
اسی تعلق کے وجود پر منحصر ہے اور بطور تمہید مزید کے اب ہم کو یہ بتانا چاہیئے کہ
اس تعلق کا قائم رہنا اُسی طریقے کے اختیار کرنے کا نتیجہ ہوگا جس کی تائید
اس جگہ کی گئی ہے۔ ہم پہلے دکھا چکے ہیں کہ "اگر بچے کو صرف چھوڑ دیا جائے کہ
اپنی غلط کاریوں کی دردانگیز سزاؤں کو خود بھگتے تو باپ مخالفت سے محفوظ
رہتا ہے اور اس بات سے بچا رہتا ہے کہ بچہ اُس کو دشمن سمجھے"۔ مگر اب یہ دکھانا
باقی ہے کہ "جہاں شروع ہی سے استقلال کے ساتھ اس طریقے کی پیروی
کی جائے گی وہاں والدین اور اولاد میں مستعدانہ دوستی کا خیال ضرور
پیدا ہوگا۔

والدین کا عام برتاؤ اور اُن کا متناقض خاصا کا اثر [illegible]

آج کل اولاد ماں باپ کو عموماً دوست نما دشمن سمجھتی ہے۔ چونکہ بچوں
کے خیالات یقیناً اُس برتاؤ پر منحصر ہوتے ہیں، جو اُن کے ساتھ کیا جاتا ہے، اور
چونکہ وہ برتاؤ یہ ہے کہ کبھی رشوت دی جاتی ہے تو کبھی روک ٹوک

کی جاتی ہے کبھی لاڈ پیار رہے تو کبھی دھمکی جھڑکی کبھی نرمی برتی جاتی ہے تو کبھی سزا دی جاتی ہے۔ اور ان حالتوں سے کبھی تجاوز نہیں ہوتا اس لئے بچے یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے **والدین کے خصائل متناقض ہیں** ماں اپنے چھوٹے بچے سے یہ کہنا کافی سمجھتی ہے کہ "میں سب سے بڑھکر تیری دوست ہوں" اور یہ فرض کرکے کہ بچے کو اس بات کا یقین کرنا چاہیئے یہ نتیجہ نکالتی ہے کہ وہ ایسا ہی سمجھے گا "یہ سب تمہارے فائدے کے لئے ہے میں تم سے بہتر یہ بات جانتی ہوں کہ کون سی چیز تمہارے لئے مناسب ہے، تمہاری اتنی عمر نہیں ہے کہ تم اب اس بات کو سمجھ سکو مگر جب تم بڑے ہو جاؤ گے تو جو کچھ میں کرتی ہوں اس کا شکریہ ادا کرو گے" یہ اور اسی قسم کے بیان ہر روز دہرائے جاتے ہیں۔ اس اثنا میں لڑکا روزمرہ قطعی سزائیں بھگتتا ہے اور ہر گھڑی اس کو منع کیا جاتا ہے کہ یہ کام نہ کرو، وہ کام نہ کرو، فلاں کام نہ کرو، جن کو وہ کرنا چاہتا ہے **لفظوں** کے ذریعے سے اس کے کان میں یہ بات پڑتی ہے کہ "ہم کو تمہاری خوشی مدنظر ہے مگر اُن **افعال** سے جو ان **اقوال** کے ساتھ سرزد ہوتے ہیں اُس کو عموماً تھوڑی بہت تکلیف ہوتی ہے۔ چوں کہ بچے میں اتنی عقل نہیں ہوتی کہ اس **مستقبل** کو سمجھ سکے جو ماں کی نگاہ میں ہے یا اس بات کو سمجھ سکے کہ یہ برتاؤ آیندہ خوشی میں کیوں کر ممد و معاون ہوگا۔ اس لئے وہ اُن ہی نتیجوں سے رائے قائم کرتا ہے جن کو وہ بھگتتا ہے اور یہ بات معلوم کرکے کہ وہ نتیجے ہرگز خوشی دینے والے نہیں ہیں اُس کو اپنی ماں کے **دوستی کے وعدوں** کی نسبت شبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اور کیا بچے سے اس کے سوا کسی دوسرے نتیجے کی توقع رکھنی حماقت نہیں ہے؟ کیا بچے کو اُس شہادت کی بنا پر جو اُس نے حاصل کی ہے یہ استدلال نہیں کرنا چاہیئے؟ اور کیا اس شہادت سے یقیناً وہی نتیجہ نکلتا ہوا نہیں معلوم

ہوتا جو اُس نے نکالا ہے؟ اگر ماں کو بھی اسی قسم کی حالت پیش آئے تو وہ بھی بعینہ اسی طرح استدلال کرے گی۔ اگر اُس کو اپنے واقف کاروں میں کوئی ایسا شخص مل جائے جو ہمیشہ اُس کی خواہشوں کو روکتا ہے، سخت زجر و توبیخ کرتا ہے اور کبھی کبھی سچ مچ اُس کو سزا بھی دے بیٹھے اور باوجود ان افعال کے اس بات کا دعوٰی کرے کہ "مجھے تمہاری بہبودی کا بڑا خیال ہے" تو وہ اُس کے دعوے پر کچھ توجہ نہ کرے گی۔ بھلا پھر وہ ایسا خیال کیوں کرتی ہے کہ بچہ اس کے خلاف عمل کرے گا۔

قدرتی طرزِ تربیت کے نتائج کی توضیح ایک آسان مثال کے ذریعے سے

مگر اب غور کرو کہ جس طریقے پر ہم زور دیتے ہیں اگر **استقلال** کے ساتھ اس کی پیروی کی جائے یعنی اگر ماں اپنے لڑکے کو اُس سزا سے متنبہ کردے جو **قدرت** کے ہاتھوں اُس کو بھگتنی پڑے گی اور اس ذریعے سے نہ صرف سزا کا آلہ بننے سے باز رہے بلکہ ایک دوست کا سا برتاؤ کرے تو اُس کے نتائج کیسے کچھ مختلف ہونگے۔ ایک **مثال** لو اور مثال بھی نہایت سیدھی سادی تاکہ اس امر کی توضیح ہوجائے کہ بچپن میں اس حکمت عملی سے کس طرح کام لیا جاتا ہے۔ **تجربے کا شوق** بچوں میں نہایت نمایاں طور پر پایا جاتا ہے، ان کے کام فطرتاً **استقرائی طریقۂ تحقیقات** کے مطابق ہوتے ہیں۔ فرض کرو کہ اس شوق کی تحریک سے لڑکا **کاغذ** کے ٹکڑے **شمع** پر جلا رہا ہے اور اُن کو جلتے ہوئے غور سے دیکھ رہا ہے۔ ایک معمولی ماں، جس کی طبیعت میں غور و فکر نہیں ہے، یا تو اس عذر سے کہ اُس کو "شرارت" سے روکا جائے یا اس خوف سے کہ وہ اپنے آپ کو جلا نہ ڈالے اس کو اس کام سے باز رہنے کا حکم دے گی اور بصورت **عدم تعمیل** کاغذ اُس کے ہاتھ سے چھین لے گی۔ لیکن اگر وہ ایسا خوش قسمت ہے کہ اُس کی ماں کی طبیعت میں کسی قدر معقولیت ہے، جو یہ بات جانتی ہے کہ جس شوق سے

وہ کاغذ جلتے دیکھ رہا ہے وہ شوق ایک مفید تجسس کا نتیجہ ہی اور جس میں اتنی عقل بھی ہے کہ دست اندازی کے نتیجے سمجھ سکتی ہے، تو وہ اس طرح استدلال کرے گی:-

"... اگر میں اس کام کو روک دوں تو کسی قدر علم کے حاصل ہونے میں مزاحمت واقع ہوگی۔ یہ سچ ہے کہ میں بچے کو جلنے سے بچا سکتی ہوں مگر پھر کیا؟ وہ یقیناً کبھی نہ کبھی اپنے آپ کو جلائے گا۔ اور زندگی میں اس کی حفاظت کے لئے یہ بات نہایت ضروری ہے کہ وہ شعلے کے خواص کو تجربے کے ذریعے سے سیکھے۔ اگر میں اس موجودہ خطرے میں پڑنے سے اس کو روکوں تو وہ یقیناً اس کے بعد اسی خطرے یا اس سے بڑھکر کسی دوسرے خطرے میں پڑے گا جب کہ کوئی شخص روکنے کے لئے موجود نہ ہوگا حالانکہ کوئی حادثہ اس وقت پیش آئے جب کہ میں پاس موجود ہوں تو میں اس کو کسی بڑے صدمے سے بچا سکتی ہوں۔ علاوہ بریں اگر میں اس کو روک دوں تو میں ایک ایسے شغل میں مزاحم ہوں گی جو بذات خود بالکل بے ضرر اور واقعی تفریح بخش ہے۔ اور میری طرف سے تھوڑی بہت بدگمانی بھی اس کے دل میں پیدا ہو جائے گی۔ چوں کہ وہ اس تکلیف سے ناواقف ہے جس سے میں اس کو بچانا چاہتی ہوں اور صرف اسی تکلیف کو محسوس کرتا ہے جو اس کی خواہش کے رک جانے سے پیدا ہوتی ہے: اس لئے وہ یقیناً مجھی کو اس تکلیف کا باعث سمجھے گا: جو صدمہ اس کے خیال میں نہیں آ سکتا اس کے نزدیک اس صدمہ کا کوئی وجود

نہیں ہے۔ اور اُس صدمہ سے بچانے کے لئے میں اُس کو ایسے طریقے سے
سزا دیتی ہوں جس کی تکلیف وہ نہایت سختی سے محسوس کرتا ہے اور یہی
وجہ ہے کہ وہ اپنے نزدیک مجھے تکلیف دہی کا ایک ذریعہ سمجھتا ہے۔ پس
میرے لئے سب سے بہتر طریقہ یہ ہی کہ اُس کو خطروں سے خبردار کر دوں اور
کسی سخت صدمہ کے روکنے کے لئے تیار رہوں ...“

زبردستی کی روک ٹوک صرف اُن حالتوں میں ہونی چاہیے جہاں بچوں کو سخت صدمہ پہونچنے کا اندیشہ ہو

اور اس نتیجے کی پیروی کر کے وہ بچے سے یہ کہے گی ”مجھے اندیشہ ہی کہ اگر تم یہ کام کروگے تو تم کو صدمہ پہونچے گا“ اب فرض کرو کہ لڑکا اپنی ہٹ پر قائم رہے اور غالباً ایسا ہی ہوگا تو انجام یہ ہوگا کہ اُس کا ہاتھ جل جائے گا۔ بھلا اس سے کیا نتائج نکلتے ہیں؟ اوّلاً اُس نے ایسا تجربہ حاصل کیا ہے جس کا حاصل ہونا انجام کار ضروری ہے۔ اور بچے کی ذاتی حفاظت کی غرض سے جس قدر جلد یہ تجربہ حاصل ہو اسی قدر بہتر ہے۔ ثانیاً اُس کو یہ معلوم ہوگیا ہے کہ ماں کی ناراضی یا فہمائش میری بہبودی کے لئے تھی اور اُس کو ماں کی خیر خواہی کا ایک قطعی تجربہ حاصل ہوگیا ہے یعنی اُس کی رائے اور مہربانی پر بھروسا کرنے کے لئے ایک اور وجہ مل گئی ہے۔

بے شک اُن خطروں میں، جو کبھی کبھی پیش آتے ہیں اور جن میں ہاتھ پاؤں ٹوٹ جانے یا کسی دوسرے سخت صدمہ کا اندیشہ ہو، بچوں کو زبردستی روک دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر سخت حالتوں کو چھوڑ کر جو طریقہ تربیت اختیار کیا جائے وہ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ بچے کو چھوٹے موٹے خطروں سے جو روزمرہ پیش آتے ہیں بچایا جائے۔ بلکہ ایسا ہونا چاہیے کہ اُس کو اُن سے بچنے کی نصیحت اور فہمائش کی جائے۔ اس طریقے کی پیروی سے فرزندانہ محبت معمول سے زیادہ قوی ہوجاتی اگر دوسری حالتوں کے متعلق یہاں بھی اسی ترتیب سے کام لیا جائے جس میں قدرتی

سزا دی جاتی ہے نیز اگر بچوں کو ایسی حالت میں چھوڑ دیا جائے کہ وہ باہر کی ہاتھاپائی اور گھر کے تجربوں میں مصروف رہیں جن سے اُن کے چوٹ چپیٹ لگ جانے کا اندیشہ ہو اور صرف اتنی احتیاط رہے کہ جس قدر خطرہ ہو اسی کے موافق کم یا زیادہ سختی کے ساتھ مخالفت کردی جائے تو ممکن نہیں کہ والدین کی دوستی اور ہدایت کا روز افزوں اعتقاد بچوں کے دل میں پیدا نہ ہو - اس طریقے کے اختیار کرنے سے، جیسا کہ پہلے ثابت ہوچکا ہے، یہی فائدہ نہیں کہ ماں باپ اُس **نفرت** سے محفوظ رہتے ہیں جو **کھلم کھلا** سزا دینے سے اولاد کے دل میں پیدا ہو جاتی ہے بلکہ یہ طریقہ جیسا کہ اب معلوم ہوگیا ہے، اُن کو اُس **نفرت** سے بھی بچاتا ہے جو بار بار کی **روک ٹوک** سے پیدا ہو جاتی ہے اور جن وقعوں سے عموماً جھگڑے قضیے پیدا ہوتے ہیں وہی وقعے باہمی **حسن ظن** کے مستحکم ہونے کا ذریعہ بن جاتے ہیں - بجائے اس کے کہ بچوں سے **زبانی** یہ کہا جائے کہ "تمہارے ماں باپ سب سے بڑھ کر تمہارے دوست ہیں (جس کی مخالفت **افعال** سے ظاہر ہے) بچوں کو اس حقیقت کا **علم** روز کے متواتر تجربوں سے حاصل ہو جائے گا - اور جب یہ علم حاصل ہوگیا تو اُن کو ماں باپ پر ایک مدت تک **اعتماد** اور اُن کے ساتھ **لگاؤ** پیدا ہو جائے گا جو اور کسی طرح پیدا نہیں ہو سکتا -

سخت خطاؤں میں قدرتی ذریعہ تنبیہ کس طرح کام میں لانا چاہیے؟

۶- اس طریقے کے عادتہً استعمال کرنے سے والدین اور اولاد میں جو زیادہ ہمدردانہ تعلق یقیناً پیدا ہوتا ہے اُس کو تو ہم بیان کر چکے - اب پھر اسی سوال کی طرف رجوع کرتے ہیں جو اوپر درج کیا گیا ہے یعنی زیادہ **سخت خطاؤں** میں اس طریقے کا استعمال کیونکر کرنا چاہیے؟

۷- اس بات پر غور کرو کہ معمولی دستور العمل کی نسبت اس دستور العمل کی پیروی سے جو ہم نے بیان کیا ہے، سخت خطائیں غالباً نہ تو اس قدر کثرت

اور بعض سخت خطائیں پیدا نہیں ہوتیں

سے واقع ہونگی اور یہ قدر سخت ہونگی۔ بہت سے بچوں کی تربیت کا انتظام ایسا خراب ہوتا ہے کہ اُن کا مزاج ہر وقت برہم رہتا ہے اور اُن کی بدراہی خود اسی اشتعال طبع کا نتیجہ ہوتی ہے۔ بار بار سزا دینے سے جو باہمی اجتناب اور مخالفت کی حالت پیدا ہوتی ہے وہ ہمدردی کو یقیناً زائل کر دیتی ہے اور پھر وہ خطائیں سرزد ہونے لگتی ہیں جو ہمدردی کی بدولت رُک سکتی تھیں وہ سخت برتاو، جو ایک ہی خاندان کے بچے ایک دوسرے کے ساتھ کرتے ہیں، اکثر اوقات بہت کچھ اُسی سخت برتاو کا پرتو ہوتا ہے جو بڑے بوڑھے اُن کے ساتھ کرتے ہیں اور اس برتاو کا خیال کچھ تو بزرگوں کی بلا واسطہ تقلید سے ہوتا ہے اور کچھ بدمزاجی سے اور نیابتہً انتقام لینے کے میلان سے پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ دونوں باتیں سزاؤں اور دھمکیوں کا نتیجہ ہیں جس تربیت کی ہدایت او پر پیش کر چکے ہیں اُس کی بدولت جذبات طبیعت کا عمل زیادہ قوی ہوجاتا ہے اور تازگی نشاط انگیز حالت بچوں کے دل میں قائم ہوجاتی ہے، اور اس میں کچھ کلام نہیں ہوسکتا کہ اس وجہ سے بچے ضرور اس بات سے باز رہیں گے کہ ایک دوسرے کے خلاف اتنی کثرت سے اور ایسے سخت قصور کریں۔ جو قصور اس سے بھی زیادہ قابل الزام ہیں مثلاً چھوٹی اور چھوٹی موٹی چوری، وہ بھی ان ہی اسباب سے کم ہوجائیں گے خانگی ناخوشی ایسے قصوروں کا بڑا سرچشمہ ہے۔ فطرت انسانی کا یہ ایک قانون ہے اور جو لوگ مشاہدہ کرتے ہیں اُن سب کو صاف نظر آتا ہے کہ جن لوگوں کو اعلیٰ درجہ کی تفریحوں سے روکا جاتا ہے وہ ادنیٰ درجہ کی تفریحوں پر گر پڑتے ہیں۔ جن لوگوں کے پاس ہمدردی کی خوشیاں نہیں ہوتیں وہ خودغرضی کی خوشیاں ڈھونڈھتے ہیں؛ لہٰذا معکوس نتیجہ یہ نکلا کہ والدین اور اولاد کے درمیان ہمدردانہ تعلقات کا قائم رہنا اُن قصوروں کی تعداد گھٹاتا ہے جن کی جڑ خودغرضی ہے۔

مگر جب بچوں سے اس قسم کے قصور سرزد ہوں جو بہتر سے بہتر طریقہ تربیت میں بھی کبھی کبھی سرزد ہوں گے تو اُس وقت بھی "تربیت نتائج" اختیار کی جاتی ہے۔ اور اگر والدین اور اولاد میں اعتماد اور محبت کا وہ تعلق موجود ہو، جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے، تو یہ تربیت کارگر ہوگی۔ وجہ یہ ہے کہ قدرتی نتیجے مثلاً چوری کی سزا، دو قسم کے ہوتے ہیں، بلاواسطہ اور بالواسطہ۔ بلاواسطہ نتیجہ جو خالص انصاف پر مبنی ہے یہ ہے کہ مال مسروقہ واپس دلایا جائے۔ منصف حاکم (اور ہر ایک ماں باپ کو ایسا ہی بننے کا ارادہ رکھنا چاہیئے) یہ خواہش کریگا کہ حتی الامکان غلط عمل کی تلافی صحیح عمل سے کی جائے اور چوری کی حالت میں اس کے یہ معنی ہیں کہ یا تو چرائی ہوئی چیز واپس دی جائے یا اگر وہ خرچ ہو گئی ہو تو اُس کی قیمت ادا کی جائے۔ اور بچہ چوری کرے تو یہ معاوضہ اُس کے جیب خرچ سے پورا ہو سکتا ہے۔ بالواسطہ نتیجہ جو زیادہ باوقعت ہے، والدین کی سنجیدہ ناراضی ہے اور اُن تمام قوموں میں، جو کسی قدر مہذب ہیں کہ چوری کو جرم سمجھتی ہیں، یہ نتیجہ ضرور پیش آتا ہے مگر اس پر یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ والدین کی ناراضی کا اظہار خواہ الفاظ میں ہو خواہ مار پیٹ سے ایک معمولی بات ہے اور یہ طریقہ کوئی نئی بات نہیں بتاتا۔ بالکل ٹھیک ہے، ہم پہلے ہی تسلیم کر چکے ہیں کہ بعض موقعوں میں ہمارے طریقے کی پیروی قدرتی طور پر کی جاتی ہے۔ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ تعلیمی طریقوں کا میلان بھی صحیح طریقے کی طرف ہے اور جیسا ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، یہاں بھی یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ چونکہ دنیا کی چیزوں کا قدرتی تعلق قدرتی رحم اور فیاضی پر مبنی ہے اس لئے قدرتی سزا کی سختی ضرورتوں کے موافق ہوگی۔ یعنی والدین کی ناراضی وحشیانہ زمانہ میں جب کہ بچے بھی وحشی ہوتے ہیں سخت تدبیروں کی شکل میں ظاہر ہوگی۔ اور

ت قصوروں
حالت میں
قدرتی
یقہ تربیت
تیار کرنا
ہیئے

زیادہ ترقی یافتہ معاشرت کی حالتوں میں جبکہ بچے بھی بلحاظ معاشرت نرم برتاؤ کے سزاوار ہیں کم بے رحمی کی صورت میں ظاہر ہوگی مگر یہاں جس بات کو ہم خاص طور پر ذہن نشین کرنا چاہتے ہیں وہ یہ ہی کہ اولاد کے سخت قصور پر والدین کی سخت ناراضی کا اثر اُن تناسب سے اچھا ہوگا جس تناسب سے اُن کے درمیان محبت و یگانگت کا تعلق ہے گویا اثر کی مقدار محبت کی مقدار سے متناسب ہوتی ہی۔ جس قدر استقلال کے ساتھ قدرتی سزا کی تربیت سے دوسری حالتوں میں کام لیا جاتا ہے اس حالت میں بھی اسی قدر استقلال کے ساتھ یہ تربیت کارگر ہوگی۔ اس امر کا ثبوت ہر ایک کے تجربے میں ملے گا بشرطیکہ وہ اُس کو تلاش کرے۔

مزید تشریح امر کی کہ خف[illegible] اور نیز سخ[illegible] قصور وا[illegible] تدارک کے[illegible] قدرتی [illegible] کی تربیت[illegible] ہے۔

کیا ہر شخص کو یہ بات معلوم نہیں ہے کہ جب وہ کسی دوسرے شخص کو ناراض کرتا ہے تو اس سے جس قدر اُس کو پشیمانی ہوتی ہے مگر دنیاوی اعتبارات وخیالات واسباب سے قطع نظر کرکے وہ اُسی قدر کم یا زیادہ ہوتی ہے جس قدر کہ اُس کو اس دوسرے شخص کے ساتھ ہمدردی ہوتی ہے؟ کیا وہ اس بات سے واقف نہیں ہے کہ اگر کسی دشمن کو ستایا جائے تو یہ پوشیدہ خوشی کا باعث ہوتا ہے نہ کہ رنج کا؟ کیا اُس کو یہ بات یاد نہیں ہے کہ اگر کوئی محض اجنبی آدمی اُس سے ناراض ہو جائے تو اُس کو بہت ہی کم پروا ہوتی ہے بہ نسبت اس کے کہ کوئی ایسا شخص ناراض ہو جائے جس سے اُس کی گہری دوستی تھی؟ برعکس اس کے کیا وہ ایک قابل قدر اور عزیز دوست کے غصے کو سخت بدنصیبی نہیں سمجھتا اور کیا وہ اُس کو مدتوں اس بات کا سخت افسوس نہیں رہتا؟ پس ظاہر ہے کہ اولاد پر والدین کی ناراضی کا اثر بھی اُس باہمی تعلق کی نسبت سے کم یا زیادہ ہوگا جو پہلے سے اُن میں موجود ہے۔ جب والدین اور اولاد میں اجنبیت مستحکم ہوجائے تو قصوردار بچے کو محض خودغرضانہ خوف کا خیال ہوتا ہے کہ اب

عن قریب جسمانی سزا لے گی یا کسی فائدہ سے محروم رہوں گا اور جب وہ اس سزا کی تکلیف بھگت لیتا ہے تو اُس پر ضرور مخالفت اور نفرت سے، جو اس سزا کا نتیجہ ہے، یہ اجنبیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ برخلاف اس کے جب فرزندانہ تعلق کا جوش جو والدین کی مستقل دوستی کا نتیجہ ہے۔ موجود ہوتا ہے تو والدین کی ناراضی سے نفس کی جو حالت ہوتی ہے وہ نہ صرف اُسی قسم کی آئندہ بدراہی کے لئے ایک مفید روک ہے بلکہ بجائے خود بھی مفید ہے ایسی محبت کرنے والے دوست کے سر دست ہاتھ سے جاتے رہنے سے جو اخلاقی تکلیف ہوتی ہے وہ اُس جسمانی تکلیف کی قائم مقام ہوتی ہے جو بچوں کو عموماً دی جاتی ہے اور اگر زیادہ نہیں تو اُس کے برابر موثر تو ضرور ہی ثابت ہوتی ہے۔ پہلے طریقے سے تو بچوں کے دل میں خوف اور انتقام کا جوش پیدا ہوتا ہے مگر بجائے اس کے دوسرے طریقے سے اس بات کا جوش پیدا ہوتا ہے کہ والدین کے رنج کے ساتھ ہمدردی کریں، اس بات پر سچی پشیمانی ظاہر کریں کہ ہم نے کیوں اُن کو رنج دیا، اور یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ کسی نہ کسی کفارہ سے دوستانہ تعلق کو دوبارہ قائم کریں۔ بجائے اس کے کہ انانیت کے خیالات پیدا ہوں جن کی کثرت سے مجرمانہ افعال سرزد ہوتے ہیں، ایثار علی النفس کے خیالات پیدا ہوتے ہیں جو مجرمانہ افعال کو روکتے ہیں۔ پس قدرتی نتائج کی تربیت سخت اور خفیف دونوں طرح کے قصوروں کے لئے مناسب ہے اور اس کا عمل میں لانا ایسے قصوروں کے نہ صرف انسداد بلکہ استیصال کا باعث ہے۔

المختصر یہ تو ہے کہ سختی سے سختی پیدا ہوتی ہے اور نرمی سے نرمی جن بچوں کے ساتھ بے دردی سے سلوک کیا جاتا ہے

وہ بے وقعت ہو جاتے ہیں مگر مناسب ہمدردی کے ساتھ سلوک کرنا اُن کی ہمدردی کو ترقی دینے کا وسیلہ ہے۔ سیاست ملکی کی طرح سیاست منزل میں بھی سخت ظالمانہ حکومت ہی سے اُن جرموں کی ایک بڑی تعداد پیدا ہوتی ہے جن کا انسداد کرنا پڑتا ہے۔ مگر خلاف اس کے نرم اور فیاضانہ حکمرانی نفاق کے بہت سے اسباب کو روکتی ہے اور دل کو ایسا شائستہ بنا دیتی ہے کہ خلاف ورزی کی طرف میلان کم ہو جاتا ہے۔ جان لاک[1] ایک مدت پہلے کہہ گیا ہے کہ "تعلیم میں سخت سزا دینے سے بہت ہی کم فائدہ ہوتا ہے بلکہ بہت زیادہ نقصان ہوتا ہے، اور میں یقین کرتا ہوں کہ جن بچوں کو بہت زیادہ سزا دی جاتی ہے اُن میں سے شاذ و نادر ہی عمدہ ترین اشخاص نکلتے ہیں بشرطیکہ باقی امور میں مساوی ہوں" اس رائے کی تصدیق میں ہم یہ بات بیان کر سکتے ہیں جو پینٹن ول کے جیل خانے کے سرکاری پادری مسٹر راجرز نے حال ہی میں عام طور پر ظاہر کی ہے کہ جن کم سن مجرموں کو سزائے تازیانہ دی جاتی ہے وہی اکثر و بیشتر جیل خانے میں واپس آتے ہیں" برعکس اس کے نرم برتاؤ کے مفید نتائج کی توضیح اُس واقعہ سے عمدہ طور پر ہوتی ہے جو ایک فرانسیسی خاتون نے ہم سے بیان کیا تھا جس کے مکان میں ہم حال ہی میں بمقام پیرس مقیم رہے تھے۔ ایک چھوٹے لڑکے کی وجہ سے گھر میں ہر روز ایک ادھم مچا رہتا تھا اور نہ تو کوئی شخص گھر پر اس کا انتظام کر سکتا تھا اور نہ مدرسے میں۔ خاتون موصوف نے ہم سے اس بات کی معذرت کر کے یہ کہا کہ مجھے اندیشہ ہے کہ اس لڑکے کا کچھ علاج

---

[1] جان لاک ملک انگلستان کا رہنے والا مشہور فلسفی اور الہیات کا عالم گزرا ہے سنہ ۱۶۳۲ء میں پیدا ہوا تھا سنہ ۱۷۰۴ء میں انتقال کیا۔ مترجم

نہیں ہو سوائے اُس علاج کے جس سے اُس کے بڑے بھائی کی اصلاح میں کامیابی ہوئی ہے یعنی یہ کہ اُس کو انگلستان کے مدرسہ میں بھیج دیا جائے"، اُس نے بیان کیا کہ یہ بڑا بھائی پیرس کے مختلف مدرسوں میں بالکل ناقابل تربیت ثابت ہو چکا تھا اور ہم نے نا اُمیدی کی حالت میں اُس کو انگلستان بھیج دینے کی صلاح پر عمل کیا۔ گھر واپس آنے پر وہ ایسا ہی نیک ہو گیا جیسا کہ پہلے بد تھا۔ خاتون موصوف نے اس عجیب تبدیلی کو بالکل اس امر کی طرف منسوب کیا کہ انگلستان کی تربیت مقابلتہً نرم ہوتی ہے۔

اخلاقی تربیت کے متعلق چند نصیحتیں

اخلاقی تربیت کے اصولوں کی توضیح و تشریح تو اوپر بیان ہو چکی، اب سب سے بہتر بات یہ ہو کہ اس باب کے باقی ماندہ صفحات کو اُن چند بڑے بڑے مسائل کے بیان سے پُر کیا جائے جو اُن اصول سے مستنبط ہوتے ہیں، اختصار کی غرض سے ہم اُن کو نصیحت کی شکل میں بیان کریں گے

پہلی نصیحت

**بچے سے بہت زیادہ اخلاقی نیکی کی توقع نہ رکھو**۔ ابتدائی عمر میں ہر ایک مہذب آدمی کو اخلاق کی اُس حالت میں سے گزرنا پڑتا ہے جس کا ظہور وحشی نسلوں میں، جو کہ نوع انسان کا اصل سرچشمہ ہیں ہوتا ہے۔ جس طرح بچے کے خط و خال مثلاً چپٹی ناک، کھلے کھلے نتھنے، موٹے موٹے ہونٹ، پھٹی پھٹی آنکھیں، چہرہ کی ناموزونی، کچھ عرصے تک وحشیوں کے خط و خال سے مشابہ ہوتی ہو اسی طرح اُس کی فطرت بھی اُن سے مشابہ ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بے رحمی، چوری اور جھوٹ بولنے کی خواہش بچوں میں نہایت عام طور پر پائی جاتی ہے۔ اور جس طرح بچے کے خط و خال میں تغیر واقع ہوتا ہے بعینہٖ اسی طرح اس خواہش میں تربیت کی مدد کے بغیر بھی تھوڑا بہت تغیر ہو جاتا ہے۔ یہ عام خیال کہ "بچے معصوم" ہوتے ہیں اس اعتبار سے تو صحیح ہے کہ ان کو

برائی کا علم نہیں ہوتا مگر اس اعتبار سے بالکل غلط ہی کہ اُن میں برائی کا میلان نہیں ہوتا جیسا کہ دایہ خانہ میں آدھ گھنٹے کے مشاہدہ سے ہر شخص پر ظاہر ہو سکتا ہی جب بچوں کو اُن کے حال پر چھوڑ دیا جاتا ہی، جیسا کہ عام مدرسوں میں ہوتا ہی، تو وہ بمقابلہ بڑے آدمیوں کے آپس میں زیادہ وحشیانہ برتاؤ کرتے ہیں - اور اگر اُن کو ابتدے عمر ہی سے اُن کے حال پر چھوڑ دیا جائے تو اُن کا وحشی پن اور بھی زیادہ نمایاں ہو جاتا ہی -

بچوں کے لیے نیک چلنی کا اعلیٰ معیار قائم کرنا ہی نادانی نہیں ہی بلکہ بہت تاکید کے ساتھ نیک چلنی کی ترغیب دینی بھی نادانی ہی - "قبل از وقت عقلی نشو و نما" کے مضر نتیجوں کو اکثر آدمی پہلے ہی سے تسلیم کرتے ہیں مگر اس امر کا تسلیم کرنا باقی ہی کہ "قبل از وقت اخلاقی نشو و نما" کے نتیجے بھی مضر ہوتے ہیں - ہمارے اخلاقی قویٰ بھی مثل ہمارے اعلیٰ عقلی قویٰ کے نسبتہً پیچیدہ ہوتے ہیں - اسی وجہ سے یہ دونوں طرح کے قویٰ نسبتہً دیر میں نشو و نما پاتے ہیں - اور اگر اخلاقی قویٰ یا عقلی قویٰ میں تحریک کے ذریعے سے بچپن ہی میں مستعدی پیدا ہو جائے تو یہ مستعدی آیندہ اخلاقی نقصان کے بغیر حاصل نہ ہوگی - اسی وجہ سے یہ عام بے قاعدگی دیکھی جاتی ہی کہ جو لوگ بچپن میں نیکی کا نمونہ ہوتے ہیں اُن کی حالت تغیر رفتہ رفتہ برائی کی جانب ہوتا ہی جو بظاہر ناقابل تشریح معلوم ہوتا ہی اور بڑھتا تو گیا انجام کار متوسط درجے سے بھی گر جاتے ہیں - مگر جو لوگ بڑے ہو کر اوروں کے نمونہ ہوتے ہیں اُن کے بچپن کا زمانہ اکثر ایسا ہوتا ہی جس سے ہرگز امید نہیں ہوتی کہ وہ ہونہار ہوں گے -

دوسری نصیحت

اس لیے متوسط درجہ کی تجویزوں اور متوسط درجے کے نتیجوں پر قناعت کرو - اگر تم یہ بات یاد رکھو کہ جس طرح اعلیٰ درجہ کی عقل آہستہ آہستہ حاصل ہوتی ہی اسی طرح ضرور ہی کہ اعلیٰ درجے کے اخلاق تک بھی تدریجی نشو و نما کے ذریعہ سے

رسائی ہو تو تم کو اُن کے عیبوں پر صبر آجائے گا جو تم کو اپنے بچہ میں ہر وقت نظر آتے
ہیں اور تمھارا میلان ہمیشہ کی ڈانٹ ڈپٹ، دھمکی جھڑکی اور روک ٹوک
کی طرف کم ہوگا اس کی وجہ کہ بہت سے والدین سخت خانگی اشتعال کی
کی طرف بچوں کو ترغیب دیتے ہیں اور یہ احمقانہ امید رکھتے ہیں کہ اس طرح ہم اپنے
بچوں کو ایسا بنالیں گے جیسا اُن کو ہونا چاہیے۔

سیاست منزل کی یہ آزادانہ شکل، جس میں اس امر کی خواہش نہیں کی
جاتی کہ بچہ کے چال چلن کے تمام جزئیات کا انتظام خودمختارانہ طور پر کیا جائے اسی
طریقہ کا لازمی نتیجہ ہے جس کی ہم حمایت کرتے ہیں۔ اگر تم دیکھ کر اپنا اطمینان کرلو کہ تمھارا بچہ اپنے
افعال کے قدرتی نتیجے ہمیشہ بھگتتا ہی تو تم اُس زیادہ روک ٹوک سے بچ جاؤگے جس میں
اکثر والدین غلطی کرتے ہیں۔ اگر تم ایسا کرو کہ حتی الامکان اُس کو تجربہ کی تربیت پر
چھوڑ دو تو تم اُس بناوٹی نیکی سے محفوظ رکھوگے جو حد سے زیادہ ضابطہ کی پابندی
سے تربیت پذیر طبیعتوں میں پیدا ہوجاتی ہی یا اُس مخرب اخلاق مخالفت سے محفوظ
رکھوگے جو آزاد طبیعتوں میں اُس ضابطہ کی پابندی سے پیدا ہوتی ہی۔

اگر تم یہ ٹھان لو کہ تمام حالتوں میں بچہ کے افعال پر قدرتی سزا دی جائے
تو تمھارے اپنے مزاج کی بھی ایک مفید روک تھام ہوجائے گی۔ بہت سے
والدین بلکہ ہماری رائے میں زیادہ تر والدین جس طریقہ تعلیم کی پیروی کرتے ہیں وہ
اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ بادی النظر میں جو سوجھ گیا اُسی میں اپنے غصہ کا اظہار کردیا۔
ماں اپنے بچوں کے چھوٹے موٹے قصوروں پر عموماً اس قسم کا سلوک کرتی ہی کہ اُن کے
طمانچے مارتی ہی، سختی کے ساتھ جھڑا جھڑا دیتی ہی، کرخت الفاظ کا استعمال کرتی
ہی، اور حقیقت میں غور سے دیکھا جائے تو اُن میں سے اکثر قصوروں کو قصور نہیں
کہہ سکتے، یہ برتاؤ عام طور پر ماں ہی جذبات کا ظہور ہی جن پر اُس کو بخوبی قابو نہیں

ہوتا۔ یا یوں کہو کہ یہ برتاؤ زیادہ تر اُن جذبات کی تحریک کا نتیجہ ہو نہ کہ مجرموں کو فائدہ پہنچانے کی خواہش کا لیکن اگر تم خلاف ورزی کی حالت میں اس بات کے سوچنے کے لیے توقف کرو کہ اس کا باقاعدہ نتیجہ کیا ہونا چاہیے۔ اور قصوروار کو یہ نتیجہ محسوس کرنے کا سب سے عمدہ طریقہ ہو تو تم کو اپنے نفس کو قابو میں لانے کے لیے وقت مل جائے گا۔ نرا اندھا غصہ، جو اوّل اوّل بھڑک اُٹھا تھا، دب جائے گا۔ اور جذبہ کی شدت کم ہو جائے گی۔ اور ظن غالب ہو کہ یہ بات تم کو حق سے منحرف نہیں ہونے دے گی۔

تیسری نصیحت

مگر اس بات کے درپے نہ رہو کہ بے حس و حرکت آلہ کی طرح برتاؤ کرو۔ یاد رکھو کہ بچے کے افعال کی اُن قدرتی سزاؤں کے علاوہ، جو مختلف حالات کے اثر سے اُس پر عاید ہوتی ہیں، تمھاری رضامندی یا نارضامندی بھی ایک قدرتی سزا ہو اور بچہ کی ہدایت کے لیے جو وسائل مقرر ہیں اُن میں سے ایک وسیلہ یہ بھی ہو۔ جس غلطی پر ہم اعتراض کرتے چلے آئے ہیں وہ یہ ہو کہ جو سزائیں قدرت نے مقرر کی ہیں اُن کے عوض میں والدین کی ناراضی اور مصنوعی سزاؤں کو رکھا جاتا ہو۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ "والدین کی ناراضی کو ان قدرتی سزاؤں کے عوض میں رکھنا چاہیے"، تو ہم کو اس بات سے ہرگز بحث نہیں ہو کہ قدرتی سزاؤں کے ساتھ ساتھ بھی اُن کا استعمال نہ کرنا چاہیے۔ اگرچہ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ دوم درجہ کی سزا اوّل درجہ کی سزا کی جگہ غصب کرے تاہم اُس کو اوّل درجہ کی سزا کے ساتھ بطور ضمیمہ اور اعتدال کے ساتھ شامل رکھنا مناسب ہو۔ جس قدر غم یا غصہ تم کو محسوس ہو اُس کو الفاظ یا تیور کے ذریعے سے ظاہر کرنا چاہیے مگر شرط یہی ہو کہ تمھاری عقل سلیم بھی اس بات کو قبول کرے۔ جو اثر تمھارے دل میں پیدا ہو گا اُس کی نوعیت اور اُس کی مقدار تمھاری اپنی خصلت پر یقیناً منحصر ہو گی اور اسی لیے یہ کہنا کہ وہ اثر ایسا

یا ویسا ہونا چاہیے" بے فائدہ ہے۔ مگر تم اس احساس کو اُس احساس میں تبدیل کرنے کی کوشش کرسکتے ہو جس کی بابت تم کو یہ یقین ہے کہ اُس کو قائم رکھنا چاہیے۔ مگر اس اظہار ناخوشی میں دو انتہائی حدوں (افراط و تفریط) سے بچنا چاہیئے نہ صرف اس اعتبار سے کہ یہ ناخوشی کس قدر سخت ہونی چاہیے بلکہ اس اعتبار سے بھی کہ کتنے عرصہ تک قائم رہنی چاہیے ایک تو طبیعت کی نا استواری سے بچو جو ماؤں میں عام طور پر پائی جاتی ہے اور جس کا نتیجہ یہ ہے کہ دھمکی اور معافی تقریباً ساتھ ہی ساتھ ہوتی ہیں، دوسرے ایسا نہ کرو کہ نا واجب طور پر بچہ سے بے تعلقی ظاہر کرتے رہو مبادا اُس کو یہ عادت ہو جائے کہ وہ بغیر تمہاری دوستی کے زندگی بسر کرسکے اور تمہارا رعب اُس کے دل سے اُٹھ جائے، بچہ کی حرکات پر جو اخلاقی سزائیں تم کو دینی پڑتی ہیں تم کو چاہیئے کہ ان سزاؤں کو حتی الامکان اُن سزاؤں کے مشابہ بناؤ جو تمہارے خیال میں کامل الفطرت والدین کو دینی پڑتی ہیں۔

چوتھی نصیحت

احکام کی تعداد میں کمی کرو۔ حکم صرف اُس وقت دو جب کہ ترتیب کے دیگر وسائل بچہ کی سمجھ سے باہر ہوں یا اُن میں ناکامیابی رہو مسٹر ریکیٹر کہتے ہیں کہ "اکثر حکموں میں بمقابلہ بچہ کے فائدہ کے والدین کے فائدہ کا زیادہ خیال رکھا جاتا ہے" جس طرح تمدن کی ابتدائی حالت میں قانون کی خلاف ورزی کی سزا زیادہ تر اس وجہ سے نہیں دی جاتی تھی کہ یہ فعل حقیقۃً ناواجب ہے بلکہ اس وجہ سے کہ وہ بادشاہ کے حکم کی بے وقعتی ہے یعنی اُس کے برخلاف بغاوت ہے اسی طرح بہت سے خاندانوں میں جو سزا قصوروار کو دی جاتی ہے اُس کا محرک زیادہ تر نافرمانی کا غصہ ہوتا ہے نہ کہ قصور پر ملامت کرنا۔ یہ فقرے ہر شخص کے کان میں پڑے ہوں گے تم کو میری نافرمانی کی کیا مجال ہے میں کہتا ہوں کہ حضرت یہ کام آپ سے کرا کے رہوں گا میں تم کو یہ بات جلد بتا دوں گا کہ آقا کون ہے میں یا تم؟ اور پھر

غور کرو کہ یہ الفاظ یا لہجہ اور یہ تیور کس بات پر دلالت کرتے ہیں؟ ایسی گفتگو میں بچہ کی بہبودی کے خیال کی بہ نسبت اُس کو مطیع و منقاد بنانے کا ارادہ زیادہ نمایاں طور پر نظر آتا ہی۔ اُس وقت تو والدین کی طبیعت کا اندازہ اُس مطلق العنان حاکم کے انداز سے کچھ ایسا مختلف نہیں ہوتا جو سرکش رعیت کو سزا دینے پر تلا بیٹھا ہو۔ مگر سلیم الطبع والدین مثل اُس مقنّن کے جس کو نوع انسان سے محبت ہی جبر و تعدی سے خوش نہیں ہوتے بلکہ اس بات سے خوش ہوتے ہیں کہ جبر و تعدی کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ چال چلن کے باضابطہ رکھنے کے لیے جہاں کہیں دوسرے طریقوں کو کامیابی کے ساتھ استعمال کر سکتے ہیں وہاں بغیر قانون کے کام چلاتے ہیں اور جب قانون کی ضرورت ہوتی ہے تو قانون کی طرف رجوع کرنے سے اُن کو افسوس ہوتا ہی۔ جیسا کہ مسٹر ریکٹر نے بیان کیا ہی کہ "ملکی سیاست کا سب سے عمدہ قاعدہ یہ ہی کہ حد سے زیادہ تحکم نہ کرو۔ یہی قاعدہ تعلیم میں بھی صادق آتا ہی" جن والدین کی تحکم کی خواہش اپنے فرض منصبی کے سچے خیال کی وجہ سے رُک جاتی ہی اُن کا مقصد یہ ہوتا ہی کہ اپنے بچوں کو ایسا بنائیں کہ جہاں تک ممکن ہو۔ وہ خود اپنے نفس کو قابو میں رکھیں اور وہ تحکم کی طرف صرف اس وجہ سے رجوع کرتے ہیں کہ وہ آخری علاج ہی۔

پانچویں نصیحت

مگر جب کبھی حکم دو قطعی طور پر اور استقلال کے ساتھ حکم دو۔ اگر صورت ایسی واقع ہو جس میں درحقیقت بجز تحکم کے کسی دوسری طرح برتاؤ ممکن نہیں ہی تو اپنا حکم ناطق جاری کر دو اور پھر ہرگز اس سے پیچھے نہ ہٹو۔ جو کام تم کرنے والے ہو اُس کو اچھی طرح سوچ لو۔ تمام نتیجوں کا موازنہ کر لو اس بات پر غور کرو کہ تمہارے ارادہ میں کافی استقلال ہی یا نہیں اور جب آخرکار ایک قانون بنا لو تو چاہے کتنا ہی نقصان ہو اس کی تعمیل پر زور دو۔ تمہاری سزائیں اُن سزاؤں کے مشابہ ہونی چاہئیں جو موجودات غیر ذی روح دیتے ہیں یعنی اٹل ہونی چاہئیں۔ جب بچہ

پہلے پہل گرم بھوبل میں ہاتھ ڈالتا ہے تو اُس کا ہاتھ جل جاتا ہے دوسری دفعہ بھی جل جاتا ہے تیسری دفعہ بھی جل جاتا ہے، غرض کہ ہر دفعہ جل جاتا ہے۔ اور اُس کو بہت جلد معلوم ہو جاتا ہے کہ گرم بھوبل کو نہیں چھونا چاہیئے۔ اگر تم بھی ایسے ہی مستقل رہو یعنی اگر تم بچے سے یہ بات کہہ دو کہ "فلاں فلاں کاموں کی یہ سزائیں ہیں اور وہ سزائیں ویسے ہی استقلال سے دی جائیں تو جس طرح **قوانین قدرت** کی وقعت اُس کے دل میں پیدا ہوتی ہے تمہارے **قوانین** کی وقعت بھی جلد پیدا ہو جائے گی۔ اور جب یہ وقعت ایک دفعہ قائم ہو گئی تو بے انتہا خانگی خرابیاں رُک جائیں گی۔ **تعلیمی غلطیوں میں سے ایک نہایت ہی سخت غلطی بے استقلالی** ہے۔ جس طرح قوم میں جب انصاف کا کوئی خاص انتظام نہیں ہوتا تو جرائم کی زیادتی ہو جاتی ہے اسی طرح خاندانوں میں قصوروں کا بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے سزا دینے میں تامل یا بے قاعدگی کا نتیجہ ہے۔ کم زور ماں، جو ہمیشہ دھمکاتی رہتی ہے اور شاذ و نادر ہی دھمکی کو پورا کرتی ہے، جو جلدی میں قانون بناتی ہے اور فرصت میں بیٹھ کر پچھتاتی ہے جو ایک ہی قصور پر۔ تلون کے ایما پر کبھی سختی سے سلوک کرتی ہے اور کبھی نرمی سے اپنے لیے اور اپنے بچوں کے لیے **مصیبتوں کا ذخیرہ** جمع کرتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو اُن کی نظروں میں حقیر کرتی ہے وہ نفس پر قابو نہ رکھنے کی مثال اُن کے سامنے پیش کرتی ہے، وہ اُن کو **عدول حکمی** کی ترغیب دیتی ہے کیوں کہ بچوں کو یہ امید ہوتی ہے کہ غالباً سزا نہیں ملے گی وہ بے حد **جھگڑے قضیے** پیدا کرتی ہے اور ساتھ ہی اپنے مزاج اور بچوں کے مزاج کو **نقصان** پہنچاتی ہے۔ وہ اُن دلوں میں **اخلاقی ابتری** پیدا کرتی ہے جس کی تلافی آیندہ عمر میں بہت کچھ نقصان اُٹھانے کے بعد بہ مشکل ہو سکتی ہے۔ وحشیانہ خانگی حکومت بھی اگر استقلال کے ساتھ عمل میں لائی جائے، اُس رحم دلی کی حکومت سے، جو بے استقلالی کے ساتھ عمل میں لائی جائے زیادہ بہتر ہے۔ ہم دوبارہ یہی کہتے ہیں کہ حتی الامکان جابرانہ

تدبیروں سے بچو لیکن جب تم دیکھو کہ تحکم واقعی ناگزیر ہے اُس وقت پورے خود مختار حاکم بن جاؤ۔

چھٹی نصیحت

یاد رکھو کہ تمھاری تربیت کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ ایک ایسا شخص پیدا کیا جائے جو اپنے نفس پر آپ حکومت کر سکے نہ کہ ایسا جس پر غیر حکومت کریں۔ اگر تمھاری اولاد کی قسمت میں غلاموں کی طرح زندگی بسر کرنا لکھا ہو تو جسقدر غلامی کی عادت اُن کو بچپن میں ڈلوائی جائے اُسی قدر اچھا ہے۔ مگر چونکہ اُن کو رفتہ رفتہ آزاد بننا ہے اور آیندہ کوئی شخص اُن کے روزانہ چال چلن کی روک ٹوک کرنیوالا بھی نہ ہوگا اس لیے اپنی نگرانی کے زمانہ میں جس قدر اُن کو نفس پر قابو رکھنے کی عادت ڈالواؤ گے اُسی قدر بہتر ہوگا۔ قدرتی نتایج کے ذریعے سے تربیت کرنا ایک ایسا طریقہ ہے جو انگلستان کی موجودہ معاشرت کے لیے خاص کر موزوں ہے۔ فیوڈل سسٹم (نظام جاگیری) کے زمانہ میں اُن بڑی بڑی خرابیوں میں سے، جن کا اہل شہر کو خوف لگا رہتا تھا ایک خرابی اپنے بالادستوں کا غصہ بھی تھا لہذا اُس وقت یہی بات مناسب تھی کہ والدین کی سختی بچوں کی تادیب کا بڑا ذریعہ ہو۔ مگر اب اہل شہر کو کسی سے کچھ اندیشہ نہیں ہے بھلائی یا برائی جس کا وہ تجربہ کرتے ہیں، زیادہ تر وہی ہوتی ہے جو باعتبار نظام اشیا کے اِن کے ذاتی چال چلن کا نتیجہ ہوتی ہے اس لیے یہ امر ضروری ہے کہ وہ ابتدائے عمر سے بذریعہ تجربہ اُن نیک و بد نتایج کا علم حاصل کرنا شروع کریں جو خاص خاص قسم کے چال چلن سے قدرتی طور پر پیدا ہوتے ہیں۔ اسی بنا پر والدین کو تربیت کا مقصد ایسا قرار دینا چاہیے جس سے اُن کا تحکم کم ہو جائے اور تحکم کی بجائے جلد سے جلد بچے کے دل میں ضبط نفس کا وہ خیال جاگزیں ہو جائے جو نتایج کی پیش بینی سے پیدا ہوتا ہے۔ شیرخواری کے زمانہ میں بہت کچھ تحکم کی ضرورت ہے۔ تین برس کے

بچہ کو جو کھلے استرہ سے کھیل رہا ہو اس بات کی اجازت دی جاسکتی کہ "وہ نتائج کی تربیت" کے ذریعے علم حاصل کرے کیوں کہ ممکن ہی کہ اُس کے نتائج نہایت سخت ہوں۔ مگر جوں جوں عقل بڑھتی جائے تحکمانہ مداخلتوں کی تعداد کم ہوسکتی ہی اور کم ہونی چاہیے۔ تاکہ جب بچے زمانہ بلوغ کو پہونچ جائیں تو رفتہ رفتہ انقلاب مداخلتوں کا خاتمہ ہو جائے[۱]۔ جملہ انقلاب خطرناک ہوتے ہیں اور سب سے زیادہ خطرناک انقلاب ہی جو گھر کی پابندی سے نکل کر دنیاوی آزادی میں قدم رکھتے وقت پیش آتا ہی۔ اسی وجہ سے جس کی ہم حمایت کرتے ہیں اُس کی پیروی ضروری ہی۔ چوں کہ اس اصول سے بچہ کی طاقت ضبط بڑھتی ہی اور ضبط نفس کے اُس درجہ میں ترقی ہوتی رہتی ہی جس میں اُس کو چھوڑا گیا تھا اور وہ ایسی حالت تک اس طرح بہ تدریج پہنچتا ہی کہ بغیر کسی کی مدد کے اپنے نفس پر قابو رکھ سکے اس لیے اس اصول پر کاربند رہنے سے وہ انقلاب پیش نہیں آسکتا جو طفولیت کی "بیرونی حکومت" سے جوانی کی "اندرونی حکومت" تک یکایک پہنچتے وقت پیش آتا ہی اور خوفناک ہوتا ہی۔ خانگی سیاست کی تاریخ ملکی سیاست کی تاریخ کا کسی قدر نمونہ ہونا چاہیے۔ یعنی ابتدا میں مطلق العنان حکومت، کیونکہ ابتدا میں فی الحقیقت اُس کی ضرورت ہی اور رفتہ رفتہ باضابطہ حکومت شروع ہونی چاہیے جس میں رعایا کی آزادی کسی قدر خاص طور پر تسلیم کی جاتی ہی۔ پھر رعایا کی اس آزادی کو بہ تدریج وسعت دی جائے اور آخر کار والدین کی حکومت کو آہستہ آہستہ بالکل اُٹھا لیا جائے۔

ساتویں نصیحت

اگر بچے زیادہ خود رائی ظاہر کریں تو اس کا افسوس نہ کرو۔ یہ اُس ترقی کا نتیجہ ہی جو زمانہ حال کی تعلیم میں نہایت نمایاں ہی۔ یہ جو بچہ کو آج کل زیادہ

[۱] اُردو میں اس مضمون کی یہ مثل مشہور ہی "بارہ برس کو بید کیا اور اٹھارہ برس کو قید کیا"۔ مترجم

میلان اس بات کی طرف ہی کہ وہ اپنے فعل کی آزادی کے خواہاں رہتے ہیں یہ اس امر کا جواب ہی کہ والدین اُن پر ظلم کرنے کا میلان کم رکھتے ہیں۔ یہ دونوں میلان اسی طریقہ تربیت کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس پر ہم زور دے رہے ہیں۔ اور جس کی بدولت بچے قدرتی سزاؤں کا تجربہ کرکے روز بروز اس امر کی طرف زیادہ مائل ہوتے جاتے ہیں کہ اپنے نفس پر آپ حکومت کریں۔ اور یہ دونوں میلان ہماری زیادہ ترقی یافتہ معاشرت کے ساتھ ساتھ موجود رہتے ہیں۔ آزاد انگریز لڑکا آزاد انگریز آدمی کا باپ ہی۔ اور آزاد باپ بغیر آزاد لڑکے کے نہیں بن سکتا اور اگر لڑکا آزاد نہیں تو باپ آزاد ہو نہیں سکتا۔ جرمنی کے معلم کہتے ہیں کہ "ہم بارہ جرمنی لڑکوں کو قابو میں رکھ سکتے ہیں مگر ایک انگریز لڑکے کو قابو میں نہیں رکھ سکتے" کیا ہم بھی یہ خواہش کریں کہ ہمارے لڑکے ایسے تربیت پذیر ہو جائیں جیسے جرمنی لڑکے اور اس کے ساتھ ہی بالغ اہل جرمنی کی سی کمینہ اطاعت اور ملکی غلامی حاصل کریں؟ یا ہم اپنے لڑکوں میں اُن خیالات کو پرداشش کریں جو اُن کو آزاد آدمی بناتے ہیں اور ساتھ میں اپنے طریقوں کو بھی بدل دیں۔

آٹھویں نصیحت

آخری نصیحت یہ ہی کہ یہ بات ہمیشہ یاد رکھو کہ ٹھیک ٹھیک تعلیم دینا سہل اور آسان کام نہیں ہی بلکہ ایک پیچیدہ نہایت مشکل اور سب سے زیادہ سخت کام ہی جو بڑے آدمی کو اپنی زندگی میں کرنا پڑتا ہی۔ خانگی تربیت کا ناشائستہ اور معمولی طریقہ جو بے سوچے سمجھے اختیار کیا جاتا ہی اُس کو تو نہایت ادنی اور نہایت ناتربیت یافتہ عقل والے آدمی بھی برت سکتے ہیں طمانچے اور سخت الفاظ ایسی سزائیں ہیں جو نہایت ہی کم ترقی یافتہ وحشی آدمی اور احمق سے احمق دہقان دونوں کو یکساں سوجھتی ہیں۔ وحشی جانور تک اس طریقہ تربیت کا استعمال کرسکتے ہیں۔ جیسا کہ تم نے دیکھا ہوگا کہ جب کوئی پلا بہت زیادہ دق کرتا ہی تو کتیا اُس کو روکنے

سے کے لیئے اُس پر جُملہ رانی اور آہستہ سے کاٹتی ہے۔ لیکن اگر تم ایک معقول اور مہذب طریقہ کو کامیابی کے ساتھ عمل میں لانا چاہو تو تم کو بہت کچھ عقلی محنت کے لیئے یعنی کسی قدر مطالعہ کسی قدر ذہانت، کسی قدر صبر اور کسی قدر ضبط نفس کے لیئے آمادہ رہنا چاہیئے تم کو ہمیشہ اس بات پر غور کرنا ہوگا کہ وہ کون سے نتیجے ہیں جو بڑی عمر میں بعض قسم کے کاموں سے پیدا ہوتے ہیں اور پھر تم کو ایسے طریقے تجویز کرنے چاہئیں جن سے بچوں کے اُسی قسم کے کاموں پر بھی اُسی قسم کے نتیجے عائد ہوں۔ اس بات کی ضرورت ہر روز پیش آئے گی کہ بچوں کے چال چلن کے محرکات کی چھان بین کی جائے یعنی اچھے اور بُرے کاموں میں تمیز کی جائے خواہ بُرے کام اچھوں کے مشابہ کیوں نہ ہوں اور تم کو اس جابرانہ غلطی کے رفع کرنے کے لیئے جو اکثر کی جاتی ہے ہمیشہ خبردار رہنا پڑے گا۔ یعنی "جو کام نہ نیک ہیں نہ بد اُن کو خواہ مخواہ قصور سمجھ لیا جاتا ہے اور جو جذبات بچوں کے دل میں ہوتے ہیں اُن سے بدتر جذبات اُن کی طرف منسوب کر دیئے جاتے ہیں"۔ اپنے طریقہ کو ہر بچے کے مزاج کے موافق بنانے کے لیئے تم کو اُس میں تھوڑی بہت تبدیلی ضرور کرنی چاہیئے اور جوں جوں ہر بچہ کا مزاج نئی نئی صورتیں اختیار کرے تم کو اور بھی زیادہ تبدیلی کرنے کے لیئے مستعد رہنا چاہیئے۔ جس طریقہ سے بظاہر کوئی نتیجہ نکلتا ہو یا کم نتیجہ نکلتا ہو اُس پر استقلال کے ساتھ قائم رکھنے کے لیئے تم کو اکثر اوقات اپنے یقین کو مضبوط رکھنا پڑے گا۔ اگر تم کو ایسے بچوں سے سابقہ پڑے جن کی تربیت غلط طریقہ پر ہوئی ہے تو تم ایک مدت مدید تک صبر کی آزمائش کے لیئے مستعد رہنا چاہیئے تب جا کر بہتر طریقوں میں کامیابی ہوگی کیوں کہ جو تربیت وہاں بھی آسان نہیں ہے جہاں ابتدا ہی سے صحیح خیالات موجود ہوتے ہیں وہ اُس وقت تو دو چند مشکل ہو جائے گی جب کہ غلط خیالات کو صحیح کرنا ہو۔ تم کو ہمیشہ بچوں ہی

کے محرکات کی چھان بین نہیں کرنی پڑے گی بلکہ خود اپنے محرکات کی بھی چھان بین کرنی پڑے گی یعنی تم کو دو قسم کے خیالات میں تمیز کرنی ہوگی ایک وہ جو سچی پدرانہ خیرخواہی سے دل میں پیدا ہوتے ہیں اور دوسرے وہ جو تمھاری اپنی خودغرضی آرام طلبی اور خواہش تحکم کے سبب پیدا ہوتے ہیں اور پھر اس سے بھی زیادہ صبر آزما بات یہ ہی کہ تم کو اِن کمینہ رغبتوں کا نہ صرف پتا لگانا پڑیگا بلکہ اُن کو مغلوب بھی کرنا پڑیگا۔ المختصر جب تم بچوں کو تعلیم دو تو اُس کے ساتھ ہی اعلی التعلیم بھی تم کو جاری رکھنی پڑے گی۔ بحیثیت عقلی تم کو یہ لازم ہی کہ سب سے زیادہ پیچیدہ مضمون یعنی انسانی فطرت اور اُس کے قوانین کو (جس طرح کہ اُن کا ظہور تمھارے بچوں میں تمھارے نفس میں اور دنیا میں ہوتا ہی) ایسی ترقی دو کہ اُن سے نیک مقصد حاصل ہو۔ بحیثیت اخلاقی تم کو یہ لازم ہی کہ اعلی درجے کے خیالات کی مشق ہمیشہ جاری رکھو اور ادنی درجے کے خیالات کی روک تھام رکھو۔

یہ ایک حقیقت ہی جس کی صداقت عام طور پر ابھی تسلیم نہیں کی گئی کہ صرف فرائض والدین کے ادا ہونے کی بدولت ہی ہر زن و مرد عقلی نشو و نما کے آخری درجہ پر پہنچتا ہی اور جب یہ حقیقت مسلّم ہو جائے گی اُس وقت پتہ چلے گا کہ وہ انتظام کیسا قابل تعریف ہی جس کی بدولت لوگوں کے نہایت قوی جذبات اُن کو ایسی تربیت کی ہدایت کرتے ہیں جو کسی اور طرح اُن کو حاصل نہیں ہو سکتی۔

جہاں بعض آدمی تعلیم کے اس خیال کو شبہ کی نظر سے دیکھیں گے اور اُس سے اُن کی ہمت ٹوٹ جائے گی وہاں ہمارا خیال ہی کہ بعض آدمیوں کو اس خیال کے واقعی ہونے کا ثبوت ملے گا کیونکہ تعلیم کا کامل نمونہ یہی ہی ضعیف الرائے بے درد اور کوتاہ نظر اس بات کو سمجھ سکیں گے بلکہ اس کے سمجھنے کے لیئے فطرت انسانی کے اعلی اوصاف قوت رائے ہمدردی اور عقل دوربین کی ضرورت ہی اور

جن لوگوں میں یہ اوصاف موجود ہیں وہ دیکھیں گے کہ اس قسم کی تعلیم نوع انسان کی زیادہ ترقی یافتہ حالتوں کے لیئے مناسب ہی اگرچہ اس میں بہت محنت اور نفس کشی کی ضرورت ہے، تاہم وہ دیکھیں گے کہ اُس سے خوشی کا ایک کثیر معاوضہ ملنے کی توقع ہی، خواہ فوراً ملے خواہ کچھ عرصہ کے بعد۔ وہ یہ بھی دیکھیں گے کہ تربیت کا بُرا طریقہ والدین اور اولاد دونوں کے لیئے مضر نتیجے پیدا کرتا ہی اور اسی لیئے وہ دُہری آفت ہی۔ مگر اچھا طریقہ دُہری برکت ہی یعنی تربیت دینے والا بھی مستفید ہوتا ہی اور پانے والا بھی۔

# باب چہارم

## تعلیم جسمانی

ہر طبقے کے لوگ اُمرا۔ غربا دیہاتی۔ شہری وغیرہ مویشیوں کی پرورش اور اُن کے انتظام سے خاص دلچسپی رکھتے ہیں۔

خواہ نواب کے دستر خوان پر جب کہ بیگمات کھانا کھا کر چلی جاتی ہیں، خواہ کسانوں کے معمولی بازار میں، اور خواہ گاؤں کے نوزہ خانہ میں سب جگہ متداول سیاسی مسائل پر بحث کرنے کے بعد جس مضمون سے لوگوں کو بالعموم سب سے زیادہ دلچسپی ہوتی ہے وہ جانوروں کا انتظام ہے۔ جب شکاری شکار سے فارغ ہونے کے بعد سوار ہو کر گھر کی طرف واپس آتے ہیں تو گفتگو کا میلان عموماً گھوڑوں کی نسل بڑھانے اور اُن کے نسب ناموں یا کسی نہ کسی "عمدہ مضمون" کی طرف ہوتا ہے۔ اور اگر شکاری کو کسی مرطوب زمین میں شکار کا اتفاق ہوا ہے تو غالباً جب تک کتوں کے علاج کی بابت کچھ نہ کچھ بات چیت نہ ہولے اُس وقت تک وہ دن ختم نہ ہوگا جب پاس پاس کے کھیتوں کے مزارع گرجا گھر سے واپس آتے وقت اکٹھے ہو کر کھیتوں میں گزرتے ہیں تو وعظ پر نکتہ چینی کرتے کرتے موسم، فصل، اور ذخیرہ پر نکتہ چینی کرنے لگتے ہیں اور پھر اُسے چھوڑ کر مختلف قسم کے چارے اور اُس کے پرورش کرنے والی خاصیتوں کے متعلق بحث چھڑ جاتی ہے۔ زید عمر اپنے اپنے سورخانوں کے متعلق اپنی یادداشتوں کا باہم مقابلہ کرکے اپنی گفتگو سے یہ بات ظاہر کرتے ہیں کہ ہم اپنے مالکوں کے مویشیوں اور بھیڑوں کی عمدہ نگرانی کرتے

ہیں اور اُن نتیجوں پر غور کرتے ہیں جو خاص خاص علاجوں سے ان پر مترتب ہوتے ہیں۔ تازی خانہ، اصطبل، گئوشالہ اور بھیڑوں کے باڑے کے قواعد وضوابط نہ صرف دیہاتی لوگوں کو دل پسند ہیں بلکہ شہروں میں بھی بے شمار اہل حرفہ جو کتے پالتے ہیں اور وہ نوجوان جن کو اتنا مقدور ہے کہ کبھی کبھی اپنے شکار کے شوق کا لطف اٹھائیں اور اُن کے زیادہ متین بزرگ جو ترقی زراعت پر گفت گو کرتے ہیں اور مسٹر میکی کی سالانہ رپورٹوں اور مسٹر کیئرڈ[1] کی اُن چھٹیوں کو پڑھتے ہیں جو اُنھوں نے اخبار ٹائمز لکھی تھیں، اگر اُن سب کی تعداد کو جمع کیا جائے تو ملک کا بڑا حصہ ایسے ہی لوگ نکلیں گے۔ اگر تمام سلطنت کے بالغ مردوں کو لو تو معلوم ہوگا کہ اُن میں سے اکثر کسی نہ کسی قسم کے جانوروں کی نسل بڑھانے، اُن کو پرورش کرنے یا سدھانے کا کچھ نہ کچھ شوق رکھتے ہیں۔

اپنے بچوں کی پرورش اور تربیت سے لوگ عموماً بالکل غافل ہیں۔

مگر کھانا کھانے کے بعد جو بات چیت ہوتی ہے اُس وقت یا اسی قسم کی یکجائی کے دوسرے موقعوں پر آدمی کے بچوں کی پرورش کے متعلق کبھی کسی نے ذکر سنا ہے؟ جب کوئی دیہاتی شریف اپنے اصطبل کا روزانہ معائنہ کر چکتا ہے، جب وہ اپنے چھوٹے چھوٹے بیٹے دھن کو ایک نظر دیکھ چکتا ہے اور نوکروں چاکروں کو ہدایتیں کر چکتا ہے تو بھلا وہ دایہ خانہ میں جا کر خوردونوش کے انتظام، غذا کے اوقات اور ہوا کی آمدورفت کو دن میں کتنی دفعہ دیکھتا بھالتا ہے (ایک دفعہ بھی نہیں)۔ اُس کے کتب خانہ کی الماریوں میں ایسی کتابیں تو مل سکتی ہیں، جیسے وائٹ صاحب کی کتاب ''بیطاری''، اسٹیون صاحب کی کھیت کی کتاب، نمرود صاحب کی کتاب ''شکاریوں کی حالت''، اور اُس کو ان سے

[1] سر جیمز کیئرڈ ملک سکاٹ لینڈ کا باشندہ، علم فلاحت کا ماہر اور مدبر سلطنت تھا۔ ۱۸۱۶ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۹۲ء میں انتقال کیا۔ مترجم

مضامین سے تھوڑی بہت واقفیت ہوتی ہے۔ مگر اُس نے بچوں کے زمانۂ شیرخواری اور طفولیت کے انتظام کے متعلق کتنی کتابیں پڑھی ہیں؟ (ایک بھی نہیں) اس قسم کی باتوں سے کہ "کھل میں مویشی کو موٹا تازہ بنانے کی خاصیت ہے" "سوکھی گھاس اور بھوسے کی قدر وقیمت میں کیا مناسبت ہے" "حد سے زیادہ کلا اور (گھاس) کھلانے سے مویشی کو کس نقصان کے پہنچنے کا خطرہ ہے" ہر ایک زمین دار کسان اور دہقان کو کچھ نہ کچھ واقفیت ہوتی ہے۔ مگر اُن میں فیصدی کتنے آدمی ایسے ہیں جو اس بات کی تحقیقات کرتے ہیں کہ آیا وہ خوراک، جو ہم اپنے بچوں کو دیتے ہیں، نمو کرنے والے لڑکوں اور لڑکیوں کی جسمانی ضرورتوں کے موافق ہے یا نہیں؟ اس قسم کے لوگوں کی بابت اس فروگذاشت کی وجہ شاید یہ بتائی جائے کہ اُن کو کاموں اپنے سے فرصت نہیں مگر یہ وجہ کافی ہے کیوں کہ یہی فروگذاشت شہر کے لوگوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ بیس شہری آدمیوں میں سے صرف ایک ہی دو آدمی اس بات سے ناواقف ہوں گے کہ جب گھوڑا چارہ کھا چکے تو اُسی وقت اس سے کام نہیں لینا چاہیے مگر ان بیس میں سے اگر بالفرض سب کے سب صاحبِ اولاد ہوں تو غالباً ایک بھی ایسا نہیں ملے گا جس نے اس بات پر غور کیا ہو کہ بچوں کے کھانا کھانے اور سبقوں کے دوبارہ شروع کرنے کے درمیان وقفہ کافی ہے یا نہیں۔ درحقیقت اگر جرح کی جائے تو قریب قریب ہر شخص اس پوشیدہ رائے کو ظاہر کر دے گا کہ "بچوں کے کھانے پینے کا انتظام میرا کام نہیں ہے" وہ غالباً یہ جواب دے گا "اجی! میں تو یہ سب کام عورتوں پر چھوڑ دیتا ہوں" اور اکثر حالتوں میں اُس جواب کے لہجہ سے اشارۃً یہ مفہوم ہو گا کہ "ایسی غور و پرداخت مردوں کی شان کے شایاں نہیں ہے"

اگر رسمی حیثیت سے قطع نظر کر کے کسی دوسری حیثیت سے غور کیا جائے

تو یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے کہ اول درجے کے بچھڑوں کا تیار کرنا تو ایسا کام ہے جس کو تعلیم یافتہ اشخاص خوشی خوشی بہت سا وقت اور خیال صرف کرتے ہیں۔ مگر تعلیم و تربیت کے ذریعے اچھے انسان پیدا کرنا ایسا کام ہے جس کی نسبت کتابیں یہ رائے دی جاتی ہے کہ وہ اُن کی وجہ کے لائق نہیں ہے۔ مائیں جن کو السنہ، موسیقی اور دوسرے ایسے ہی چند فنوں سے سوا اور کسی چیز کی تعلیم بہت ہی کم دی جاتی ہے ان کی نسبت یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ اناؤں کی مدد سے جن میں نہایت پرانے تعصبات بھرے ہوتے ہیں بچوں کے خور و نوش، لباس اور پرورش کا انتظام کرنے کی لیاقت رکھتی ہیں اس اثنا میں باپ کتابیں اور رسالے پڑھتے ہیں، زراعتی جلسوں میں شریک ہوتے ہیں، تجربے کرتے ہیں، مباحثوں میں مصروف رہتے ہیں اور یہ سب کچھ اس غرض سے کہ قابل انعام سوروں کو موٹا تازہ بنانے کا طریقہ معلوم ہو جائے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ایسا گھوڑا تیار کرنے کے لیے جو ڈربی[1] کی گھوڑدوڑ میں بازی لے جائے بے حد محنت و جاں فشانی کی جاتی ہے۔ اور زمانہ حال کا پہلوان پیدا کرنے کے لیے مطلق کوشش نہیں کی جاتی۔ اگر گلور باشندگان لیلیپوٹا[2] کے حالات میں یہ بیان کرتا کہ وہاں کے مرد اس بات کا علم حاصل کرنے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کے خواہاں رہتے ہیں کہ حیوانات کے بچوں کی پرورش کا بہترین طریقہ کونسا ہے اور خود اپنے

[1] ڈربی انگلستان کا ایک ضلع ہے۔ معدنیات اور ریشم کی دست کاری کی وجہ سے خاص کر مشہور ہے اور آج کل انگلستان میں گھوڑدوڑ کا بڑا مرکز ہے۔ مترجم

[2] مسٹر سوفٹ نے ایک فرضی قصہ موسوم بہ "سفرنامہ گلور" لکھا ہے۔ گلور اس قصہ کا ہیرو (موضوع) لیلیپوٹا ایک فرضی جزیرہ ہے جس کا ذکر اس سفرنامہ میں آیا ہے۔ گلور سفر کرتا ہوا اس جزیرے میں جا پہنچا ہے۔ یہ جزیرہ بالکل گول ہے۔ اس کا قطر ساڑھے چار میل کے قریب ہے۔ یہاں کے باشندوں کی نسبت عجیب غریب باتیں بیان کی گئی ہیں۔ اور یہ لکھا ہے کہ وہ محض خیالی باتوں میں مصروف رہتے ہیں اور کام کی باتوں کی طرف سے غافل رہتے ہیں۔ مترجم

بچوں کی جسمانی تربیت نہایت ضروری ہو اور روز بروز اُسکی ضرورت بڑھتی جاتی ہے۔

بچوں کی پرورش کا عمدہ ترین طریقہ دریافت کرنے سے غافل ہیں تو یہ بات بھی اُن ہی حماقتوں کی ہم پلہ ہوتی ہیں جو اُس نے اُن کی طرف منسوب کی ہیں۔

مگر یہ بات نہایت اہم ہے۔ اگرچہ یہ مقابلہ ایک ہنسی کی بات ہے تاہم جو نتیجہ اس سے نکلتا ہے وہ کچھ کم مصیبت نہیں ہے۔ جیسا کہ ایک لائق مصنف لکھتا ہے کہ زندگی میں کامیابی کی پہلی شرط "اچھا حیوان بننا" ہے اور قومی اقبال مندی کی پہلی شرط اچھے حیوان کی قوم بننا ہے۔ یہی بات نہیں کہ جنگ کا نتیجہ زیادہ تر سپاہیوں کی طاقت اور جفاکشی پر منحصر ہے بلکہ تجارت کے جھگڑے قضیئے بھی ایک حد تک تجارتی مال پیدا کرنے والوں کی جسمانی جفاکشی کی بدولت طے ہوتے ہیں۔ میدان جنگ اور میدان تجارت میں دوسری قوموں کے ساتھ زور آزمائی کرنے سے ہم کو خوف کرنے کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی مگر اس بات کے آثار کچھ کم نہیں ہیں کہ عنقریب ہماری قوموں پر حد سے زیادہ بوجھ پڑنے والا ہے۔ آج کل زندگی کی کشاکش اس قدر سخت ہو گئی ہے کہ بہت ہی کم لوگ بغیر کسی نقصان کے ضروری محنت برداشت کر سکتے ہیں۔ ہزاروں آدمی پہلے ہی اُس بوجھ سے کچلے جا رہے ہیں جس کے نیچے وہ دبے ہوئے ہیں۔ اگرچہ یہ بوجھ جیسا ظن غالب ہے اسی طرح بڑھتا رہا تو وہ نہایت ہی صحیح القویٰ لوگوں کو بھی تھکا کر رہے گا۔ ایسی لیے یہ بات خاص طور پر مہتم بالشان ہو جاتی ہے کہ بچوں کی تربیت اس طرح کی جائے کہ جو محنت اُن کو درپیش ہے اس لیے محض عقلی قابلیت ہی نہیں بلکہ اُس محنت سے جو سخت تکان اور ضعف ہوتا ہے اُس کے برداشت کرنے کے لیے جسمانی قابلیت بھی پیدا ہو جائے۔

جسمانی تربیت کی طرف آجکل لوگوں کی توجہ مبذول ہونے لگی ہے۔

خوش قسمتی سے اس معاملہ پر لوگ توجہ کرنے لگے ہیں۔ مسٹر کنگسلے[۱] نے اپنی

---

[۱] ریویرنڈ چارلس کنگسلے۔ انگلستان کا مشہور مصنف ہے۔ ۱۸۱۹ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۷۵ء میں فوت۔ مترجم

تحریروں میں حد سے زیادہ تربیت کی مخالفت کی ہے جو شاید اعتدال سے کسی قدر گزر گئی ہے۔ جیسا کہ اس قسم کی مخالفتوں میں ہوا کرتا ہے۔ اخباروں میں کبھی کبھی اس قسم کی چٹھیاں اور مضامین لکھے جاتے ہیں جن سے ظاہر ہے کہ لوگوں کو جسمانی تربیت کا شوق پیدا ہوتا جاتا ہے۔ اب ایک مدرسہ قائم ہوا ہے جس کا نام استہزاءً "**تنومند عیسائیت**" رکھا گیا ہے جس سے اس مدرسہ کا مقصد صاف معلوم ہوتا ہے۔ یہ مقصد اس بات کی دلیل ہے کہ لوگوں کی رائے یہ ہوتی جاتی ہے کہ تربیت اولاد کے موجودہ طریقوں میں جسم کی بہبودی کا لحاظ کافی طور پر نہیں رکھا جاتا۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ مضمون عنقریب معرض بحث میں آنے والا ہے۔

جسمانی تربیت کا انتظام سائنس کے حقائق مسلمہ کے موافق ہونا چاہیئے۔

ہم کو ضرورت اس بات کی ہے کہ دایہ خانہ اور مدرسہ کے دستور العمل کو آج کل کے سائنس کے مسلمہ حقائق کے موافق بنایا جائے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ کیمیائی کارخانوں کی تحقیقات سے جو فائدے بھیڑوں اور بیلوں کو پہنچ رہے ہیں اُن فائدوں میں اپنے بچوں کو بھی حصہ دیا جائے۔ گھوڑوں کے سدھانے اور سوروں کے پالنے کی بڑی ضرورت ہے، اس پر ہم کو کچھ اعتراض نہیں۔ مگر بچوں کو اس طرح پرورش کرنا کہ وہ بڑے ہو کے پورا نمو حاصل کریں آخر اس کی بھی تو کچھ نہ کچھ وقعت ہے۔ اس لیے ہم یہ بات سمجھانی چاہتے ہیں کہ جس طرح مویشیوں کی پرورش میں اُن نتائج پر کاربند رہتے ہیں جو قیاس سے صحیح معلوم ہوتے ہیں اور عمل سے جن کی تصدیق ہوتی ہے اسی طرح اولاد کی پرورش میں بھی اُن پر کاربند رہنا چاہیئے۔ غالباً ان خیالات کے پیش کرنے سے بہت سے آدمی چونکنے ہو جائیں گے بلکہ شاید ناخوش ہوں گے۔ مگر یہ اصول کہ انسان بھی ان ہی قوانین منضبطہ کا تابع ہے جن کے تابع ادنیٰ حیوانات ہیں" ایسا اصول ہے جس میں کچھ کلام نہیں ہو سکتا اور جسے ہم کو مان لینا چاہیے۔ کوئی عالم تشریح الابدان، کوئی عالم عضویات، کوئی کیمیاگر ایک لمحہ کے لیے بھی اس بات

کے تسلیم کرنے میں لیں و پیش نہیں کرے گا کہ جو عام اصول حیوانات کے جسمانی نشوونما پر صادق آتے ہیں وہی اصول انسان کے جسمانی نشوونما پر بھی صادق آتے ہیں اور اس بات کا سچے دل سے تسلیم کرلینا رائیگاں نہ جائے گا یعنی حیوانات پر تجربہ اور مشاہدہ کرنے کے بعد جو اصول کلیہ قائم کیئے گئے ہیں وہی انسان کی ہدایت کے لیئے بھی مفید ہوسکتے ہیں۔ اگرچہ علم الحیات ابتدائی حالت میں ہے تاہم بعض ابتدائی اُصول تک اُس کی رسائی ہوچکی ہے جو جملہ اجسام نامیہ کے نمو کی جن میں انسان بھی شامل ہے، بنیاد ہیں۔ جو کام ہم کو اب کرنا ہے اور جس کے لیے ہم کسی قدر کوشش کریں گے وہ اس بات کا پتا لگانا ہے کہ اِن بنیادی اُصول کو بچپن اور جوانی کی جسمانی تربیت سے کیا تعلق ہے۔

معاشرت کی ہر ایک حالت کا میلان کبھو افراط کی طرف ہوتا ہے اور کبھی تفریط کی طرف

معاشرت کے ہر ایک درجہ میں اس بات کا پتا چل سکتا ہے کہ ہر شے کا میلان افراط و تفریط کی طرف ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ انقلاب سلطنت کے بعد ظلم و تعدی کا دور دورہ ہوتا ہے۔ اور ہم لوگوں میں اس کی مثال یہ ہے کہ زمانہ اصلاح اور زمانہ پابندی رسوم قدیمہ کا ایک دوسرے کے بعد دورہ ہوتا رہتا ہے۔ اسی میلان کی وجہ سے زمانہ نفس پرستی کے بعد زمانہ رہبانیت کا اور زمانہ رہبانیت کے بعد زمانہ نفس پرستی کا دور آتا رہتا ہے۔ تجارت میں اس میلان کا ہمیشہ یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ کبھی تو تجارت کی خوب گرم بازاری ہوتی ہے اور کبھی سخت کساد بازاری۔ اسی میلان کی بدولت فیشن کے دل دادہ ایک حد سے زیادہ بیہودگی کو چھوڑ کر مقابل کی دوسری بیہودگی اختیار کرلیتے ہیں۔ غرض کہ یہی میلان ہماری خورد و نوش کی عادتوں پر اور ضمناً بچوں کی خوراک پر اثر کرتا ہے۔ اِس دور کے بعد جو شکم پرستی کی وجہ سے مشہور تھا اب نسبتہً پرہیز کا زمانہ آگیا ہے۔ اور لوگوں کا ترک مسکرات اور ترک حیوانات کرنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ اُن کو زمانۂ قدیم کی رندانہ معاشرت پر سخت اعتراض ہے، بڑوں کے خورونوش میں اس تبدیلی کے ساتھ ساتھ بچوں کے خورونوش

میں بھی ایسی ہی تبدیلی ہو گئی ہے۔ قدیم نسلوں کا یہ اعتقاد تھا کہ بچہ کو جس قدر زیادہ کھانے پینے کی ترغیب دی جاسکے اسی قدر بہتر ہے۔ اور اب بھی کسانوں کے درمیان اور دور دست اضلاع میں، جہاں پشت ہا پشت کے خیالات بہت زیادہ عرصہ تک قائم رہتے ہیں، ایسے ماں باپ مل سکتے ہیں جو اپنے بچوں کو بسیار خوری کی ترغیب دیتے ہیں مگر تعلیم یافتہ لوگوں میں جن کا رجحان پرہیز کی طرف زیادہ تر ہوتا ہے یہ قطعی میلان دیکھا جاتا ہے کہ بچوں کو ضرورت سے کم خوراک دی جائے نہ کہ زیادہ۔ اور زمانۂ قدیم کی بہیمیت سے جو نفرت والدین کو ہے اُس کا ظہور درحقیقت اولاد کے ساتھ برتاؤ کرتے وقت زیادہ صراحت کے ساتھ ہوتا ہے اور اپنے نفس کے ساتھ کم کیونکہ والدین کی اشتہائیں اُن کی ریائی رہبانیت کو، جہاں تک کہ اُن کے چال چلن سے اُس کا تعلق ہے روک دیتی ہیں مگر یہ رہبانیت بچوں کے لیے قانون بنانے میں اپنا پورا رنگ دکھاتی ہے۔

یہ بات کہ "پرخوری اور کم خوری دونوں بُری ہیں" ایک بدیہی بات ہے مگر ان دونوں میں کم خوری نہایت خراب ہے۔ جیسا کہ ایک اعلیٰ درجہ کی معتبر کتاب میں لکھا ہے کہ "اگر کبھی کبھی خوب ڈٹ کر کھالیں تو اُس کے نتائج بھوکے رہنے کے مقابلہ میں کم تر مضر ہوتے ہیں اور زیادہ آسانی سے اُن کا تدارک ہو جاتا ہے"[۱] اس کے علاوہ جہاں بچوں کے کھانے پینے میں محققانہ دست اندازی نہیں کی جاتی وہاں بسیار خوری کی نوبت شاذ و نادر ہی پیش آتی ہے۔ "پرخوری بڑوں کا عیب ہے نہ کہ بچوں کا۔ اور جب تک بڑوں کی طرف سے اجازت نہ ہو ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ بچے کھاؤ یا پیٹو بن جائیں"[۲] روک ٹوک کا یہ طریقہ، جس کو بہت سے

...ی اور کم خوری
...ں بُری ہیں
...م خوری بہت
...ی ہے۔

---

[۱] - دیکھو کتاب "طب عملی کی قاموس"

[۲] ایضاً ایضاً ایضاً

سے والدین نہایت ضروری سمجھتے ہیں، ناکافی مشاہدہ اور غلط استدلال پر مبنی ہی۔ "حد سے متجاوز قانون" جس طرح سلطنت میں ہوتا ہی اسی طرح دایہ خانہ میں بھی ہوتا ہی۔ اور خوراک کی مقدار میں تخفیف کرنا اس قانون کی مضر ترین صورتوں میں سے ایک صورت ہی۔

"مگر کیا بچوں کو پُرخوری کی اجازت دی جائے کیا یہ بات گوارا کی جائے کہ وہ لذیذ کھانے خوب کھائیں اور اپنے تئیں بیمار ڈال لیں جیسا کہ وہ یقیناً کریں گے"؟ اگر یہ سوال اسی حیثیت سے اور انھی الفاظ میں کیا جائے تو اُس کا ایک ہی جواب ہوسکتا ہی مگر جب یہ سوال اس حیثیت سے کیا جاتا ہی تو اُس میں امر زیر بحث کو پہلے ہی فرض کر لیا جاتا ہی۔ ہم زور کے ساتھ کہتے ہیں کہ چوں کہ اشتہا ادنی حیوانات کے لیے عمدہ رہبر ہی چوں کہ وہ شیر خوار بچے کے لیے عمدہ رہبر ہی، چوں کہ وہ کم زور آدمی کے لیے عمدہ رہبر ہی، چوں کہ وہ انسان کی مختلف الحالت نسلوں کے لیے عمدہ رہبر ہی اور چوں کہ وہ ہر بالغ انسان کے لیے جو صحت کی زندگی بسر کرتا ہی عمدہ رہبر ہی اس لیے بے کھٹکے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہی کہ وہ بچپن کے لیے بھی عمدہ رہبر ہی۔ اگر اشتہا اور سب حالتوں میں قابل اعتبار ہو مگر بچپن ہی میں قابل اعتبار نہ ہو تو یہ بات حقیقت میں عجیب ہوگی۔

شاید بعض لوگ اس جواب کو پڑھ کر بے چین ہو جائیں گے کیونکہ وہ یہ خیال کریں گے کہ ہم اس کے بالکل برخلاف واقعات پیش کرسکتے ہیں۔ لیکن اگر ہم اُن پیش کردہ واقعات کے بجا ہونے سے انکار کریں تو یہ بات بیہودہ معلوم ہوگی اور گو یہ بات بظاہر خلاف عقل ہی مگر اس کی پوری طرح تائید ہوسکتی ہی سچ یہ ہی کہ بے اعتدالی کی جو مثالیں اُن لوگوں کے دلوں میں ہیں وہ عموماً اُسی روک ٹوک کے نتیجے ہیں۔ جن کو وہ صحیح قرار دیتے معلوم ہوتے ہیں۔ بچوں کو راہبانہ طریقہ پر غذا دینے کا یہ نتیجہ ہی کہ جب اُن کو موقع ملتا ہی حد سے زیادہ کھا جاتے ہیں۔ ان نتیجوں سے

اس عام حقیقت کی کسی قدر توضیح ہوتی ہے کہ بچپن میں جن لوگوں کی تربیت نہایت سختی کے ساتھ ہوتی ہے وہ بعد میں نہایت وحشیانہ بے اعتدالیوں پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ یہ نتائج اُن خوفناک واقعات سے مشابہ ہیں جو کسی زمانہ میں خانقاہوں میں عام طور پر دیکھے جاتے تھے۔ جہاں راہبہ عورتیں سخت ترین ریاضت سے قریب قریب شیطانی شرارتوں میں اُتر آتی تھیں۔ ان نتائج سے صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مدت کی رُکی ہوئی خواہشیں اس قدر سخت ہوتی ہیں کہ اُن پر قابو نہیں ہو سکتا۔ غور کرو کہ بچوں کی معمولی رغبت کس چیز کی طرف ہوتی ہے اور اُن کے ساتھ کیسا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ مٹھاس کی رغبت بچوں میں نمایاں ہوتی ہے اور قریب قریب سب بچوں میں پائی جاتی ہے۔ غالباً سو میں سے ننانوے آدمی یہ بات فرض کر لیتے ہیں کہ اس میں زبان کے چٹخارے کے سوا اور کچھ نہیں ہے اور یہ کہ دیگر نفسانی خواہشوں کی طرح اس کو بھی روکنا چاہیے۔ مگر عالم عضویات جس کی تحقیقاتیں نظام کائنات کی روز افزوں وقعت اُس کے دل میں پیدا کرتی ہیں، یہ گمان کرتا ہے کہ مٹھاس کی اس رغبت میں زبان کے چٹخارے کے علاوہ، جیسا کہ عام خیال ہے، کچھ اور بھی ہے، اور تحقیقات سے اس گمان کی تصدیق ہوتی ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ نظام بدن میں شکر بہت کارآمد ہے شکر اور چربی کے مادے دونوں جسم میں داخل ہو کر آکسائڈ بن جاتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی حرارت کو ترقی ہوتی ہے۔ چند اور مرکبات بھی، قبل اس کے کہ حرارت پیدا کرنے والی خوراک کا کام دیں، شکر کی صورت میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور شکر بننے کا یہ عمل جسم میں جاری رہتا ہے۔ دوران ہضم میں نہ صرف نشاستہ شکر کی صورت میں تبدیل ہوتا ہے بلکہ مسٹر کلاڈ برنارڈ[۵۱] نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ جگر ایک کارخانہ ہے جہاں

۵۱ مسٹر کلاڈ برنارڈ ملک فرانس کا باشندہ اور علم الاعضا کا عالم تھا۔ ۱۸۱۳ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۷۸ء میں فوت ہوا۔ مترجم

خوراک کے دوسرے اجزا بھی شکر کی صورت میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔
غرض شکر کی ضرورت ایسی قطعی و یقینی ہو کہ جب اور کوئی چیز نہیں ملتی تو اُن مادوں
سے بھی جن میں نائٹروجن شامل ہے، اسی طرح شکر بن جاتی ہو۔ پس بچوں کو اس قابل
قدر حرارت پیدا کرنے والی خوراک کی نمایاں خواہش ہوتی ہو۔ اور جب ہم اس پر اتنا
اور اضافہ کریں کہ بچے اُس خوراک کو سخت ناپسند کرتے ہیں جو ایک اُڈ بنتے وقت
حرارت کی بہت زیادہ مقدار کو خارج کر دیتی ہو (یعنی چربی) تو ہم کو اس خیال کی
ایک جھلک مل جاتی ہو کہ ایک چیز کی زیادتی سے دوسری چیز کی کمی کا بدل ہو جاتی ہو۔
یعنی جسم کی بناوٹ کے لیے زیادہ تر شکر کی ضرورت اس وجہ سے ہوتی ہو
کہ زیادہ چربی سے کام نہیں چل سکتا۔ اس کے علاوہ بچوں کو ترکاریوں کی
ترشی بھی بھاتی ہو، وہ سب قسم کے پھلوں کا لطف اُٹھاتے ہیں اور اگر بہتر شے نہ ملے
تو بچے کروندے اور نہایت کھٹے جنگلی سیب تک کھا جاتے ہیں۔ اب غور کرو
کہ نہ صرف ترکاریوں کی ترشی اور معدنیات کی ترشی بہت عمدہ مقویات ہیں اور
اعتدال کے ساتھ اُن کا استعمال کیا جائے تو مفید ہیں بلکہ اگر قدرتی حالت میں اُن کا
استعمال کیا جائے تو اور بھی فائدے ہیں۔ ڈاکٹر اینڈرو کوم[۵۱] کہتے ہیں "پکے
پھل انگلستان کی نسبت یورپ کے دوسرے ملکوں میں زیادہ آزادی سے
بچوں کو دئے جاتے ہیں اور خصوصاً جب کہ امعاء کا عمل ناقص ہو بہت مفید
ہوتے ہیں"۔ اب دیکھو کہ بچوں کی طبعی ضرورتوں میں اور اُس معمولی برتاؤ میں
جو اُن کے ساتھ کیا جاتا ہو کیسا اختلاف ہو۔ بچوں میں دو قسم کی خواہشیں زیادہ
تر ہوتی ہیں اور وہ خواہشیں غالباً اُن کے جسم کی خاص ضرورتوں کو ظاہر کرتی ہیں

[۵۱] ڈاکٹر اینڈرو کوم ملک سکاٹ لینڈ کا باشندہ اور علم الاعضاء کا عالم تھا۔ ۱۷۹۷ء میں پیدا ہوا
اور ۱۸۴۷ء میں انتقال کیا۔ مترجم

اور نہ صرف دایہ خانہ کے انتظام خورد و نوش میں اُن سے غفلت کی جاتی ہے بلکہ عام میلان بھی یہی ہے کہ ان کو پورا نہ ہونے دیا جائے۔ صبح کو دودھ نان یا و رات کو چائے اور مکھن روٹی یا کوئی اور اسی قدر روکھی پھیکی خوراک کی مداومت سختی کے ساتھ کی جاتی ہے اور ذائقہ کو کسی قسم کی مدد پہنچانا غیر ضروری بلکہ بے جا سمجھا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ جب تہوار کے دنوں میں لذیذ چیزیں نہایت کثرت سے موجود ہوتی ہیں، جب جیب خرچ ملنے کی وجہ سے حلوائی کی دُکان تک بچوں کی رسائی ہو جاتی ہے یا جب کسی اتفاق سے وہ میوہ دار باغ تک بے روک ٹوک جا پہنچتے ہیں تو مدت کی رُکی ہوئی خواہشیں جو روک کی وجہ سے شدید ہوتی ہیں، سخت بے اعتدالی تک نوبت پہنچا دیتی ہیں۔ کچھ تو پچھلی بندشوں سے آزاد ہو جانے کے سبب اور کچھ یہ سمجھ کر کہ کل سے بڑا لمبا روزہ شروع ہو جائے گا بچے لگتے ہاتھ خوب عید مناتے ہیں۔ پھر جب پُرخوری کی خرابیاں ظاہر ہوتی ہیں تو یہ حجت پیش کی جاتی ہے کہ بچوں کو اُن کی اشتہا کی ہدایت پر نہ چھوڑنا چاہیئے! اس مصنوعی روک ٹوک کے آفت ناک نتائج کو اور زیادہ روک ٹوک کی ضرورت کے ثبوت میں پیش کیا جاتا ہے! اس لیے ہم نہایت زور سے کہتے ہیں کہ اس طریقۂ دست اندازی کو صحیح قرار دینے کے لیے جو دلیل پیش کی گئی ہے وہ نہایت لغو ہے۔ ہم اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اگر بچوں کو زیادہ لذیذ چیزیں دی جائیں جو اعضا کے لیے درکار ہیں، تو وہ شاید ہی کبھی کھانے پینے میں ایسی بے اعتدالی کریں جیسی کہ آج کل جب موقع ملتا ہے، کر بیٹھتے ہیں۔ غرض جیسا کہ ڈاکٹر کوم ہدایت کرتے ہیں اگر پھل "باقاعدہ خوراک کا جز ہوں" اور جیسا کہ مشورہ دیتے ہیں۔ کھانے کے درمیان میں نہیں بلکہ کھانے کے ساتھ کھائے جائیں) تو بچوں کو جنگلی سیب اور بیر پر رغبت نہ ہوگی اور یہی صورت اور حالتوں میں پیش آئے گی۔

اس بات
اندازہ
کی جا سکتی
بچہ کو کس
خوراک دی
اس کا فیصلہ
بچہ کی طبیع
کر سکتی

یہی بات نہیں کہ بچّوں کی اشتہا پر اعتماد کرنے کے لمّی دلائل قوی ہیں
اور جو دلائل اُن پر اعتماد کرنے کے لیئے پیش کیے گئے ہیں وہ ضعیف ہیں۔ بلکہ بات
یہ ہی کہ اس کے سوا اور کوئی ہدایت قابل اعتماد ہی نہیں ہی۔ بھلا والدین کی اس رائے
کی، جس کو اصل ضابطہ کی جگہ دی گئی ہی، کیا وقعت ہو سکتی ہی؟ جب بچہ اور کھانا مانگتا
ہی اور ماں یا اُستانی کہتی ہی "نہیں"، تو وہ کس بنیاد پر انکار کرتی ہی وہ خیال کرتی ہی
کہ بچہ کافی کھانا کھا چکا ہی مگر اس خیال کے وجوہ اس کے پاس کہاں ہیں؟ کیا وہ
لڑکے کے معدہ کا پوشیدہ حال معلوم کر لیتی ہی کیا کوئی کشف کی قوت اُس کو
حاصل ہی جس کے سبب بچہ کے جسم کی ضرورتوں کو دریافت کر لیتی ہی؟ اگر نہیں تو
پھر کس طرح بے تکلف فیصلہ کر سکتی ہی؟ کیا وہ نہیں جانتی کہ اس امر کا فیصلہ کہ "جسم کو خوراک
کی ضرورت ہی یا نہیں"، بے شمار پیچیدہ اسباب پر منحصر ہی۔ یعنی یہ ضرورت موسم کی حرارت
و برودت، ہوا کی رطوبت اور ہوا کی برقی حالت کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہی، اور
ورزش جو کی جاتی ہی اس کے لحاظ سے، اُس خوراک کی نوعیت و مقدار کے لحاظ سے
جو سب سے پچھلے کھانے کے وقت کھائی گئی ہو، اور جس قدر سرعت سے پچھلا کھانا
ہضم ہو گیا ہو اس کے لحاظ سے بھی بدلتی رہتی ہی؟ اس مجموعہ اسباب کے نتیجہ کا اندازہ
وہ کیوں کر کر سکتی ہی؟ جیسا کہ ہم نے ایک پانچ سال کے لڑکے کے باپ کو جس کا
لڑکا اس قدر لمبا ہی کہ اُس کے اکثر ہم عمر لڑکے اُس کے کندھے کے برابر آتے ہیں
یہ کہتے سنا ہی کہ "میرے پاس کوئی مصنوعی قیاس نہیں ہی جس سے اُس کی خوراک
کا اندازہ ہو سکے۔ اگر میں یہ کہوں کہ اتنا کھانا کافی ہی تو یہ محض قیاس ہی، اور قیاس
کے غلط ہونے کا ایسا ہی احتمال ہی جیسا کہ صحیح ہونے کا۔ اسی لیے قیاس پر
اعتماد نہ کر کے میں اُس کو پیٹ بھر کر کھانے دیتا ہوں" اور جو شخص اس اصول پر
اُس کے نتائج کے ذریعہ سے رائے قائم کرے گا وہ ضرور اس بات کی معقولیت کو

تسلیم کرنے پر مجبور ہو گا۔ حقیقت میں جس اعتماد پر اکثر اشخاص بچوں کے معدے کے لیے قانون مقرر کرتے ہیں اُس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ علم الاعضا سے ناواقف ہیں اگر اُن کو زیادہ علم ہوتا تو وہ اس قدر دلیر نہ ہوتے "علم کے گھمنڈ میں بمقابلہ جہالت کے گھمنڈ کے انکسار ہوتا ہے" اگر کوئی شخص یہ بات سیکھنی چاہے کہ انسان کی رائے پر کس قدر کم اور ازلی نظام اشیاء پر کس قدر زیادہ اعتماد کرنا چاہیئے تو اُس کو ناتجربہ کار طبیب کی جانبازی کا مقابلہ نہایت حاذق طبیب کی احتیاط کے ساتھ کرنا چاہیئے۔ یا سر جان[a] فاربس کی اُس کتاب میں جس کا نام ہے "مرض کے علاج میں طبیعت اور طریقوں مصنوعی کا بیان"[b] خوض کرنا چاہیئے اور وہ دیکھ لے گا کہ قوانین زندگی کا جس قدر زیادہ علم حاصل ہوتا جاتا ہے اُسی قدر اپنی رائے پر کم اور طبیعت پر زیادہ اعتماد ہوتا جاتا ہے۔

بچوں کو عمدہ اور مقوی غذا دینی چاہیئے۔ یہ خیال غلط ہے کہ گوشت بچوں کے لیے مفید نہیں ہے۔

خوراک کی کمیت کے سوال کو چھوڑ کر اُس کی کیفیت کے سوال کی طرف رجوع کریں تو یہاں بھی ہم کو وہی راہبانہ میلان نظر آتا ہے۔ نہ صرف محدود خوراک بلکہ نسبتًہ ادنی درجہ کی خوراک بچوں کے لیے مناسب تصور کی جاتی ہے۔ آج کل عام رائے یہ ہے کہ اُن کو گوشت بہت کم دینا چاہیئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کم مقدور والوں کو کفایت شعاری نے اس رائے کی طرف ہدایت کی ہے یعنی اسی اقتضائے یہ خیال پیدا ہوا ہے۔ جن والدین کو زیادہ گوشت خریدنے کا مقدور نہیں ہوتا وہ بچوں کی درخواستوں کا یہ جواب دیتے ہیں "گوشت چھوٹے لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے

---

[a] سر جان فاربس برطانیہ کلاں کا ایک مشہور طبیب تھا۔ اُس نے فن طبابت میں مختلف کتابیں لکھی ہیں ۱۷۸۷ء میں پیدا ہوا۔ اور ۱۸۶۱ء میں فوت ہوا۔ مترجم

[b] اس کتاب کا انگریزی نام یہ ہے

مترجم

اچھا نہیں ہے"۔ اور یہ بات جو اوّل اوّل محض ایک آسان سا عذر تھا، بار بار کی تکرار سے ایک اعتقاد بن گیا ہے مگر جن لوگوں کو خرچ کا خیال نہیں ہوتا وہ کچھ تو اکثر اشخاص کی دیکھا دیکھی اور کچھ اناؤں کے اثر سے جو ادنیٰ طبقہ میں سے لی جاتی ہیں اور کسی قدر زمانہ گزشتہ کی میت سے مخالفت کے سبب مغلوب ہو گئے ہیں۔

گوشت ۔ شیرخوار بچہ ناموافق مگر دو تین عمر کے بچے اچھی طرح کر سکتے

تاہم اگر اس بات کی تحقیقات کریں کہ اس رائے کی بنیاد کیا ہے تو ہم کو معلوم ہو گا کہ اُس کی بنیاد بہت کم ہے یا بالکل نہیں ہے۔ یہ ایسا مسئلہ ہے جس کا بار بار اعادہ کیا گیا ہے اور جس کو بلا ثبوت تسلیم کر لیا گیا ہے اور اُس مسئلہ کے مثل ہے جو ہزار ہا سال تک اس امر پر زور دیتا رہا تھا کہ شیرخوار بچوں کے جسم پر پٹیاں باندھنی چاہئیں۔ شیرخوار بچہ کے معدہ کے لئے جس نے ابھی زیادہ عضلاتی قوت حاصل نہیں کی گوشت غالباً ناموافق غذا ہے کیونکہ گوشت کو قبل اس کے کہ مستحیل بہ کیموس ہو زیادہ پینے کی ضرورت ہے۔ مگر یہ اعتراض اُس گوشت پر وارد نہیں ہو سکتا۔ جس کے ریشے نکال لیے جائیں (اور صرف آب جوش استعمال کیا جائے) اور نہ اُس زمانہ سے متعلق ہو سکتا ہے جب کہ دو تین سال کے بعد بچہ میں خاصی عضلاتی قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ شہادت جو اس مسئلہ کی تائید میں پیش کی گئی ہے بہت چھوٹے بچوں کی بابت تو کسی قدر قوی ہے مگر بڑی عمر کے بچوں کی بابت قوی نہیں ہے۔ گو اُن کے ساتھ بھی عموماً اسی طرح سلوک کیا جاتا ہے تاہم اُن کی بابت خلاف شہادت کافی اور قطعی موجود ہے۔ سائنس کا فتویٰ عام رائے کے بالکل خلاف ہے۔ ہم نے یہ سوال دو سر برآوردہ طبیبوں اور چند نہایت ممتاز علم الاعضاء کے عالموں کے سامنے پیش کیا تھا اور وہ سب اس نتیجے پر یکساں متفق ہیں کہ بچوں کو بڑوں کی نسبت کم قوی خوراک نہیں بلکہ اگر ہو سکے تو زیادہ مقوی خوراک دینی چاہیئے۔

اس نتیجے کے وجوہ ظاہر ہیں اور اس کا مفہوم صاف - یہ معلوم کرنے کے لیے کہ لڑکے
کو بمقابلہ بڑے آدمی کے خوراک کی ضرورت نسبتاً زیادہ ہوتی ہے، صرف اس امر کی
ضرورت ہے کہ ایک بڑے آدمی اور ایک لڑکے کے جسمانی نشو و نما کا باہم مقابلہ
کیا جائے - وہ **مقاصد کیا ہیں** جن کے لیے انسان کو خوراک کی ضرورت ہے؟
اُس کا جسم ہر روز تھوڑا بہت گھٹتا رہتا ہے یعنی جسمانی محنت کی وجہ سے فرسودہ ہوجاتا
ہے نفس کے عملوں کی بدولت **نظام عصبی** بھی فرسودہ ہوجاتا ہے، زندگی کے فرائض
و افعال کے جاری رہنے سے امعاء فرسودہ ہوجاتی ہیں اور جو مادہ اس طرح ضائع
ہوتا ہے اُس کی کمی پوری کرنی ضرور ہے - **انتشار حرارت** کے ذریعے سے حرارت کی
ایک بڑی مقدار بھی جسم سے خارج ہوتی رہتی ہے - اور چونکہ افعال زندگی کے جاری
رکھنے کے لیے جسم کی حرارت کا قائم رکھنا ضروری ہے اس لیے اِس نقصان کا معاوضہ
اس طرح کرنا چاہیے کہ جسم میں ہمیشہ حرارت پیدا ہوتی رہے اور اسی لیے جسم کے
بعض اجزا پر ہمیشہ **آکسیڈیشن** کا عمل ہوتا رہتا ہے - پس دن بھر کے نقصانات کی تلافی
اور جس قدر حرارت دن بھر میں صرف ہوئی ہے اُس کے عوض **ایندھن** بہم پہنچانا صرف
یہی مقاصد ہیں جن کے لیے بالغوں کو خوراک کی ضرورت ہے - اب لڑکے کی حالت
پر غور کرو، اُس کے جسم کا مادہ بھی کام کرنے کی وجہ سے ضائع ہوتا رہتا ہے اور اس بات
کے سمجھنے کے لیے کہ لڑکا اپنے جثہ کی مناسبت سے غالباً اسی قدر مادہ ضائع
کرتا ہے جس قدر کہ بڑا آدمی، صرف اُس کے **چونچال پن** پر غور کرنے کی ضرورت ہے
**انتشار حرارت** کے ذریعے اُس کے جسم کی حرارت بھی زائل ہوتی رہتی ہے
اور چونکہ بچہ کا جسم بمقابلہ بڑے آدمی کے جثہ کے لحاظ سے زیادہ تر کھلا رہتا ہے
اور اسی لیے بچے کے جسم سے حرارت بھی نسبتاً زیادہ خارج ہوتی رہتی ہے لہٰذا بڑے
آدمی کو حرارت پیدا کرنے والی خوراک کی جس قدر ضرورت ہے بچہ کو اپنے جثہ کے

موافق اُس سے زیادہ خوراک کی ضرورت ہی۔ پس نشو ونما کے جو عمل بڑے آدمی کے جسم میں جاری رہتے ہیں اگر بچہ کو اُن عملوں کے سوا اور کسی عمل کی ضرورت نہ ہوتی تو بھی اُس کو اپنے جثہ کی مناسبت سے غذا کے کسی قدر زیادہ ذخیرہ کی ضرورت ہوتی۔ مگر بچہ کو جسم کی کمی پوری کرنے اور اُس کی حرارت قائم رکھنے کے علاوہ نمو کی غرض سے نیا مادہ پیدا کرنے کی بھی ضرورت ہی۔ جب جسم کے ذبول اور حرارت کے نقصان کی تلافی ہو جاتی ہی تو جو زائد غذا باقی رہتی ہی وہ جسم کے نمو میں کام آتی ہی اور باعدہ نمو اسی زائد غذا کی بدولت ممکن ہی۔ اور اُس کی عدم موجودگی میں جو نمو کبھی کبھی واقع ہوتا ہی اس سے بیّن اضمحلال پیدا ہوتا ہی جو ناقص بدل ما یتحلل کا نتیجہ ہی۔ سچ یہ ہی کہ ایک خاص قانون جر ثقیل کی وجہ سے جس کی تشریح یہاں ممکن نہیں ہی۔ چھوٹے جسم نامی کو بڑے جسم نامی پر اُسی نسبت سے فوقیت حاصل ہوتی ہی جو قائم رکھنے والی اور زائل کرنے والی قوتوں میں پائی جاتی ہی اور حقیقت میں یہ ایسی فوقیت ہی کہ نمو کا امکان ہی اس کی بدولت ہی مگر اس کے تسلیم کر لینے سے یہ بات اور بھی زیادہ واضح ہو جاتی ہی کہ اگرچہ ممکن ہی کہ جسم کی طاقت مخالف اثر کو برداشت کرلے اور بالکل ہی زائل نہ ہو جائے مگر چوں کہ طاقت میں کمی ضرور واقع ہوتی ہی اس لیے ہر ایک مخالف اثر قد و قامت یا جسمانی تکمیل کو ضرور نقصان پہنچائے گا۔ یہ بات کہ "نمو کرنے والے جسم کے لیے مادہ کی ضرورت کس قدر ناگزیر ہی" اس امر سے ثابت ہی کہ بچپن میں جب کہ لڑکا مدرسہ میں پڑھتا ہی اس کی بھوک نہایت تیز ہوتی ہی اور آئندہ زندگی میں شاذونادر ہی ایسی تیز بھوک لگتی ہی اور نیز اس امر سے کہ بچہ کو نسبتہً جلد بھوک لگ جاتی ہی اور اگر اس بات کی اور زیادہ شہادت درکار ہو کہ بچوں کو زیادہ خوراک کی ضرورت ہوتی ہی تو اس واقعہ سے حاصل ہوتی ہی کہ جہازوں کی تباہی اور دیگر مصائب کے بعد جو قحط واقع ہوتے ہیں اُن میں بچے سب سے پہلے مرتے ہیں۔

جب یہ بات مسلم ہو چکی اور مسلم ہونی چاہیئے کہ بچوں کو خوراک کی ضرورت نسبتہً زیادہ ہی تو اب یہ سوال باقی رہتا ہی کہ کیا ہم اس ضرورت کو اس طرح پورا کریں کہ بچوں کو بہت زیادہ مقدار اُس غذا کی دی جائے جس کو کم زور غذا کہتے ہیں یا مقوی غذا زیادہ معتدل مقدار میں دی جائے؟ گوشت کی ایک معین مقدار سے جس قدر غذائیت حاصل ہوتی ہی وہ اس سے زیادہ مقدار کی روٹی سے یا اس سے بھی زیادہ مقدار کے آلوؤں سے حاصل ہوتی ہی دیگر اغذیہ کو بھی اسی پر قیاس کرنا چاہیئے۔ کسی شے میں ہو جس قدر کم غذائیت اُس کی مقدار ضرورت کو پورا کرنے کے لیئے۔ اسی قدر زیادہ کرنی چاہیئے۔ اب کیا ہم نمو کرنے والے بچہ کی زائد ضرورتوں کا لحاظ رکھ کر اُس کو ایسی عمدہ خوراک کی کافی مقدار دیں جیسی کہ بڑوں کو دی جاتی ہی یا اس امر کا لحاظ نہ رکھ کر۔ کہ بچے کے معدہ کو اس عمدہ خوراک کی بھی نسبتہً زیادہ مقدار ہضم کرنی پڑتی ہی۔ ادنیٰ خوراک کی اور بھی زیادہ مقدار دے کر اُس کے معدہ پر اور بھی زیادہ بار ڈال دیں؟

آیا بچوں کو کم زور غذا کی زیادہ مقدار دی جائے یا مقوی غذا کی معتدل مقدار؟

اس سوال کا جواب کسی قدر صاف ہی۔ ہضم کی محنت میں جس قدر تخفیف ہوتی ہی اعضا کے نمو اور عمل کے لیے اسی قدر زیادہ قوت باقی رہتی ہی۔ معدہ اور امعاء کے فرائض اعصابی قوت اور خون کا زیادہ ذخیرہ بہم پہنچے بغیر پورے نہیں ہو سکتے۔ اور خوب پیٹ بھر کر کھانے کے بعد جو کسل نسبتہً زیادہ پیدا ہوتا ہی اُس سے ہر ایک شخص کو اس بات کا ثبوت ملتا ہی کہ اعصابی قوت اور خون کا ذخیرہ نظام جسمانی کے نقصان سے حاصل ہوتا ہی خوبصورت کسل ظاہر ہوتا ہی۔ اگر کم مقوی خوراک کی ایک کثیر مقدار سے مطلوبہ غذائیت حاصل ہو تو امعاء پر بہ نسبت اِس کے کہ مقوی خوراک کی معتدل مقدار سے اسی قدر غذائیت حاصل ہو زیادہ کام کا بار پڑ جاتا ہی اور امعاء پر زائد بار پڑنا بہت بڑا نقصان ہے۔

بچوں کو ایسی غذا دینی چاہیئے جو مقوی بھی ہو اور زود ہضم بھی

یہ نقصان بچوں میں قوت کی کمی یا نمو کی کمی یا دونوں سے ظاہر ہوتا ہی۔ پس یہ نتیجہ نکلا کہ بچوں کو ایسی خوراک ملنی چاہیے جو حتی الامکان مقوی بھی اور منہضم بھی بے شک یہ بات صحیح ہی کہ لڑکوں اور لڑکیوں کو خالص یا تقریباً خاص نباتی غذا سے پرورش کر سکتے ہیں۔ طبقہ اعلیٰ میں ایسے بچے پائے جاتے ہیں جن کو گوشت نسبتہً کم دیا جاتا ہی اور وہ پھر بھی بڑھتے ہیں اور صحیح وسالم معلوم ہوتے ہیں مزدوروں کے بچے شاذونادر ہی گوشت چکھتے ہوں گے پھر بھی صحیح بلوغ کو پہنچ جاتے ہیں۔ مگر ان میں جو بظاہر خلاف معلوم ہوتے ہیں، ہرگز وہ وزن نہیں ہی جو عموماً خیال کیا جاتا ہی۔ اول تو یہ بات لازم نہیں آتی کہ جو لوگ ابتدائی عمر میں روٹی اور آلو سے پرورش پاتے ہیں وہ آخر کار عمدہ نمو پائیں گے۔ اور انگلستان کے زراعتی مزدوروں اور امرا کی حالت کا یا فرانس کے طبقہ متوسط اور طبقہ ادنیٰ کی حالت کا باہم مقابلہ کرنا نباتات خوری کی تائید ہرگز نہیں کرتا۔ دوسرے نمو کا سوال جسم کی کمیت ہی سے متعلق نہیں بلکہ کیفیت سے بھی متعلق ہی۔ نرم پلپلا جسم دیکھنے میں ایسا ہی اچھا معلوم ہوتا ہی جیسا کہ سخت گٹھیلا جسم اگرچہ ممکن ہی کہ سرسری نظر سے دیکھنے والے کی نگاہ میں ایسا بچہ جس کے رگ دپٹے پلپل اور نرم ہوں اُس بچہ کے برابر معلوم ہو جس کے ریشے چست اور گٹھے ہوئے ہوں۔ مگر طاقت کی آزمائش سے فرق معلوم ہو جاتا ہی۔ جوان کا زیادہ موٹاپا اکثر کمزوری کی علامت ہی۔ جن لوگوں کی تعلیم و تربیت کی جاتی ہی اُن کا بدن گھٹ جاتا ہی۔ یہی وجہ ہی کہ ان ادنیٰ درجہ کی خوراک کھانے والے بچوں کی ظاہری صورت سے کچھ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا۔ تیسرے جثہ کے علاوہ ہم کو کام کرنے کی قوت کا بھی لحاظ رکھنا پڑتا ہی۔ گوشت خواروں کی اولاد اور آلو روٹی کھانے والوں کی اولاد میں اس اعتبار سے ایک نمایاں فرق ہی۔ دہقان کا لڑکا عقلی اور جسمانی دونوں طرح کی زندگی میں ایک شریف آدمی کے بیٹے سے بہت کم درجہ

غذائیت کے اعتبار سے گوشت اور نباتاتی خوراک کا باہم مقابلہ

کا ہوتا ہے۔

اگر ہم حیوانات کی مختلف قسموں کا یا آدمیوں کی مختلف نسلوں کا یا ایک ہی قسم کے حیوانوں اور انسانوں کا جب کہ اُن کو مختلف قسم کی خوراک دی جائے، باہم مقابلہ کریں تو ہم کو اس امر کا اور بھی زیادہ صاف ثبوت ملتا ہے کہ کام کرنے کی قوت کا درجہ خوراک کے مقوی ہونے پر یقیناً منحصر ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ گائے، جو گھاس جیسی کم زور خوراک پر گزارہ کرتی ہے، اُس کے لیے خوراک کی بہت زیادہ مقدار درکار ہے اور اُس کے ہضم کرنے کے لیے ایک وسیع معدہ کی ضرورت ہے اُس کے ہاتھ پاؤں، جو جسم کے مقابلہ میں چھوٹے ہوتے ہیں، بوجھ کے مارے دبے رہتے ہیں۔ اِس بھاری جسم کے اُٹھانے اور خوراک کی اِس کثیر مقدار کے ہضم کرنے میں بہت سی قوت صرف ہو جاتی اور تھوڑی باقی رہ جاتی ہے۔ اس لیے یہ جانور سُست ہوتا ہے۔ گائے سے گھوڑے کا مقابلہ کرو۔ اس جانور کی بناوٹ گائے سے تقریباً ملتی جلتی ہے، مگر وہ زیادہ مقوی خوراک کا عادی ہے اُس کا جسم اور خاص کر پیٹ سے پیچھے کا حصہ اُس کے ہاتھ پاؤں کے مقابلہ میں زیادہ بھاری نہیں ہے اور اس کے قویٰ پر اس قدر بھاری انتڑیوں وغیرہ کے اُٹھانے کا بار نہیں پڑتا اور نہ اس قدر کثیر المقدار خوراک ہضم کرنے کا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس میں زیادہ تر قوت محرکہ اور بہت کچھ چستی و چالاکی پائی جاتی ہے۔ پھر اگر ہم گھاس خور بھیڑ کی احمقانہ سُستی و کاہلی کا کتے کی چستی و چالاکی کے ساتھ مقابلہ کریں جو گوشت یا اناج پر یا دونوں چیزوں پر گزارہ کرتا ہے تو ہم کو ایسا ہی فرق نظر آئے گا جو بلحاظ نوعیت کے اُسی قسم کا ہے جو گائے اور گھوڑے میں پایا جاتا ہے مگر بلحاظ درجے کے اُس سے بھی زیادہ ہے۔ اور ہم چڑیا گھر کی سیر کر کے اس بات پر غور کریں کہ گوشت خور جانور کیسی بے چینی کے ساتھ اپنے پنجروں میں ٹہلتے

ہیں تو صرف اس بات کے یاد رکھنے کی ضرورت ہی کہ یہ زائد قوت نباتات خور جانوروں میں سے کسی جانور میں عادۃً نہیں پائی جاتی اور اس بات کے سمجھنے کی ضرورت ہی کہ خوراک کے مقوی ہونے اور چستی و چالاکی کے درجہ میں کس قدر صریح تعلق ہے۔

یہ تفاوت جیسا کہ بعض اشخاص حجت پیش کر سکتے ہیں، جسمانی ساخت کے اختلاف کا براہ راست نتیجہ نہیں بلکہ اُس خوراک کے اختلاف کا نتیجہ ہی جس پر گزارہ کرنے کے لیئے ان حیوانات کا جسم بنایا گیا ہی اور اس کا ثبوت یہ ہی کہ یہی اختلاف ایک ہی نوع کی مختلف صنفوں میں دیکھا جاتا ہی۔ گھوڑے کی مختلف قسموں سے اس امر کی توضیح ہوتی ہی۔ بڑے پیٹ والے، سُست اور مریل اکے کے گھوڑے کا مقابلہ شکار یا گھوڑ دوڑ کے گھوڑے کے ساتھ کرو جس کے پٹھے چھوٹے چھوٹے اور مضبوط ہوتے ہیں اور پھر اس بات کو یاد کرو کہ ایک کی خوراک دوسرے کی خوراک کے مقابلہ میں کس قدر کم مقوی ہوتی ہی۔ یا نوع انسانی کی مثال لو۔ اہل آسٹریلیا جنوبی افریقہ کی خانہ بدوش قومیں اور ان کے علاوہ نہایت ادنیٰ درجہ کے وہ وحشی لوگ، جو جڑوں اور جنگلی پھلوں پر گزارہ کرتے اور کبھی کبھی چھوٹے چھوٹے کیڑے اور اسی قسم کی ادنیٰ خوراک کھا لیتے ہیں، نسبتہً پستہ قد ہوتے ہیں۔ اُن کے پیٹ بڑے بڑے، عضلات نرم اور غیر نمو یافتہ ہوتے ہیں اور وہ کشتی یا مسلسل محنت میں اہل یورپ سے بالکل لگا نہیں کھا سکتے۔ اب اُن وحشی قوموں کو شمار کرو جو پورے قد والی مضبوط اور چست و چالاک ہیں۔ جیسے کافر[۵۱] شمالی امریکہ کے وحشی باشندے اور اہل پٹیاگونیا[۵۲]۔ تم کو معلوم ہوگا کہ وہ بڑے گوشت خوار ہیں۔ ادنیٰ خوراک کھانے والا

۵۱۔ اعظم افریقہ کی اُس وحشی قوم کو جو ملک حبش اور کیپ کالونی کے درمیان رہتی ہی۔ کافر خاص کافریا کے باشندوں کو کہتے ہیں۔ مترجم

۵۲۔ پٹیاگونیا۔ قدیم نام اس ملک کا ہی جو جنوبی امریکہ کا جنوبی سرا ہی۔ مترجم

قدر قد و قامت اور ڈیل ڈول حاصل ہو جائے جس قدر کہ مقوی خوراک سے حاصل ہوتا ہی تو بھی غیر مقوی خوراک سے جو مادہ پیدا ہوتا ہی وہ باعتبار کیفیت کے بہت ادنی درجہ کا ہوتا ہی؟ کیا وہ اس خیال کو مستحکم نہیں کرتیں کہ اگر قوت اور نیز نمو کو قایم و برقرار رکھنا ہو تو یہ بات صرف اعلیٰ درجہ کی خوراک دینے سے حاصل ہو سکتی ہی؟ کیا وہ اس یقینی نتیجہ کی تصدیق نہیں کرتیں کہ "جس بچے سے جسمانی یا عقلی کام لینے کی کچھ ایسی ضرورت نہیں ہوتی وہ اُس خوراک سے، جس میں آٹے کے اجزا شامل ہوں، خاصی اچھی طرح نشو و نما حاصل کر سکتا ہی مگر جس بچہ کو ہر روز نہ صرف نئے مادہ کی واجبی مقدار مہیا کرنی بلکہ اُس نقصان کی تلافی کرنی پڑتی ہی جو عقلات سے زیادہ کام لینے کا نتیجہ ہی اور اُس مزید نقصان کی بھی جو دماغ کی سخت ورزش کا نتیجہ ہی، اُس کو ایسی خوراک کا استعمال کرنا ضروری ہی جس میں مقوی مادہ کی زیادہ مقدار شامل ہو"؟ اور کیا یہ صریح نتیجہ نہیں ہی کہ بہتر خوراک نہ دینے سے یا تو نمو یا جسم کی مستعدی میں یا نفس کی مستعدی میں، جیسے کہ جسمانی ساخت اور حالات مقتضی ہوں، ضرور فتور واقع ہو گا؟ ہم کو یقین ہی کہ جو شخص منطقیانہ عقل رکھتا ہو وہ اس بات پر اعتراض نہ کرے گا۔ اس کے خلاف رائے رکھنا گویا اُن لوگوں کے پرانے مغالطہ کو در پردہ تسلیم کرنا ہی جو بے قوت کی کل ایجاد کرنے کے طالب ہیں یعنی یہ بات مان لینا ہی کہ لاشئے سے قوت حاصل کرنی ممکن ہی۔

خوراک کی بحث ختم کرنے سے پہلے چند الفاظ خوراک کی ایک اور ضروری شرط یعنی اُس کے تنوع کی بابت ضرور کہنی چاہیے۔ اس اعتبار سے بچوں کے خورد و نوش کا انتظام بہت ناقص ہی۔ اگرچہ ہمارے بچوں کو ہمارے سپاہیوں کی طرح "بیس سال تک اُبلا ہوا گوشت" کھانے کی سزا تو نہیں دی جاتی تو بھی اُن کو بسا اوقات یکساں خوراک کی تکلیف اٹھانی پڑتی ہی۔ اور اگرچہ اُس خوراک کی مداومت

نہ تو اس قدر سخت ہوتی ہے اور نہ اس قدر دیرپا تاہم اُن کی خوراک بھی سپاہیوں کی خوراک کی طرح صراحتہً قوانین صحت کے برخلاف ہے۔ یہ سچ ہے کہ دن کے کھانے میں بچوں کو ایسی خوراک دی جاتی ہے جس میں کم و بیش کئی چیزیں شامل ہوتی ہیں مگر ناشتہ میں ہفتہ بہفتہ ماہ بماہ اور سال بسال وہی دودھ روٹی دی جاتی ہے یا شاید آش جو ملتا ہو اور شام کو اسی قسم کی مداومت کے ساتھ دودھ اور دودھ روٹی یا چائے اور "مکھن روٹی" دی جاتی ہے۔

یہ دستور علم الاعضا کے احکام کے خلاف ہے۔ ایک ہی کھانا بار بار کھانے سے جو نفرت پیدا ہو جاتی ہے اور جو کھانا بہت دنوں سے نہ کھایا ہو اُس سے جو لطف حاصل ہوتا ہے یہ دونوں باتیں، جیسا کہ لوگ بے پروائی سے فرض کر لیتے ہیں، بے معنی نہیں ہیں بلکہ طرح طرح کی صحت بخش خوراک کے لیے محرک ہیں۔ بے شمار تجربوں سے ثابت ہو گیا ہے کہ شاید کوئی ایک خوراک خواہ کیسی ہی عمدہ ہو ایسی نہیں جس میں ایسے تمام اجزا مناسب مقدار یا صحیح شکل میں موجود ہوں جو جسمانی نشو و نما کو باقاعدہ جاری رکھنے کے لیے مطلوب ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ خوراک کے تمام اجزا کی مقدار کا موازنہ قائم رکھنے کے لیے خوراک کو اکثر تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور حقیقت جو علم الاعضا کے عالموں کو معلوم ہے یہ ہے کہ زیادہ مرغوب غذا سے جو لطف حاصل ہوتا ہے اس سے اعصاب کو تحریک ہوتی ہے اور قلب کا فعل زیادہ ہوتا ہے۔ اور دوران خون، جو زیادہ قوت کے ساتھ ہوتا ہے آیندہ ہضم میں مدد دیتا ہے۔ اور یہ حقایق آج کل مویشیوں کو خوراک دینے کے اصول کے مطابق ہیں جو اس بات کی ہدایت کرتے ہیں کہ خوراک ادل بدل کر دینی چاہیئے۔

مگر نہ صرف وقتاً فوقتاً خوراک کی تبدیلی کی بڑی ضرورت ہے بلکہ ان ہی کھانوں میں

سے اس بات کی بھی بڑی ضرورت ہی کہ ہر ایک کھانے پر کئی طرح کی چیزیں استعمال کی جائیں۔ اجزاے خوراک کا بہتر توازن اور عصبی تحریک کی زیادتی یہ دونوں فائدے پہلے کی طرح یہاں بھی حاصل ہوتے ہیں۔ اگر اس کے ثبوت میں واقعات مطلوب ہوں تو ہم ایک یہ واقعہ بیان کر سکتے ہیں کہ اہل فرانس کے کھانے کو، جو مقدار میں بہت زیادہ ہوتا ہی۔ مگر اُس میں نہایت مختلف قسم کی چیزیں ہوتی ہیں، معدہ نسبتہً آسانی کے ساتھ ہضم کر سکتا ہی۔ شاید کسی کو اس پر اعتراض نہ ہوگا کہ ایک ہی قسم کا اتنا بہت سا کھانا خواہ کیسا ہی عمدہ پکا ہوا ہو ایسی آسانی سے ہضم نہیں ہو سکتا۔ اور اگر کوئی شخص مزید واقعات کا خواہش مند ہو تو وہ "انتظام حیوانات" کے متعلق زمانہ حال کی ہر ایک کتاب میں مل سکتے ہیں۔ جب حیوانات کو ہر کھانے پر کئی چیزیں دی جاتی ہیں تو وہ خوب موٹے تازے ہو جاتے ہیں۔ گھاس اور سٹارک کے تجربوں سے اس بات کا نہایت قطعی ثبوت ملتا ہی کہ ایک ایسا مرکب پیدا کرنے کی غرض سے جو معدہ کے فعل کے لیے سب سے زیادہ مناسب ہو مختلف چیزوں کی آمیزش مفید بلکہ ضروری ہی"۔[۵۱]

اس اعتراض کا جواب کہ بچوں کو اول بدل کر خوراک دینا یا ایک وقت میں کئی طرح کی چیزیں دینا تکلیف مالایطاق ہی

اگر کوئی شخص یہ اعتراض کرے، جیسا کہ غالباً بہت سے اشخاص کریں گے، کہ "بچوں کو اول بدل کر خوراک دینا اور ایسی خوراک دینا جس میں ہر ایک کھانے پر کئی طرح کی چیزیں بھی ہوں ایک تکلیف مالایطاق ہوگی" تو ہم یہ جواب دیں گے کہ جو تکلیف بچوں کے عقلی نشو و نما میں مد و معاون ہو وہ "تکلیف مالایطاق" نہیں سمجھی جا سکتی اور یہ کہ بچوں کی آیندہ بہبودی کے خیال سے عمدہ جسمانی نشو و نما کی وقعت اس سے بڑھ کر ہی۔ علاوہ بریں یہ بات افسوسناک اور عجیب بھی معلوم ہوتی ہی کہ سوروں کے موٹا تازہ بنانے میں جو تکلیف خوشی خوشی گوارا کی جاتی ہی بچوں کی پرورش میں اُس کو

۵۱ دیکھو "علم تشریح الابدان اور علم الاعضار کی قاموس"

خوراک کی بابت چند اور ہدایتیں

تکلیف ما لایطاق سمجھا جائے۔

جو لوگ خوراک کے اس دستور العمل کو جو ہم نے بتایا ہے اختیار کرنا چاہیں اُن کی تنبیہ کی غرض سے چند اور جملے اضافہ کرنے ضروری ہیں۔ یہ تبدیلی یکایک نہیں ہونی چاہیئے کیوں کہ متواتر ادنیٰ درجہ کی خوراک کھاتے کھاتے جسمانی نظام ایسا ضعیف ہو جاتا ہے کہ وہ اعلیٰ درجہ کی خوراک کو فوراً ہضم نہیں کرسکتا۔ کم مقوی خوراک بذات خود سوء ہضمی کا باعث ہے اور یہ بات حیوانات کی بابت بھی صحیح ہے "جب ملائی اُترا ہوا دودھ یا لسّی یا کوئی اور ادنیٰ درجہ کی خوراک بچھڑوں کو دی جاتی ہے تو بدہضمی ہو جانے کا احتمال ہوتا ہے[۵۱]"۔ پس اسی وجہ سے جہاں قوت کم ہوتی ہے وہاں ضروری ہے کہ اعلیٰ درجہ کی خوراک کی طرف بہ تدریج تبدیلی کی جائے یعنی جس قدر قوت بڑھتی جائے اُسی کے موافق مقوی خوراک کا نیا اضافہ ٹھیک ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ مقوی خوراک حد اعتدال سے نہ بڑھنے پائے۔ مناسب خوراک کی ایک شرط یہ ہے کہ اُس کی اتنی ہی مقدار دی جائے جو پیٹ بھرنے کے لیئے کافی ہو۔ اور یہ شرط اُس خوراک کے دینے کی ممانعت کرتی ہے جس میں وہ مادے موجود نہ ہوں جن سے مناسب خوراک مہیا ہوتی ہے۔ اگرچہ عمدہ خوراک کھانے والی شائستہ قوموں میں آلات ہضم کا حجم بُری خوراک کھانے والی وحشی قوموں کے مقابلہ میں کم ہوتا ہے اور ممکن ہے کہ اُن کا حجم آخرکار اور بھی کم ہو جائے تاہم بالفعل خوراک کی مقدار کا تصفیہ معدہ کی موجودہ گنجائش کے لحاظ سے ہونا چاہیئے۔ اب ہم خوراک کی دونوں صفتوں کا مناسب لحاظ رکھ کر یہ نتیجے نکالتے ہیں:—

اوّل بچوں کی خوراک اعلیٰ درجہ کی مقوی ہونی چاہیئے۔

---

[۵۱] دیکھو "فن زراعت کی قاموس" مصنفہ مارٹن

دوم ہر ایک کھانے اور اُس کے بعد کے کھانوں پر مختلف قسم کی خوراک ہونی چاہیئے۔

سوم خوراک بہت کافی ہونی چاہیئے۔

خوراک کی طرح بچوں کے لباس میں بھی کمی کی جاتی ہے جسمانی احساسات ہمارے رہبر ہیں نہ کہ گمراہ کرنے والے

خوراک کی طرح لباس میں بھی عام میلان کمی کی طرف ہے، یہاں بھی رہبانیت اپنا جلوہ دکھاتی ہے، ایک عام خیال جو مبہم طور پر لوگوں کے دلوں میں موجود ہے، اگرچہ اُس کو قطعی و یقینی اصول کی شکل میں نہیں رکھا گیا یہ ہے کہ "احساسات کا کچھ خیال نہیں کرنا چاہیئے"۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کا عام اعتقاد غالباً یہ ہے کہ "احساسات ہماری ہدایت کے لیے نہیں ہیں بلکہ ہم کو گمراہ کرنے کے لیئے ہیں"۔ یہ سخت غلطی ہے، کیونکہ ہمارے جسم کی ساخت ایسی ہے جس سے قدرت کی بہت زیادہ مہربانی ثابت ہوتی ہے، بلکہ اُن کی نافرمانی ہمیشہ جسمانی خرابیوں کا باعث ہوتی ہے۔ بھوک میں نہیں بلکہ بے بھوک کھانا کھانا بُرا ہے پیاس میں نہیں بلکہ پیاس کی تسکین کے بعد پانی پینا بُرا ہے اُس تازی ہوا میں سانس لینے سے جس کا لطف ہر تندرست آدمی اُٹھاتا ہے نقصان نہیں ہوتا بلکہ باوجود پھیپھڑوں کی منافرت کے غلیظ ہوا میں سانس لینے سے نقصان ہوتا ہے، اُس مستعدانہ ورزش سے جس کی ترغیب قدرت زور کے ساتھ دیتی ہے نقصان نہیں ہوتا جیسا کہ ہر ایک بچہ کی ورزش سے ثابت ہے بلکہ قدرت کی تحریکوں کا متواتر لحاظ رکھنے سے نقصان ہوتا ہے، وہ دماغی کام جس کو دل خود بخود چاہے اور جس سے حظ حاصل ہو، نقصان کا باعث نہیں ہوتا بلکہ نقصان اس کام سے ہوتا ہے جس کو اُس وقت بھی نہیں چھوڑا جاتا جب کہ سر کو گرمی چڑھ جانا یا سر میں درد ہو جانا اُس سے باز رہنے کا حکم دیتا ہے۔ وہ جسمانی محنت جو خوش گوار ہو یا نہ خوش گوار ہو اور نہ گوار اُس سے نقصان نہیں ہوتا بلکہ وہ محنت نقصان پہنچاتی ہے جو اُس وقت بھی جاری رہے جب کہ تکان اُس کی ممانعت کرتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ جن لوگوں نے مدت تک بیماری میں زندگی

بسر کی ہو اُن کے احساسات قابل اعتبار رہ نہیں ہوتے۔ جو لوگ برسوں تقریباً ہمیشہ ہی گھر کی چار دیواری میں مقید رہے ہیں جنھوں نے اپنے دماغ سے بہت زیادہ کام لیا ہو اور اپنے جسموں سے شاید بالکل ہی نہیں لیا جنھوں نے کھانا کھانے میں صلاح بغیر اپنے گھنٹے گھڑی کی پیروی کی ہو، اغلب ہو کہ ایسے لوگ اپنے فاسد احساسات کی وجہ سے گمراہ ہو جائیں مگر اُن کی یہ ابتر حالت ہی احساسات کی خلاف ورزی کا نتیجہ ہو۔ اگر وہ بچپن سے اُس احساس کی، جس کو ہم "جسمانی قوت ممیزہ" کے نام سے موسوم کرتے ہیں، نافرمانی نہ کرتے تو یہ قوت پژمردہ نہ ہوتی بلکہ ایک وفادار ناصح بنی رہتی۔

من جملہ ان احساسات کے جو ہماری ہدایت کا کام کر دیتے ہیں گرمی اور سردی کا احساس ہو۔ اور اگر بچوں کے لباس میں ان دونوں باتوں کا احتیاط کے ساتھ لحاظ نہ رکھا جائے تو ایسے لباس کو ناقص سمجھنا چاہیئے۔ یہ عام خیال کہ بچوں کو "جفاکش بنانا" چاہیئے سخت دھوکا ہو بہت سے بچے تو جفاکش بنتے بنتے ہی دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں اور جو بچ جاتے ہیں اُن کے نمو یا جسمانی ساخت کو دائمی نقصان پہنچتا ہو۔ ڈاکٹر کوم کہتے ہیں کہ "بچوں کی صورت شکل کی نزاکت اُس نقصان کی کافی علامت ہو جو اس وجہ سے پیدا ہوتا ہو اور اُن پر بیماری کے متواتر حملوں کا ہونا بے فکر والدین کے لیے ایک تنبیہ کا کام دے سکتے ہیں"۔ وہ دلیل جس پر اس "جفاکش بنانے" کے خیال کی بنیاد ہو نہایت ہی سطحی ہو۔ دولت مند والدین یہ دیکھکر کہ دہقانوں کے چھوٹے چھوٹے لڑکے اور لڑکیاں کھلی ہوا میں کھیلتی پھرتی ہیں جب کہ اُن کا بدن صرف آدھا ڈھکا ہوا ہوتا ہو اور مزدوروں کی عام صحت کو اس واقعے کے ساتھ شامل کر کے یہ غلط نتیجہ نکال لیتے ہیں کہ صحت بدن کے کھلے رہنے کا نتیجہ ہو۔ اور یہ طے کر لیتے ہیں کہ اپنے بچوں کو بھی تھوڑے کپڑے پہنائیں گے۔

بچوں کے لباس میں گرمی اور سردی کے احساس کا رکھنا لازم ہے "جفاکش" بنانے کا خیال سے کپڑے پہنانا محض

یہ بات فراموش کردی جاتی ہے کہ بچوں کی حالت، جو دیہات کے سبزہ زاروں میں کھیلتے پھرتے ہیں، اکثر اعتبارات سے مساعد ہوتی ہے یعنی اُن کی عمر قریب قریب ہمیشہ کھیل ہی میں صرف ہوتی ہے، وہ دن بھر تازہ ہوا میں سانس لیتے ہیں اور بہت زیادہ دماغی محنت سے اُن کے جسم میں خلل واقع نہیں ہوتا۔ اُن کی عمدہ صحت اُن کے ناکافی لباس کی وجہ سے نہیں بلکہ باوجود ناکافی لباس کے بھی قائم رہ سکتی ہے۔ گویا یہ بات کیسی ہی خلاف معلوم ہو ہم کو یقین ہے کہ یہ دوسرا نتیجہ صحیح ہے اور یہ کہ حرارت غریزی کا زوال، جس میں وہ مبتلا ہوتے ہیں، یقیناً نقصان پہنچاتا ہے۔

سردی میں بدن کے کھلے رہنے سے نمو کو ضرور نقصان پہنچتا ہے

اس کی وجہ یہ ہے کہ جب جسمانی نظام اس قدر صحیح وسالم ہو کہ جس سے کھلے رہنے کی برداشت کر سکے تو جسم سختی کی برداشت تو کر لیتا ہے مگر نمو کو نقصان پہنچتا ہے۔ یہ حقیقت حیوان اور انسان دونوں میں یکساں نظر آتی ہے۔ شٹ لینڈ[1] کے ٹٹو جنوبی انگلستان کے گھوڑوں کی نسبت زیادہ سختی کی برداشت کر لیتے ہیں مگر اُن کا قد چھوٹا رہ جاتا ہے۔ پہاڑی بھیڑیں اور مویشی جو زیادہ سرد آب و ہوا میں رہتے ہیں انگلستان کی بھیڑوں اور مویشی کے مقابلہ میں قد میں چھوٹے ہوتے ہیں۔ قطبی ممالک میں نسل انسان اپنے معمولی قد سے بہت چھوٹی ہوتی ہے لیپ لینڈ[2] اور گرین لینڈ[3] کے باشندے بہت بونے ہوتے ہیں، اور ٹیرا ڈل فیوگو[4] کے باشندے جو سرد ملک میں ننگے پھرتے ہیں ان کی بابت ڈارون نے بیان کیا ہے کہ وہ اس قدر پست قد اور ڈراؤنی شکل

[1] شٹ لینڈ۔ ایک مجمع الجزائر ہے جو سکاٹ لینڈ کے شمال کی طرف واقع ہے۔ مترجم

[2] لیپ لینڈ ایک ملک ہے جو فرنگستانی روس اور خلیج باتھنیا کے شمال کی طرف واقع ہے مترجم

[3] گرین لینڈ۔ ایک جزیرہ ہے جو یورپ کے گوشۂ شمالی مغرب میں واقع ہے۔ مترجم

[4] ٹیرا ڈل فیوگو۔ ایک جزیرہ ہے جو جنوبی امریکہ کے جنوب کی طرف واقع ہے مترجم

کے ہوتے ہیں کہ "مشکل سے کوئی شخص باور کر سکتا ہے کہ وہ اُس کے ہم جنس ہیں"۔

بیان مذکورہ بالا کی تشریح علمی حیثیت سے

یہ بونا پن جو حرارت کے زیادہ خارج ہو جانے سے پیدا ہوتا ہے۔ سائنس اس کی تشریح کرتی ہے اور یہ ثابت کرتی ہے کہ یہ نتیجہ لامحالہ پیدا ہوتا ہے بشرطیکہ خوراک اور دیگر امور مساوی ہوں کیوں کہ جیسا پہلے بیان ہو چکا ہے جس حرارت کے زوال سے ہمیشہ بدن میں برودت پیدا ہوتی رہتی ہے اُس کی تلافی کے لیے یہ امر ضروری ہے کہ بعض مادوں پر جو خوراک کا جز ہیں آکسیڈیشن کا عمل برابر جاری رہے اور جس قدر زیادہ حرارت جسم سے خارج ہو ضروری ہے کہ ان مادوں کی مقدار بھی جو آکسیڈیشن کے لیے درکار ہیں اُسی قدر زیادہ ہو۔ مگر آلات ہضم کی قوت محدود ہے، اسی وجہ سے جب اُن کو اُس مادہ کی، جو قیام حرارت کے لیے درکار ہے، ایک بڑی مقدار تیار کرنی پڑتی ہے تو وہ اُس مادہ کی، جو جسم کے بنانے میں کارآمد ہوتا ہے، صرف تھوڑی سی مقدار تیار کر سکتے ہیں۔ جب بہت زیادہ مادہ ایندھن ہی میں صرف ہو جاتا ہے تو دوسرے کاموں کے لیے کم رہ جاتا ہے۔ پس اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یا تو قد چھوٹا ہو جاتا ہے یا جسمانی ساخت ادنیٰ درجہ کی رہ جاتی ہے یا دونوں نقص پیدا ہو جاتے ہیں۔

جسم کی حرارت پہنچانے کے اعتبار سے لباس خوراک کی ایک خاص مقدار کا کام دیتا ہے

اسی وجہ سے لباس نہایت مہتم بالشان چیز ہے۔ مسٹر لبیک کہتے ہیں کہ "ہمارا لباس جسمانی حرارت کے لحاظ سے خوراک کی ایک مقررہ مقدار کے مساوی ہے"۔ چوں کہ لباس کے سبب جسم کی حرارت کم خارج ہوتی ہے اس لیے حرارت قایم رکھنے کے لیے جو ایندھن مطلوب ہے اُس کی مقدار میں تخفیف ہو جاتی ہے اور جب معدہ کو ایندھن بہم پہنچانے میں کم کام کرنا پڑتا ہے تو وہ دوسرے مادے بہم پہنچانے میں زیادہ کام دے سکتا ہے۔ اس نتیجہ کی تصدیق اُن لوگوں کے تجربہ سے ہوتی ہے جو حیوانات کا انتظام کرتے ہیں۔ حیوانات چربی یا عضلات یا نمو کا نقصان

اُٹھائے بغیر سردی کی برداشت نہیں کر سکتے۔" اگر موٹے تازے مویشیوں کو ایسی جگہہ
رکھا جائے جہاں حرارت کم ہو تو یا تو اُن کے نمو میں فتور آجاتا ہی۔ یا اُن کی خوراک کا بہت
زیادہ خرچ اُٹھانا پڑتا ہی[۵۱]" مسٹر اسپنسر اس بات پر نہایت زور دیتے ہیں کہ شکاری
گھوڑوں کو اچھی حالت میں رکھنے کے لیے ضرور ہی کہ اصطبل کو گرم رکھا جائے۔ جو لوگ
گھوڑ دوڑ کے گھوڑے پالتے ہیں ان کا یہ ایک مسلمہ اصول ہی کہ ایسے گھوڑوں کو سردی
سے بچانا چاہیئے۔

بچوں کے جسم کا گرم رکھنا اور بھی زیادہ ضروری ہی اور اس امر کی تشریح مشاہدوں کے ذریعے سے

یہ علمی حقیقت جس کی توضیح علم نسل انسان کے ذریعے سے ہو چکی ہی، اور جس کو کاشتکار
اور شکاری تسلیم کرتے ہیں بچوں پر بدرجہ اولیٰ صادق آتی ہی بچوں کو اپنی چھٹائی اور عسرت
کی مناسبت سے سردی سے زیادہ نقصان پہنچتا ہی۔ فرانس میں نوزائیدہ بچے
سردی میں اکثر اس وجہ سے مرتے ہیں کہ رجسٹر پیدائش میں درج رجسٹرار کرانے
کے لیے ان کو میئر[۵۲] کے دفتر میں لے جاتے ہیں۔ مسٹر کوئٹ لیٹ نے بیان کیا ہی
کہ "بلجیم میں اگر جولائی میں ایک شیرخوار بچہ مرتا ہی تو اُس کے مقابلہ میں جنوری میں دو
مرتے ہیں۔" اور روس میں شیرخوار بچوں کی موت کسی قدر زیادہ بڑھتی ہوئی ہی۔
جس جسم نے کما حقہ نشو و نما پایا ہو وہ بلوغ کے قریب پہنچ کر بھی نسبتہً سردی کھانے کی
برداشت نہیں کر سکتا۔ تمثیلاً اس بات پر غور کرو کہ سخت معرکہ میں نوجوان سپاہی
بہت جلد مغلوب ہوتے ہیں۔ اس کی دلیل صاف ظاہر ہی۔ ہم اوپر بیان کر چکے
ہیں کہ سطح اور جثہ کے تغیر پذیر تعلق کی وجہ سے بمقابلہ بالغ آدمی کے بچہ کے
جسم سے حرارت کی مقدار نسبتہً زیادہ خارج ہوتی ہی اور یہاں ہم کو یہ بتانا ضرور ہی
کہ اس وجہ سے جو نقصان بچہ کو پہنچتا ہی وہ بہت زیادہ ہوتا ہی۔ مسٹر لے مان کہتے ہیں

[۵۱] دیکھو مارٹن صاحب کی کتاب موسوم بہ "قاموس زراعت"۔ مترجم

[۵۲] شہر کے بڑے مجسٹریٹ یا میونسپل کمیٹی کے بڑے افسر کو میئر کہتے ہیں مترجم

کہ "کاربانک ایسڈ کی جس قدر مقدار بچوں یا چھوٹے جانوروں کے جسم سے خارج ہوتی رہتی ہی اگر اُس کا اندازہ بڑے آدمی کے ایک ایسے مفروضہ جسم کے ساتھ کیا جائے جو بچہ کے جسم کا ہم وزن ہو تو یہ نتیجہ نکلتا ہی کہ بچے بہ نسبت بڑوں کے دوچند کاربانک ایسڈ پیدا کرتے ہیں"۔ اب غور کرو کہ کاربانک ایسڈ کی جس قدر مقدار خارج ہوتی ہی اگر ذرا صحت کے ساتھ اندازہ کیا جائے تو وہ مقدار پیدا شدہ حرارت کی مقدار کے لحاظ سے کم یا زیادہ ہوتی ہی۔ پس ہم دیکھتے ہیں کہ بچوں کے جسم کو اُس وقت بھی، جب کہ حالات مساعد ہوں حرارت پیدا کرنے کے لیے مادہ کی تقریباً دوچند مقدار بہم پہنچانی پڑتی ہی۔

بچوں کو ناکافی لباس پہنانا سخت حماقت ہی

پس بچوں کو کم لباس پہنانا سخت حماقت ہی۔ بھلا کون ایسا باپ ہوگا (گو اُس نے کماحقہ نشو و نما حاصل کیا ہو) جس کے جسم سے حرارت کی مقدار نسبتہً دیر میں خارج ہوتی ہی، جس کے جسم کو روزمرہ بدل مایتحلل کے سوا اور کسی چیز کی ضرورت نہیں، ہاں ہم پوچھتے ہیں کہ کون ایسا باپ ہی جو برہنہ ٹانگوں برہنہ بازوؤں اور برہنہ گردن کے ساتھ ادھر اُدھر پھرنا مفید خیال کرے گا؟ تاہم یہ بار، جس سے وہ خود جھجکتا ہی، اپنے چھوٹے بچوں کے جسم پر ڈالتا ہی جو اس کے برداشت کرنے کی بہت ہی کم قابلیت رکھتے ہیں! یا اگر خود اس بار کو نہیں ڈالتا تو بلا اعتراض دوسروں کے ہاتھوں اُن پر اس بار کو پڑتے دیکھتا ہی۔ اُس کو یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ ایک ایک ونس غذا، جو قیام حرارت کے لیے بلا ضرورت صرف ہوجاتی ہی، اس غذا سے منہا ہوجاتی ہی جس سے جسم بنتا ہی اور یہ کہ اگر بچے زکام انجماد خون یا دیگر امراض سے جو اس وجہ سے پیدا ہوتے ہیں، بچ گئے تو بھی نمو کی کمی یا جسمانی ساخت کا نقصان لازمی نتیجہ ہی۔

"پس قاعدہ یہ ہی کہ تمام حالتوں میں یکساں لباس نہیں پہنانا چاہیئے بلکہ

ایسا پہننا چاہیے جو ہر شخص کی حالت کے مناسب ہو اور نوعیت مقدار میں جسم کو سردی کے ایک دیرپا احساس سے، خواہ وہ کیسا ہی خفیف ہو پوری طرح محفوظ رکھے"۔ یہ قاعدہ جس کی عظمت کو ڈاکٹر کوم نمایاں الفاظ میں لکھ کر ظاہر کرتے ہیں ایسا قاعدہ ہے جس پر عالمان سائنس اور اطبا کا اتفاق ہے۔ ہم کو کوئی شخص، جو اس معاملہ پر رائے قایم کرنے کی قابلیت رکھتا ہو، ایسا نہیں ملا جس نے بچوں کے اعضا کا کھلا رہنا سخت قابل الزام نہ ٹھیرایا ہو۔ اگر سب سے بڑھ کر کوئی امر ایسا ہے جس میں "مضر دستور" کو ترک کرنا چاہیے تو یہی دستور ہے۔

مائیں اپنے بچوں کو اہل فرانس کی تقلید میں ناکافی لباس پہناتی ہیں جو ناکافی نامناسب اور نہایت مضر ہوتا ہے

فی الحقیقت یہ بات قابل افسوس ہے کہ ماؤں کو اس نامعقول دستور کی پیروی میں اپنے بچوں کے جسمانی نظام کو سخت نقصان پہنچاتے دیکھا جاتا ہے۔ یہ بہت بری بات ہے کہ وہ ہر ایک حماقت کی پیروی کریں جس کو اُن کے فرانسیسی ہمسائے رواج دینا پسند کرتے ہیں۔ مگر یہ بات نہایت وحشت انگیز ہے کہ والدین بلالحاظ اس امر کے کہ بچوں کا لباس ناکافی اور نامناسب ہے اُن کو شیخی اور نمود کا وہ لباس پہناتے ہیں جو "خواتین کے ایک اخبار میں جس میں نئے نئے فیشن کے لباس کی تصویریں ہوتی ہیں" بتایا جاتا ہے۔ اس سے بچوں کو کم و بیش زیادہ تکلیف ہوتی ہے۔ اکثر بیماریاں اُن کے پیچھے لگ جاتی ہیں، نمو رک جاتا ہے یا جسمانی طاقت زائل ہو جاتی ہے اور عموماً قبل از وقت موت آجاتی ہے اور یہ تمام مصیبتیں اس وجہ سے اُٹھانی پڑتی ہیں کہ یہ بات ضروری سمجھی گئی ہے جس کی ہدایت اہل فرانس کی تلون مزاجی کرتی ہے۔ صرف اتنی ہی بات نہیں کہ مائیں اہل فرانس کی ریس سے اپنے چھوٹے بچوں کو اس طرح ناکافی لباس کے ذریعہ سے سزا اور تکلیف دیتی ہیں بلکہ تقلید میں آکر وضع کا لباس تجویز کرتی ہیں جو صحت بخش کھیل کود کو روکتا ہے لباس کی خوشنمائی کے لیے ایسا رنگ اور ایسی بناوٹ پسند کی جاتی

ہی جو آزادانہ کھیل کود کی سخت رگڑوں کو برداشت نہیں کر سکتی اور پھر آزادانہ کھیل کود کی ممانعت اس وجہ سے کی جاتی ہی کہ کپڑے خراب نہ ہوں۔ ایک بچہ جو زمین پر ادھر اُدھر رینگ رہا ہی اُس کو حکم دیا جاتا ہی کہ "فوراً کھڑے ہو جاؤ تمھارا صاف ستھرا کوٹ میلا ہو جائے گا" چند بچے اُستانی کی نگرانی میں ہیں، ایک بچہ کسی ٹیلے پر چڑھنے کے لیئے بٹیا سے ہٹ گیا ہی اُستانی اُس سے کہتی ہی "واپس چلے آؤ۔ تمھاری جرابیں میلی ہو جائیں گی"، اس طرح یہ خرابی دوچند ہو جاتی ہی اس غرض سے کہ بچے اپنی ماں کی خوب صورتی کے معیار تک پہنچ جائیں اور اُس کے دوست احباب اُن کو سراہیں یہ امر ضروری ہی کہ اُن کا لباس مقدار میں کم اور بناوٹ میں نامناسب ہو اور اِن آسانی سے خراب ہو جانے والے کپڑوں کو صاف، ستھرا اور صحیح و سالم رکھنے کے لیے بچوں کو اُس چونچال پن سے روکا جاتا ہی جو اُن کے لیے بالکل جبلی اور ضروری ہی۔ لباس ناکافی ہونے کی حالت میں جس ورزش کی ضرورت دوچند ہوتی ہی اُس ورزش کو اس وجہ سے روکا جاتا ہی کہ مبادا کپڑے بدنما نہ ہو جائیں۔ کاش کہ اس انتظام کی خوف ناک بے رحمی کو وہ لوگ سمجھ سکتے جو اس کو قائم رکھتے ہیں! ہم بلا تامل کہتے ہیں کہ ظاہری بھڑک کے اس غیر محتاط خیال سے صحت کمزور، قویٰ ناقص اور زندگی ناکام جوان باتوں کا نتیجہ ہی رہ جاتی ہی اور اسی وجہ سے ہزاروں آدمی سال بسال بدبختی کی سزا بھگتتے ہیں۔ اور اگر بالفرض قبل از وقت مر کر ماں کی خود بینی کے "دیوتا" کی بھینٹ سچ مچ نہیں چڑھتے تو بدبختی کی سزا تو ضرور ہی بھگت لیتے ہیں۔ ہماری منشا یہ نہیں ہی کہ سخت تدابیر کا مشورہ دیں مگر یہ خرابیاں واقعی ایسی سخت ہیں کہ بالوں کی طرف سے دست اندازی یقیناً مناسب بلکہ ضروری ہے۔ پس ہمارے نتائج حسب ذیل ہیں:-

اوّل۔ بچوں کا لباس ہرگز اس قدر زیادہ نہ ہونا چاہیئے جس سے شدید حرارت

پیدا ہو اور ہمیشہ اس قدر کافی ہونا چاہیئے کہ سردی کا عام احساس نہ ہو۔

دوم۔ روئی، سن یا ملی جلی بناوٹ کے مہین کپڑوں کی بجائے، جو عام طور پر استعمال کیئے جاتے ہیں، کسی ایسی عمدہ چیز کا کپڑا ہونا چاہیئے جس سے جسم کی حرارت باہر نہ نکلنے پائے مثلاً دبیز اونی کپڑا۔

سوم۔ کپڑا ایسا مضبوط ہونا چاہیئے جس کو گھسنے اور پھٹنے سے کم نقصان پہنچے جو طفلانہ کھیل کود کی وجہ سے ہوتا ہی۔

چہارم۔ اُس کا رنگ ایسا ہونا چاہیئے کہ استعمال میں آنے اور کھُلے رہنے سے جلد نہ اُڑ جائے۔

لڑکوں کی جسمانی ورزش کی طرف آجکل لوگوں کی توجہ مبذول ہونے لگی ہی

**جسمانی ورزش** کی ضرورت پر تو اکثر لوگ پہلے ہی توجہ کرنے لگے ہیں شاید جسمانی تعلیم کی اس ضرورت پر بہ نسبت اکثر دیگر ضروریات کے (کم از کم جہاں تک کہ یہ تعلیم لڑکوں سے متعلق ہی) بحث کی ضرورت کم ہی۔ عام مدارس و رخانگی مدارس میں بھی خاصے کافی کھیل کے میدان مہیا کیے گئے ہیں، بیرونی کھیلوں کے لیے عموماً وقت کا معقول حصہ دیا جاتا ہی اور اُن کی ضرورت تسلیم کی جاتی ہی۔ ایسا معلوم ہوتا ہی کہ اگر اور کسی امر میں نہیں تو اس امر میں ضرور یہ بات تسلیم کی گئی ہی کہ بچوں کے میلان کی پیروی مفید ہی اور یہ جو آج کل دستور ہی کہ صبح اور شام کے لمبے لمبے

---

[1] اس بات کا بیان کرنا ضروری ہی کہ بچوں کی ٹانگیں اور بازو شروع ہی سے کھلے رہنے کے عادی ہوتے ہیں اُن کو یہ احساس نہیں رہتا کہ اُن کی کھُلی ہوئی جلد ٹھنڈی ہی یا نہیں بعینہ جس طرح کہ ہم اُس وقت بھی جب کہ گھر سے باہر ہوتے ہیں اس بات کا شعور نہیں ہوتا کہ ہمارے چہرے ٹھنڈے ہیں۔ لیکن اگرچہ ایسے بچوں کا احساس آیندہ باقی نہیں رہتا تاہم ان سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ اُن کا جسم نقصان سے محفوظ رہتا ہی جیسے کہ یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ ٹیرا ڈل فیوگو کے باشندوں کو ننگے بدن رہنے سے اس وجہ سے نقصان نہیں پہنچتا کہ وہ برہنہ جسم پر پگلتی برف کے گرنے کی بے پروائی سے برداشت کر سکتے ہیں مصنف

سبقوں کے بعد کھُلی ہوا میں تفریح کے لیے چند منٹ کی چھٹی دی جاتی ہے حقیقت میں ہم کو اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مدرسے کے قواعد و ضوابط کو شاگردوں کے جسمانی احساسات کے موافق بنانے کا میلان روز بروز بڑھتا جاتا ہے۔ پس یہاں تشریح یا تجویز کے طور پر کچھ بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔

لڑکیوں [illegible] جسمانی و[illegible] کی طرف اب تک غا[illegible] ہیں

مگر ہم نے بیان مذکور میں یہ عبارت کہ "جہاں تک کہ یہ تعلیم لڑکوں سے متعلق ہے" اضافہ کرکے مجبوراً اُس کے مفہوم کو محدود کر دیا ہے، بدقسمتی سے لڑکیوں کے لیے صورت واقعہ بالکل مختلف ہے۔ یہ کسی قدر عجیب اتفاق ہے کہ ہم کو ہر روز لڑکوں اور لڑکیوں کا مقابلہ کرنے کا موقع ملتا ہے، دونوں کی تعلیم گاہیں ہر روز ہماری نظر سے گزرتی ہیں اور دونوں کا فرق الگ معلوم ہوتا ہے، لڑکوں کے مدرسہ میں تو تقریباً ایک بڑے باغ کو کھلا میدان بنا دیا گیا ہے جس میں بجری کٹی ہوئی ہے کھیل کود کے لیے کافی گنجایش ہے اور ورزش کے کرتبوں کے لیے بلّیاں اور ورزش کا سامان مہیا کیا گیا ہے۔ ہر روز ناشتہ سے پہلے پھر گیارہ بجے کے قریب، پھر دوپہر کے وقت، پھر سہ پہر کو اور مدرسہ بند ہونے کے بعد لڑکے کھیلنے کو جس وقت باہر نکلتے ہیں تو آس پاس کے مقامات اُن کے شور غل اور قہقہوں سے گونج اُٹھتے ہیں اور جب تک وہ وہاں رہتے ہیں آنکھیں اور کان دونوں اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ وہ اُن پُر لطف کھیلوں میں محو ہیں جن سے نبض تیز چلنے لگتی ہے اور ہر ایک عضو کا صحت بخش عمل ہوتا ہے۔ مگر نوجوان شریف زادیوں کی تعلیم کا جو انتظام کیا گیا ہے اُس کی تصویر کیسی مختلف ہے! جب تک یہ بات بتائی نہ گئی درحقیقت ہم کو یہ معلوم نہیں ہوا تھا کہ ہم سے جس قدر قریب لڑکوں کا مدرسہ ہے اُسی قدر قریب لڑکیوں کا مدرسہ بھی ہے۔ اس مدرسہ کے باغ میں جو بالکل اتنا ہی بڑا ہے جتنا لڑکوں کے مدرسہ کا، لڑکیوں کے کھیل کے سامان کا مطلق کوئی نشان نہیں ہے مگر نفیس گھاس کے قطعات، بجری کی روشوں جھاڑیوں اور پھولوں سے بالکل آراستہ

ہے جیسا کہ مفصلات میں معمولی طور پر ہوا کرتا ہے۔ پانچ مہینے میں ایک دفعہ بھی کسی لڑکی کے ہنسنے بولنے یا شور وغل کی آواز سے اس مدرسہ کی طرف ہماری توجہ مبذول نہیں ہوئی کبھی کبھار لڑکیاں درسی کتابیں ہاتھ میں لیے روشوں پر پھرتی ہوئی یا ہاتھ میں ہاتھ دیئے سیر کرتی ہوئی دکھائی دی ہیں بے شک ایک دفعہ ہم نے باغ کے گرد ایک لڑکی کو دوسری لڑکی کے پیچھے دوڑتے دیکھا تھا مگر اس کے سوا کسی قسم کی طاقت بخش ورزش دیکھنے میں نہیں آئی۔

یہ تعجب خیز فرق کیوں ہے؟ کیا یہ بات ہے کہ لڑکی کی جسمانی ساخت لڑکے کی جسمانی ساخت سے اس قدر مختلف ہے کہ اُس کو ان اُچھل کود کی ورزشوں کی ضرورت نہیں ہے؟ کیا یہ بات ہے کہ لڑکیوں کو شور وغل کے کھیل کی طرف کوئی رغبت نہیں ہوتی۔ جس کی طرف لڑکوں کو رغبت ہوتی ہے؟ یا یہ بات ہے کہ لڑکوں کی اس رغبت کو تو جسمانی مستعدی کا محرک سمجھا جاتا ہے جس کے بغیر کافی نشو و نما نہیں ہو سکتا مگر اُن کی بہنوں کی قدرت نے یہ رغبت معلمات کے دق کرنے کے سوا اور کسی مقصد کے لیے نہیں دی؟ مگر شاید ہم اُن لوگوں کا مقصد سمجھنے میں غلطی کرتے ہیں جو لڑکیوں کو تربیت کرتے ہیں۔ ہم کو ایک خفیف سا گمان ہے کہ قوی الجثہ لڑکیوں کا پیدا کرنا غیر ضروری سمجھا جاتا ہے، دہقانوں کی سی صحت اور زیادہ طاقت ذرا شرافت کے خلاف سمجھی جاتی ہیں۔ ایک طرح کی نزاکت اتنی طاقت کہ ایک دو میل سے زیادہ پیدل نہ چل سکیں، نازک اور قلیل اشتہار، اور ڈرپوک ہونا جو کم زوری کے ساتھ عموماً ہوا کرتا ہے، یہ سب باتیں خواتین کی زینت سمجھی جاتی ہیں۔ ہم کو یہ توقع نہیں کہ کوئی شخص صاف صاف اس بات کا اقرار کرے گا مگر ہماری رائے میں اُستانی جی کے دل میں اکثر یہی خیال آتا ہوگا کہ ایک نوجوان خاتون کی ایسی کمال خیال پیدا کی جائے جو نمونہ مذکورہ بالا سے کچھ کم مشابہت نہ رکھتی ہو۔ اگر یہ

کم خوری کم زوری اور نزاکت غلطی شریف زادیوں کی شان کے مناسب سمجھی جاتی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ لڑکیوں کو کھیل اور ورزش سے روکا جاتا ہے

صورت ہی تو یہ بات تسلیم کرنی چاہیے کہ لڑکیوں کی تربیت کے مقررہ دستور العمل کی بابت یہ رائے ٹھیک ہی کہ وہ اسی نمونہ کی لڑکیاں پیدا کرنی چاہتا ہی۔ مگر یہ خیال کہ عورتوں کا کامل معیار یہی ہی سخت غلطی ہی۔ یہ بات کہ "مردمردانہ عورتوں کی طرف عموماً مائل نہیں ہوتے" بے شک صحیح ہی، ہم اس بات کو بالکل مانتے ہیں کہ وہ کمزوری جو بمقابلہ مردوں کے عورتوں میں پائی جاتی ہی، جس کی وجہ سے اُن کی حفاظت کے لیے اعلیٰ طاقت (مردوں) کی ضرورت ہی کشش کا ایک باعث ہی۔ مگر یہ تفاوت، جس کو اس طرح مردوں کے خیالات نے تسلیم کیا ہی، قدرتی اور ازل سے مقرر کیا ہوا ہی جو بغیر مصنوعی وسائل کے خود بخود ظاہر ہوتا ہی اور جب مصنوعی وسائل سے اس تفاوت کا درجہ بڑھ جاتا ہی (یعنی عورتیں زیادہ لاغر نحیف بن جاتی ہیں) تو یہ امر دوں کی نفرت کا باعث ہوتا ہی نہ کہ رغبت کا۔

ممکن ہی کہ ہر ایک سلیقہ پسند اس مقام پر یہ اعتراض کرے "تو پھر لڑکیوں کو وحشیانہ کود پھاند کی اجازت دی جائے یعنی لڑکوں کی طرح شوخ بننے اور اکھڑ کھیلوں کا عادی اور بے باک بننے دینا چاہیے" ہمارا خیال ہی کہ معلمات کو یہی کھٹکا ہمیشہ لگا رہتا ہی، ہم کو دریافت کرنے سے معلوم ہوا ہی کہ "نوجوان خاتون کے مدرسہ" میں شور و غل کے دیسے کھیل، جو لڑکے ہر روز کھیلتے ہیں، قابلِ تعزیر جرم ہیں اور ہم اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ یہ ممانعت اس وجہ سے ہی کہ مبادا اُن میں ایسی عادتیں پیدا ہو جائیں جو شریف زادیوں کی شان کے خلاف ہیں، مگر یہ خوف بالکل بے بنیاد ہی کیونکہ جس حالت میں کھیل کود کی مستعدی جس کی اجازت لڑکوں کو دی جاتی ہی، لڑکوں کو بڑے پن میں شریف آدمی بننے سے نہیں روکتی تو اسی قسم کے کھیل کود کی مستعدی لڑکیوں کو بڑے پن میں شریف زادیاں بننے سے کیوں روکنے لگی؟ جو نوجوان مدرسہ کی تعلیم سے فارغ ہو چکے ہیں وہ کھیل کے میدان میں خواہ کیسے ہی اکھڑ پنے کے کھیل

یہ خیال محض غلط ہی کہ اگر لڑکیوں کو لڑکوں کی طرح کھیل کود کی اجازت دی جائے۔ تو وہ شوخ اور بے باک ہو جائیں گی

کھیل چکے ہوں گر وہ بازار میں "مینڈک کی جست"[1]، کا کھیل یا ملاقات کے کمرہ میں سنگ مر
کی گولیوں سے نہیں کھیلتے۔ جس وقت وہ طفلانہ لباس پہننا ترک کرتے ہیں کھیل کود بھی
خیرباد کہہ دیتے ہیں۔ اور کرتب مردانہ نہیں ہیں اُن سے باز رہنے کی ایک خواہش بلکہ
بسا اوقات ایک مضحکہ انگیز خواہش ظاہر کرتے ہیں۔ پس اگر مناسب عمر کو پہنچ کر
مردانہ خودداری کا پاس لڑکوں کے کھیل کود کی ایسی پوری پوری روک تھام
کرتا ہی تو کیا زنانہ شرم وحیا کا پاس، جو بلوغ کے ساتھ ساتھ پختہ ہو جاتا
ہی، لڑکیوں کے اُسی قسم کے کھیلوں کی پوری پوری روک تھام نہ کریگا؟
کیا عورتوں کو ظاہری حالت کا خیال مردوں سے زیادہ نہیں ہوتا؟ اور کیا اسی وجہ
سے اکھڑ اور پرشور کھیلوں کی روک تھام کا اور بھی زیادہ خیال عورتوں میں پیدا
نہ ہو گا؟ یہ قیاس کیسا بیہودہ ہی اگر معلمات "سخت تربیت" نہ کریں تو زنانی
فطرت کا ظہور نہ ہو گا۔

ودجمناسٹک
رجحابہتر
بناسٹک
نقصانات

مثل اور حالتوں کے اس حالت میں بھی ایک مصنوعی تدبیر کی خرابیوں کے
تدارک کے لیئے دوسری مصنوعی تدبیر کو رواج دیا گیا ہی۔ چونکہ قدرتی اور طبعی ورزش
کی ممانعت کی جاتی ہی اور ورزش نہ کرنے کے خراب نتیجے صاف نظر آتے ہیں
اس لیئے مصنوعی ورزش یعنی جمناسٹک کا طریقہ اختیار کیا گیا ہی۔ ہم تسلیم کرتے
ہیں کہ مطلق ورزش نہ کرنے سے جمناسٹک بہتر ہی مگر ہم اس بات سے انکار
کرتے ہیں کہ یہ ورزش کھیل کود کا کافی بدل ہی۔ اس کے نقصان مثبت اور منفی
دونوں قسم کے ہیں۔

اوّل تو عضلات کی ان مصنوعی حرکتوں میں کھیل کود کی حرکتوں کے مقابلہ

[1] لڑکوں کا ایک کھیل ہی۔ اس میں ایک لڑکا آگے کو جھک جاتا ہی اور دوسرا اُس کے کندھوں پر ہاتھ دھر کر اوپر سے اُچک کر کود جاتا ہی۔ مترجم

ہیں تنوع یقیناً کم پایا جاتا ہو اور ان حرکتوں سے جسم کے کل حصوں پر فعل کی مساوی تقسیم بھی نہیں ہوتی جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہو کہ خاص خاص اعضا پر بار پڑنے کے سبب اس طریقہ سے بہ نسبت کسی دوسرے طریقہ کے تکان بہت جلد پیدا ہو جاتی ہو۔ اس نقصان پر سردست ہم اتنا اضافہ اور کرتے ہیں کہ اگر خاص خاص اعضا پر ہمیشہ بار پڑتا ہی تو اُس کا نتیجہ یہ ہوتا ہی کہ اعضا میں تناسب قائم نہیں رہتا۔ دوسرے یہ کہ اس قسم کی ورزش کی مقدار نہ صرف (اعضا کے فعل کی) غیر مساوی تقسیم کی وجہ سے کم ہوگی بلکہ اُس میں اس وجہ سے اور بھی کمی ہوگی کہ بچوں کو اُس سے دلچسپی نہیں ہوتی۔ اس قسم کی حرکتیں مقررہ سبقوں کی شکل اختیار کرنے کے سبب بعض اوقات ناگوار ہوتی ہیں اور بالفرض ناگوار نہ ہوں تو بھی بوجہ عدم تفریح تکان کا باعث یقیناً ہوتی ہیں۔ یہ سچ ہو کہ رقابت اس قسم کی ورزشوں میں محرک کا کام دیتی ہو مگر یہ محرک دیرپا نہیں ہو جیسا کہ طرح طرح کے کھیل کود کا لطف دیرپا محرک ہو۔ مگر سب سے بھاری اعتراض ابھی باقی ہو۔ عضلات کی جو ورزش جمناسٹک سے حاصل ہوتی ہو وہ باعتبار کمیت کے تو ادنیٰ درجہ کی ہو ہی مگر باعتبار کیفیت کے اور بھی ادنیٰ درجہ کی ہو۔ مصنوعی ورزش سے نسبتہً لطف حاصل نہیں ہوتا اور اُس کے جلد چھوڑ دینے کا ایک سبب ہم نے یہی بتایا ہو۔ یہی سبب اس بات کا بھی ہو کہ اس ورزش کا اثر نظام جسمانی پر ادنیٰ درجہ کا ہوتا ہو۔ یہ عام خیال کہ "جب تک جسمانی فعل کی مقدار یکساں ہو اُس وقت تک اس امر کا مضایقہ نہیں کہ وہ فعل فرحت بخش ہے یا نہیں" سخت غلطی ہو۔ نفسی جوش، جو طبیعت کے موافق ہوتا ہو، نہایت طاقت بخش اثر رکھتا ہو۔ دیکھو ایک کم زور آدمی پر کسی خوش خبری یا پرانے دوست کی ملاقات کا کیسا اثر پڑتا ہو، غور کرو کہ سمجھ دار طبیب کم زور مریضوں کو زندہ دلی کے جلسوں میں شامل ہونے کی کیسی تاکید کرتے ہیں یاد کرو کہ نظارہ کی تبدیلی سے جو حظ

حاصل ہوتا ہی وہ صحت کے لئے کیسا مفید ہی۔ حقیقت یہ ہی کہ خوشی مقویات میں سب سے بڑھ کر ہے۔ چوں کہ خوشی دوران خون کو تیز کرتی ہی اس لیے ہر فعل آسانی سے پورا ہوتا ہی اسی وجہ سے اگر صحت پہلے سے موجود ہو تو اُس میں ترقی ہو جاتی ہی اور زائل ہو جائے تو پھر بحال ہو جاتی ہی ان وجوہات سے کھیل کود کو جمناسٹک پر حقیقی فوقیت حاصل ہی۔ بچوں کو اپنے کھیلوں سے نہایت دلچسپی حاصل ہوتی ہی اور وہ ایک نشاط انگیز خوشی کے ساتھ اپنے اکھڑپنے کے کھیلوں کو جاری رکھتے ہیں۔ یہ دونوں باتیں ایسی ہی ضروری ہیں جیسی کہ ورزش جو اُن کھیلوں کے ساتھ ہو جاتی ہی اور چوں کہ جمناسٹک میں یہ روحانی محرکات نہیں ہیں اس لیے اُس کی بنیاد ضرور ناقص ہونی چاہیئے۔

پس اگر یہ امر تسلیم کر لیا جائے، جیسا کہ ہم تسلیم کرتے ہیں، کہ اعضا کی مصنوعی ورزشیں (جمناسٹک) مطلق ورزش نہ کرنے سے بہتر ہیں اور نیز یہ امر کہ اگر اُن کو اور ورزشوں کے ساتھ ساتھ بطور مزید امداد کے استعمال کریں تو وہ مفید ہوتی ہیں۔ تو بھی ہم اس بات پر زور دیتے ہیں کہ وہ اُن ورزشوں کی جگہ، جن کی محرک طبیعت ہی، ہرگز کام نہیں دے سکتیں۔ کھیل کود کے کام جن کی طرف فطرةً رغبت ہوتی ہی جسمانی بہبودی کی غرض سے لڑکوں اور نیز لڑکیوں کے لیے نہایت ضروری ہیں جو شخص اُس کو روکتا ہی وہ اُن وسائل کو روکتا ہی جو جسمانی نشوونما کے لیے خدا تعالیٰ نے مقرر کیے ہیں۔

ابھی ایک مضمون باقی ہی جو شاید مضمون بالا میں سب سے زیادہ غور طلب ہی۔ بہت سے

کھیل کود کے ساتھ کسی قدر جمناسٹک بھی کیجائے تو مفید ہوتی ہی مگر جمناسٹک کھیل کود کا بدل نہیں کر سکتی

نئی توانائی کی قوت اور اُس کا اُٹھان تنزل پر ہے

---

ے اسی مضمون کا ایک فارسی شعر یہ ہی ؎

| جانور فربہ شود از ناؤ نوش | | آدمی فربہ شود از راہ گوش  مترجم |
|---|---|---|

اشخاص یہ کہتے ہیں کہ تعلیم یافتہ جماعتوں میں بالغ نوجوان اور لڑکے جو قریب البلوغ ہیں نہ تو اُن کا نمو ایسا عمدہ ہی جیسا کہ اُن کے بزرگوں کا تھا اور نہ وہ ایسے مضبوط ہی ہیں۔ جب ہم نے اوّل اوّل یہ بات سُنی تھی تو ہماری طبیعت کا میلان اس طرف تھا کہ اس قول کو اُن بہت سی حکایات کے ذیل میں شامل کردیں جن میں حال کی قدر و منزلت گھٹا کر ماضی کی قدر و منزلت بڑھانے کا قدیمی رجحان پایا جاتا ہی۔ قدیمی زرہوں کی پیمائش سے ثابت ہی کہ آج کل کے آدمی قدیم زمانہ کے آدمیوں سے ڈیل ڈول میں بڑے ہیں اور موت کے نقشوں سے ظاہر ہی کہ مدت عمر میں کمی نہیں بلکہ زیادتی ہی۔ ان دونوں واقعات کو ذہن میں رکھ کر ہم نے اس رائے پر (کہ نئی تانتی کی طاقت اور اُس کا اُٹھان روبہ تنزل ہی) جو ایک بے بنیاد اعتقاد معلوم ہوتا تھا کچھ توجہ نہیں کی تھی مگر جزئیات کے مشاہدہ نے ہماری رائے کو متنزلزل کردیا۔ مزدوری پیشہ جماعتوں کو اس مقابلہ سے خارج کرکے ہم نے زیادہ تر حالتیں ایسی دیکھی ہیں جن میں بچے اپنے والدین کے قد کو نہیں پہنچتے اور عمر کے تفاوت کا پورا لحاظ رکھنے کے بعد تن و توش میں بھی ایسی ہی کمی دیکھی جاتی ہی اطبا کہتے ہیں کہ لوگ آج کل فصد کی اس قدر برداشت نہیں کرسکتے جس قدر کہ گزشتہ زمانہ میں کرسکتے تھے، قبل از وقت سر کے بالوں کا اُڑ جانا آج کل بمقابلہ زمانہ سابق بہت زیادہ عام ہی اور نئی تانتی میں تعجب انگیز کثرت کے ساتھ دانتوں کا زوال قبل از وقت دیکھنے میں آتا ہی عام قویٰ میں بھی بالکل ایسا ہی عجیب تفاوت نظر آتا ہی چوں کہ گزشتہ نسلوں کے آدمی غیر محتاط زندگی بسر کرتے تھے اس لیے وہ موجودہ نسل کے آدمیوں سے جو محتاط زندگی بسر کرتے ہیں، زیادہ محنت برداشت کرسکتے تھے۔ اگرچہ ہمارے حال کے بزرگ خوب پیتے تھے، وقت کے پابند نہ تھے، تازی ہوا کا کچھ لحاظ نہیں رکھتے تھے اور صفائی کا بھی چنداں خیال نہیں کرتے تھے تاہم انتہائے پیری تک بھی بغیر کسی نقصان کے متواتر محنت کرسکتے تھے۔ مثال کے طور پر جیوں اور قانون پیشہ لوگوں کی تواریخ پر غور کرو

مگر ہم لوگ جو اپنی جسمانی بہبودی کا بہت خیال رکھتے ہیں، اعتدال کے ساتھ کھاتے ہیں اور حد سے زیادہ نہیں پیتے، مکانات میں ہوا کی آمد و رفت پر توجہ کرتے ہیں۔ اکثر نہاتے دھوتے ہیں، ہر سال سیر و تفریح کے لیے باہر نکل جاتے ہیں اور علم طب سے زیادہ فائدہ اُٹھاتے ہیں، کام کی برداشت نہیں کر سکتے اور ڈھیر ہوئے جاتے ہیں۔ باوجودیکہ ہم قوانین صحت پر بڑی توجہ کرتے ہیں لیکن ہم اپنے اجداد سے زیادہ کم زور معلوم ہوتے ہیں جو اکثر اعتبارات سے قوانین صحت کے خلاف زندگی کرتے تھے اور اگر نئی تانتی کی شکل و شباہت اور اُس کی متواتر بیماریوں سے اندازہ کیا جائے تو اس امر کا احتمال ہے کہ وہ ہم سے بھی زیادہ کم زور ہوں گے۔

اس کے کیا معنی ہیں؟ کیا یہ معنی ہیں کہ قدیم زمانہ میں بچوں اور بڑوں دونوں کی پُرخوری اُس کم خوری سے، جس کی طرف اب ہم نے عام طور پر توجہ کی ہے، کم مضر تھی؟ یا یہ معنی ہیں کہ ناکافی لباس، جس کو دھوکا دینے والے "جفاکشی کے خیال" نے تقویت دی ہے، قابل الزام ہے؟ یا یہ کہ جھوٹی صفائی اور ستھرائی کی پیروی میں طفلانہ کھیل کود کی تھوڑی بہت مزاحمت اُس کا باعث ہے؟ ہمارے دلائل سے یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ اس خرابی کے پیدا کرنے میں ان سببوں میں سے ہر ایک سبب غالباً کچھ نہ کچھ حصہ رکھتا ہے[1] مگر ایک اور مضر اثر بھی اپنا عمل کر رہا ہے جو شاید سب سے زیادہ قوی ہے۔ اس سے ہماری مراد دماغی محنت کی شدت ہے۔

اس کے متعدد اسباب ہیں۔ مگر خاص سبب دماغی محنت کی کثرت ہے۔

آج کل معاشرت کے دباؤ نے جوانوں اور بڈھوں کو روز افزوں کشاکش میں

آجکل بابپوں کی ... کے لیے سخت محنت کرنے پر مجبور ہیں جس سے اُن کی صحت اور اُنکی اولاد کی صحت کو سخت نقصان پہنچتا ہے۔

[1] ٹیکے کے ذریعے سے جسمانی بیماری کی دبی ہوئی صورتوں کا پھیل جانا بھی غالباً اس خرابی کا ایک سبب ہے۔ علم تشخیص الامراض کے چند واقعات ہم کو یہ سکھاتے ہیں کہ جب کسی بچے کے ٹیکا لگایا جاتا ہے تو اُس کے جسم سے ٹیکے کا زہریلا مواد آبلوں کے ذریعہ خارج ہو جاتا ہے اور ان ہی آبلوں کے ذریعہ دیگر فاسد مواد بھی خارج ہونا چاہتا ہے خصوصاً اُس صورت میں جب کہ یہ فاسد مواد اس قسم کا ہو۔

مبتلا کر رکھا ہے۔ تمام کاموں اور پیشوں میں سخت تر مقابلہ ہر ایک بالغ آدمی کی قوتوں پر بار ڈالتا ہے اور اس سخت مقابلہ میں نوجوانوں کو اس لائق بنانے کے لیے کہ وہ اپنی حیثیت کو برقرار رکھیں بہ نسبت زمانۂ سابق کے زیادہ سخت تربیت کی جاتی ہے پس اُن کو دُھرا نقصان پہنچتا ہے۔ باپ جن کے حریفوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جاتی ہے اپنے آپ کو خطرناک حالت میں پاتے ہیں۔ اور باوجودیکہ وہ اس مصیبت میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اُن کو مجبوراً زیادہ ٹھاٹھ سے رہنے کے لیے زیادہ خرچ کرنا پڑتا ہے اس لیے ان کو تمام سال تک مقررہ وقت سے پہلے اور مقررہ وقت کے بعد بھی کام کرنا پڑتا ہے وہ ورزش کم کرتے ہیں اور صرف چھوٹی چھوٹی چھٹیاں حاصل کرتے ہیں۔ اس متواتر "محنت کی زیادتی" سے اُن کے انجر پنجر ہل جاتے ہیں اور ایسا ہی پنجر اُن کی اولاد کو وراثت میں ملتا ہے۔ یہ نسبتہً کم زور بچے، معمولی محنت ہی سے مضمحل ہونے کو تیار ہیں، اب اُن سے یہ خواہش کی جاتی ہے کہ وہ ایسے نصاب پر عبور حاصل کریں جو اُس نصاب سے بھی بہت زیادہ وسیع ہے جو گزشتہ نسلوں کے قوی بچوں کے لیے تجویز کیا گیا تھا۔

کثرت مطالعہ کے مضر نتائج کی مثالیں

جن آفت ناک نتائج کا اندیشہ ہو سکتا ہے وہ ہر جگہ نظر آتے ہیں، تم جہاں جاؤ چلے جاؤ تھوڑے ہی عرصہ میں ایسے بچے یا جواں مرد و عورت دونوں تمھارے دیکھنے میں آئیں گے جن کو زیادہ اور بے قاعدہ مطالعہ سے تھوڑا بہت نقصان پہنچا ہے

بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۰۰ - جو معمولاً جلد سے خارج ہوتا رہتا ہے جیسے کہ بعض نہایت ہی خراب مادے جسم سے نکلتے رہتے ہیں۔

پس اگر کسی بچہ کے جسم میں اس قدر خفیف زہر ہو کہ مرض مرئی کی شکل میں ظاہر نہ ہو سکے تو یہ بات ممکن بلکہ اغلب ہے کہ ٹیکے کے فاسد مادے کی وساطت سے جو اُس کے جسم سے لیا گیا ہے وہی زہر دوسرے بچوں کے جسم میں اور ان سے اوروں کے جسم میں سرایت کر جائے۔ مصنف

کہیں تو ایسا دیکھنے میں آئے گا کہ اُس کمزوری کی حالت سے بحال ہونے کے لیے جو کثرت مطالعہ سے پیدا ہوئی ہے، سال بھر تک مفصلات میں رہنا ضروری سمجھا گیا ہے، کہیں تم یہ دیکھو گے کہ دماغ کا خون منجمد ہو جانے کا مرض کئی مہینے سے موجود ہے، اور اندیشہ ہے کہ کہیں عرصہ تک قائم نہ رہے، کبھی تم ایسے بخار کا حال سنو گے جو اُس زائد از اعتدال تحریک کا نتیجہ تھا جو کسی وجہ سے مدرسہ میں پیدا ہو گئی تھی اور کبھی ایسے نوجوان کی مثال دیکھنے میں آئے گی جسے ایک مرتبہ پہلے بھی مطالعہ ترک کرنا پڑا تھا اور اب جب سے اُس نے دوبارہ مطالعہ شروع کیا ہے اُس کا یہ حال ہے کہ اکثر غشی کی حالت میں اُس کو جماعت سے اُٹھا کر لاتے ہیں۔ ہم وہ واقعات بیان کر رہے ہیں ایسے واقعات جن کو تلاش نہیں کیا گیا بلکہ گزشتہ دو سال کے عرصہ میں خود بخود ہمارے مشاہدہ میں آئے ہیں اور وہ بھی نہایت محدود حلقہ میں اور یہ فہرست ابھی ختم نہیں ہوئی ہے۔ حال ہی کا ذکر ہے کہ ہم کو یہ دیکھنے کا موقع ملا تھا کہ ایسے امراض کس طرح موروثی بن جاتے ہیں، یہ مثال ایک شریف زادی کی ہے جس کے والدین تنومند ہیں مگر ایک سکاچ بورڈنگ اسکول کے دستور العمل ہے جہاں اُس کو خوراک کم ملتی تھی اور کام زیادہ لیا جاتا تھا اُس کے جسمانی نظام کو اس قدر نقصان پہنچا ہے کہ صبح کو اُٹھتے وقت ہمیشہ اُس کے سر کو چکر آنے لگتے ہیں اور چونکہ یہ ضعف دماغ اُس کے بچوں کو وراثتہً پہنچا ہے اس لیے کئی بچے بغیر درد یا دوران سر کے معمولی مطالعہ کی بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ آج کل ایک نوجوان خاتون ہر روز ہمارے سامنے رہتی ہے جس کا جسمانی نظام کالج کے نصاب تعلیم کی بدولت جس پر اس نے عبور حاصل کیا ہے، عمر بھر کے لیے خراب ہو گیا ہے، اُس کے قوٰی پر اس قدر بار پڑا تھا کہ اُس میں ورزش کی طاقت باقی نہیں رہی تھی اور اب جبکہ وہ فارغ التحصیل ہو چکی ہے اُس کو ہمیشہ امراض کی شکایت رہتی ہے، قلیل اور نہایت غیر مستقل اشتہا

جو اکثر گوشت سے ابا کرتی ہے، دائمی برد اطراف، اُس وقت بھی جب کہ موسم گرم ہو، ضعف جو نہایت ہی آہستہ خرامی کے سوا چلنے پھرنے سے باز رکھتا ہے اور وہ بھی تھوڑے ہی عرصہ تک، زینہ پر چڑھنے سے اختلاج قلب، سخت پریشان خواب، یہ تمام خرابیاں اور نیز نمو کا رُک جانا اور رگ و پے کا ڈھیلا پڑ جانا یہ سب باتیں اُن نتائج میں سے ہیں جو کثرت مطالعہ سے مترتب ہوتے ہیں۔ خاتون مذکور کی مثال کے ساتھ ہم اُس کی ایک سہیلی اور ساتھ کی پڑھی ہوئی لڑکی کی مثال اضافہ کر سکتے ہیں، وہ بھی ایسی ہی کم زور ہے، اُس کو خاموش جلیسوں کی صحبت میں بھی غشی کی نوبت آ جاتی ہے اور اُس کے معالج طبیب نے آخر کار اُس کو بالکل ترک مطالعہ پر مجبور کیا ہے۔

خفیف اور غیر نمایاں نقصانات جو کثرت مطالعہ سے پہنچتے ہیں وہ مذکورہ بالا نقصانات سے جو بہت زیادہ ہیں۔

جب کہ ایسے نمایاں نقصان اس قدر کثیر الوقوع ہیں تو خفیف اور غیر نمایاں نقصان کیا کچھ عام نہ ہوں گے! بمقابلہ ایک ایسی حالت کے جس میں قطعی بیماری "زائد از اعتدال محنت" کا نتیجہ ہو غالباً کم سے کم چھ حالتیں ایسی ہیں جن میں خرابی غیر نمایاں اور آہستہ آہستہ جمع ہوتی ہے یعنی ایسی حالتیں جن میں جسم کے افعال میں ابتری پیدا ہو جاتی ہے جو کسی نہ کسی خاص سبب یا جسم کی نزاکت سے منسوب کی جاتی ہے، ایسی حالتیں جن میں جسمانی نمو قبل از وقت رُک جاتا ہے۔ ایسی حالتیں جن میں طبیعت کا مخفی رجحان مرض دق کی طرف ہو کر مستقل ہو جاتا ہے ایسی حالتیں جن میں اول ہی اُس عام دماغی مرض کا میلان پایا جاتا ہے جو جوانی کی محنت کا نتیجہ ہے، جو لوگ سخت محنت کرنے والے پیشہ وروں اور تاجروں سے کثیر الوقوع امراض پر توجہ کر کے اُن بدتر نتایج پر غور کریں گے جو ناواجب محنت سے بچوں کے غیر نشو و نما یافتہ جسم پر مترتب ہوتے ہیں اُن سب پر یہ بات ظاہر ہو جائے گی کہ محنت سے صحت عموماً کیونکر زائل ہو جاتی ہے۔ بچے بالغوں کے

برابر نہ تو سختی کی برداشت کر سکتے ہیں نہ جسمانی محنت کی اور نہ دماغی محنت کی جب کہ بالغوں کو اُس "زائد از اعتدال محنت" سے جو اُن سے لی جاتی ہے صریحاً اتنی تکلیف پہنچتی ہے تو پھر انصاف کرو کہ اُس عقلی محنت کی وجہ سے، جو بچوں کو بھی بسا اوقات بالغوں کے برابر کرنی پڑتی ہے، بچوں کو کس قدر سخت نقصان پہنچے گا!

حقیقت یہ ہے کہ جب ہم مدرسہ کی اُس بے رحمانہ قاعدوں کی جانچ پڑتال کریں جس پر اکثر زور دیا جاتا ہے، تو تعجب اس بات کا نہیں کہ وہ نہایت مضر ہے بلکہ اس بات کا ہے کہ بچے اُس کی برداشت ہی کیوں کر کر سکتے ہیں۔ ہم ایک مثال لکھتے ہیں جو سر جان فاربس نے اپنے ذاتی علم سے بیان کی ہے اور بہت کچھ تحقیقات کے بعد اُنھوں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہ مثال کل انگلستان کے معمولی مدارس نسواں کے دستور العمل کا متوسط نمونہ ہے اوقات کی مفصل تقسیم کو چھوڑ کر ہم چوبیس گھنٹوں کا خلاصہ درج کرتے ہیں:۔

سونا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۹ گھنٹے (چھوٹے بچے ۱۰ گھنٹے)

مدرسہ میں مطالعہ یا بتایا ہوا کام کرنا ۹ ″

مدرسہ میں یا گھر پر۔ بڑی عمر کے بچے اپنی
مرضی کے موافق مطالعہ کریں اور
چھوٹے بچے کھیلیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ $3\frac{1}{2}$ گھنٹے (یا زیادہ چھوٹے بچے $2\frac{1}{2}$ گھنٹے)

کھانا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ $1\frac{1}{2}$ ″

ورزش کھلی ہوا میں، باقاعدہ چہل قدمی
کی صورت میں، اکثر پڑھائی کی کتابیں
ہاتھ میں لے کر اور وہ بھی صرف اُس
وقت جب کہ وقت مقررہ پر مطلع صاف ہو ۱ گھنٹہ

۲۴

بھلا اس "حیرت انگیز دستور العمل" کے نتائج جس کا یہ نام سرجان فاربس نے رکھا ہی کیا ہوتے ہیں؟ ضعف، زرد روئی، افسردہ دلی اور عام صحت کی خرابی اس کے یقینی نتائج ہیں۔ مگر صاحب موصوف کچھ اور بھی بیان کرتے ہیں "نفس کی ترقی کا بدرجہ غایت خیال رکھنے کی بدولت جسمانی سود و بہبود کا مطلق لحاظ نہیں کیا جاتا یعنی دماغی ورزش عرصہ دراز تک کی جاتی ہی اور ہاتھ پاؤں کی ورزش کم کی جاتی ہی اس کا نتیجہ صاحب موصوف کی تحقیقات کے مطابق عادتاً نہ صرف جسمانی افعال کی ابتری بلکہ جسمانی ساخت کی بے قاعدگی بھی ہی۔ وہ کہتے ہیں کہ "ہم نے حال میں ایک بڑے قصبہ میں ایک بورڈنگ اسکول کا معائنہ کیا تھا۔ جس میں چالیس لڑکیاں تھیں، اور غور و صحت کے ساتھ تحقیقات کرنے پر ہم کو یہ بات معلوم ہوئی کہ ان لڑکیوں میں سے ایسی ایک بھی نہیں ہی جس کو مدرسہ میں دو سال ہو چکے ہوں (اور اکثر لڑکیوں کو اسی قدر عرصہ ہو گیا تھا) اور اُس کی کمر تھوڑی بہت نہ جھک گئی ہو"[۱]۔

ممکن ہی کہ ۱۸۳۳ء سے، جب کہ سرجان فاربس نے یہ واقعہ تحریر کیا تھا اس وقت تک کچھ ترقی ہو گئی ہو اور ہم کو اُمید ہی کہ ترقی ہوئی ہی مگر یہ بات کہ طریقہ مذکور کا اب تک عام رواج ہی، نہیں بلکہ بعض حالتوں میں بہ نسبت سابق کے اُس کو پہلے سے بھی زیادہ حد درجہ تک پہنچا دیا گیا ہی ہم بذات خود اس کی تصدیق کر سکتے ہیں، ہم حال میں ایک ٹریننگ کالج (مدرسہ تعلیم المعلمین) دیکھنے گئے تھے جو نوجوان مردوں کے لیے بنایا گیا ہی، یہ اُن کالجوں میں سے ہی جو مدارس میں عمدہ تربیت یافتہ معلم بہم پہنچانے کی غرض سے حال ہی میں قایم کیے گئے ہیں، اس کالج میں جہاں کہ خانگی مدارس کی معلمات کی رائے سے کسی قدر بہتر توقع ہونی چاہیئے تھی سرکاری نگرانی

ایک ٹریننگ کالج میں بھی دستور العمل مصنف نے خود دیکھا

[۱] دیکھو کتاب "طب عملی کی قاموس"، جلد اول، صفحات ۶۹۷-۶۹۸۔

میں ہم نے روزانہ دستور العمل حسب ذیل دیکھا ہے۔

۶ بجے طالب علموں کو جگایا جاتا ہے۔

۷ سے ۸ تک مطالعہ

۸ سے ۹ تک کتاب مقدس کا پڑھنا نماز اور ناشتہ

۹ سے ۱۲ تک مطالعہ۔

۱۲ سے ½ ۱ تک فرصت جو چلنے پھرنے یا کسی اور ورزش کے لیے برائے نام مخصوص ہے

مگر اکثر مطالعہ میں صرف ہوتی ہے۔

½ ۱ سے ۲ تک کھانا کھانے میں عموماً ۲۰ منٹ لگتے ہیں۔

۲ سے ۵ تک مطالعہ۔

۵ سے ۶ تک چائے اور تفریح۔

۶ سے ½ ۷ تک مطالعہ

½ ۸ سے ½ ۹ تک اگلے دن کے سبق تیار کرنے کے لیے بطور خود مطالعہ کرنا

۱۰ بجے سونا۔

پس چوبیس گھنٹوں میں سے آٹھ گھنٹے سونے کے لیے مخصوص کیے گئے ہیں سوا چار گھنٹے کپڑے پہننے نماز اور کھانے میں صرف ہوتے ہیں اور آرام کے مختصر وقفے اسی کے ساتھ شامل ہیں، ساڑھے دس گھنٹے مطالعہ کے لیے دیئے گئے ہیں اور سوا گھنٹہ ورزش کے لیئے جو اختیاری ہے اور اکثر نہیں کی جاتی مگر جو وقت ورزش کے لیے مقرر ہے اس کو کتابوں کے لیے مخصوص کرکے نہ صرف مقررہ مطالعہ کے ساڑھے دس گھنٹوں کو بڑھا کر اکثر ساڑھے گیارہ کر دیا جاتا ہے بلکہ بعض طالب علم اپنے سبق تیار کرنے کے لیے صبح کے چار بجے اُٹھتے ہیں اور معلم اُن کو ایسا کرنے کی کچھ کچھ ترغیب دیتے ہیں۔ اوقات معین میں جس قدر نصاب پر عبور حاصل کرنا پڑتا ہے وہ اس قدر

وسیع ہی اور معلم جن کی نیک نامی کی بازی اپنے شاگردوں کو اچھی طرح امتحان پاس کرانے پر لگی ہوئی ہوتی ہی، اُن پر اس قدر زور ڈالتے ہیں کہ اُن کو عقلی محنت میں عموماً بارہ تیرہ گھنٹے روز صرف کرنے کی ترغیب ہوتی ہی!

کالج مذکور کے طلبہ کی صحت نہایت خراب رہتی ہی

اس بات کے سمجھنے کے لیئے کسی پیغمبر کی ضرورت نہیں ہی کہ اس محنت سے جو نقصان پہنچتا ہی وہ بالضرور سخت ہوگا۔ جیسا کہ اس کالج کے ایک شخص نے ہم سے بیان کیا تھا کہ جن لوگوں کا رنگ کالج میں داخل ہونے کے وقت سرخ و سفید ہوتا ہی تھوڑے ہی عرصہ میں اُن کا رنگ پھیکا پڑ جاتا ہی، وہ اکثر مریض رہتے ہیں، بعض طالب علموں کا نام ہمیشہ بیماروں کی فہرست میں درج رہتا ہی، زوال اشتہا اور سوء ہضمی نہایت عام ہیں۔

مرض اسہال کا غلبہ رہتا ہی عموماً کل تعداد طلبہ کا ایک تہائی حصہ ایک ہی وقت میں اس بیماری میں مبتلا رہتا ہی، درد سر کی عام شکایت ہی اور بعض طلبہ قریب قریب ہر روز مہینوں تک اس میں مبتلا رہتے ہیں اور ایک خاص فی صدی تعداد طلبہ ایسی رہے جو بالکل مضمحل ہو کر کالج کو چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔

کسی ٹریننگ کالج کا ایسا دستور ہونا تعلیم یافتہ جماعت کی جہالت کا ثبوت ہی

یہ امر وحشت انگیز ہی کہ جو درس گاہ ایک قسم کا نمونہ ہی جس کو زمانہ حال کے روشن خیال لوگوں کی جماعت نے قایم کیا ہی اور جو اُن کی نگرانی میں ہی، اُس دستور العمل اس قسم کا ہوا سخت امتحانات کی وجہ سے، جن کے ساتھ یہ خرابی بھی لگی ہوئی ہی کہ تیاری کے لیے تھوڑی مدت مقرر کی جاتی ہی، طالب علموں کو مجبوراً ایسے طریقوں کی طرف رجوع کرنی پڑتی ہی کہ جو لوگ اس کو اختیار کریں اُن کی صحت یقیناً زائل ہو جاتی ہی۔ یہ بات بے رحمی کا ثبوت نہیں افسوس ناک حالت کا ثبوت تو ہی۔

بے شک یہ مثال زیادہ تر ایک مستثنیٰ صورت[۵] ہی اور اسی قسم کی دوسری رسگاہوں میں شاید کہیں اس کی نظیر مل سکے مگر ایسی سخت مثالوں کا وجود ہی بہت کچھ اس بات کا ثبوت ہی کہ نئی تانتی کے نفسوں پر حد سے زیادہ بوجھ ڈالا گیا ہی۔ جوں کہ ایسے ٹریننگ کالجوں کے ضوابط و مطالبات تعلیم یافتہ جماعت کے خیالات کا عکس ہیں اور دوسری شہادتوں سے قطع نظر محض ان ضوابط سے یہ ثابت ہوتا ہی کہ آجکل طلبہ پر ضرورت سے زیادہ بوجھ ڈالنے کا رجحان موجود ہی۔

زائد از اعتدال تعلیم بچپن اور جوانی دونوں میں یکساں مضر ہے

یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہی کہ لوگوں کو جوانی کی "زائد از اعتدال" تعلیم کے خطروں سے اس قدر کم واقفیت ہو جب کہ بچپن کی "زائد اعتدال" تعلیم کے خطروں سے اس قدر عام واقفیت ہی۔ شیر خوار بچوں کے "قبل از وقت نشو و نما" سے جو خراب نتیجے پیدا ہوتے ہیں اُن سے اکثر والدین کسی قدر واقف ہیں۔ ہم ہر ایک قوم میں یہ بات دیکھ سکتے ہیں کہ ایسے لوگوں کو زجر و ملامت کی جاتی ہی جو اپنے چھوٹے بچوں پر قبل از وقت زیادہ بار ڈال دیتے ہیں۔ اور اس بچپن کی تحریک کا خطرہ اُسی قدر زیادہ ہوتا ہی جس قدر کہ اُس کے نتائج سے کافی واقفیت ہوتی ہی۔

[۵] مصنف نے اپنے وطن کی عام تعلیمی حالت کو مدنظر رکھ کر اس قسم کے مدرسوں کو ایک مستثنیٰ صورت قرار دیا ہی اور جب یہ کتاب لکھی گئی تھی اس وقت سے اب تک ہاں مدارس کی حالت میں بہت کچھ ترقی ہو گئی ہی۔ لیکن اگر ہم ہندوستان کے مدارس کی موجودہ حالت پر غور کریں تو بلا تامل کہہ سکتے ہیں کہ شاید کوئی مدرسہ ایسا نہ ہوگا کہ جس میں متوسط درجہ کے طلبہ کو بارہ تیرہ گھنٹے روز سے کم محنت کرنی پڑتی ہو۔ ہندوستان کے مدارس کا نصاب تعلیم اس قدر سخت اور بے قاعدہ ہی کہ طلبہ کو امتحان پاس کرنے کے لیے نہایت سخت محنت کرنی پڑتی ہی۔ اُن کے جسمانی نظام پر نہایت مضر اثر پڑتا ہی۔ یہ بیان میرے ذاتی تجربہ پر مبنی ہی جو علمی اور متعلمی کی حیثیت سے مجھ کو حاصل ہوا ہی۔ ملک کے روشن خیال آدمیوں کو اس کا انتظام ضرور کرنا چاہیئے اور نصاب تعلیم کو معقول بنانے کے لیے بدلائل معقول گورنمنٹ سے درخواست کرنی چاہیئے۔ مترجم

اُس رائے پر غور کرو جو علم الاعضا کے ایک ممتاز پروفیسر نے کنایتہً ظاہر کی ہے جس نے
ہم سے کہا تھا کہ "میں اپنے چھوٹے بچے کو کسی قسم کے سبق پڑھانے کا ارادہ
نہیں رکھتا جب تک کہ اُس کی عمر آٹھ سال کی نہ ہو جائے"، جب کہ سب لوگ
اس حقیقت سے آشنا ہیں کہ بچپن میں عقل کو زبردستی ترقی دینے سے یا تو
جسمانی کمزوری لاحق ہوتی ہے یا آخرکار حمق پیدا ہو جاتا ہے یا قبل از وقت موت
آجاتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ یہی حقیقت تمام جوانی میں بھی صادق
آتی ہے، مگر یقیناً ایسا ہی ہوتا ہے، قویٰ کا نشو و نما ایک خاص ترتیب اور ایک خاص رفتار کے
موافق ہوتا ہے، اگر تعلیم کا نصاب اُسی ترتیب اور اُسی رفتار کے مطابق ہو تو فبہا اور اگر یہ بات
نہ ہو یعنی اگر علم کو ایسی ترتیب سے سکھایا جائے جو بہ نسبت اُس ترتیب کے جو سریع الفہم
ہے زیادہ پیچیدہ اور زیادہ عقلی ہو جس سے بچپن ہی میں اعلیٰ درجہ کے قویٰ پر زیادہ بار پڑ جائے
یا اگر "زائد از اعتدال تربیت" کی وجہ سے عقل عموماً اُس درجہ سے زیادہ ترقی کر جائے
جس درجہ تک کہ اُس عمر میں قدرتی طور پر اُس کی ترقی ہو سکتی ہے تو اس بات سے جو خلاف
ضابطہ فائدہ حاصل ہوگا اُس کے ساتھ اُسی قدر یا اُس سے زیادہ نقصان یقیناً پیش
آئے گا۔

اس امر کی تشریح کہ قدرت ایک سخت محاسب ہے

اس کا سبب یہ ہے کہ قدرت ایک سخت محاسب ہے اور جس قدر خرچ کرنے کے
لیے وہ آمادہ ہے اگر تم کسی مد میں اس سے زیادہ رقم کا مطالبہ کرو تو وہ کسی دوسری مد
سے کاٹ کر حساب برابر کر دیتی ہے۔ اگر تم قدرت کو اُسی کے رستہ پر چلنے دو اور اس بات
کی احتیاط رکھو کہ جسمانی اور عقلی نمو کے لیے جس قدر اور جس قسم کا خام مصالح ہر ایک عمر
میں درکار ہو وہ ٹھیک ٹھیک بہم پہنچا دیا جائے تو وہ آخرکار ایک ایسا فرد پیدا کرے گی
جس کے نشو و نما میں کم و بیش باقاعدگی پائی جائے گی۔ لیکن اگر تم کسی ایک حصہ کے
قبل از وقت یا ناواجب نمو پر زور دو تو وہ کم و بیش اعتراض کے ساتھ اس بات کو

قبول تو کر لیتی ہی مگر اس زائد کام کے پورا کرنے کے لیئے یہ ضرور ہی کہ وہ اپنا زیادہ تر ضروری کام ناتمام چھوڑ دے۔ یہ بات کبھی بھولنی نہیں چاہیے کہ نشوونما کی قوت، جو جسم میں کسی وقت موجود ہوتی ہی محدود ہی، اور چوں کہ وہ قوت محدود ہی اس لیے یہ بات ناممکن ہی کہ اُس سے ایک مقررہ مقدار سے زیادہ نتائج حاصل ہو سکیں۔ بچوں یا جوانوں کی اس قوت نمو پر سخت اور مختلف قسم کے مطالبے ہیں۔ جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں ورزش جسمانی ورزش سے جو نقصان ہوتا ہی اُس کی تلافی کرنی پڑتی ہی روزانہ مطالعہ سے جو دماغ فرسودہ ہوتا رہتا ہی اُس کا تدارک کرنا پڑتا ہی، جسم کے کسی قدر زائد نمو اور نیز دماغ کے کسی قدر زائد نمو کے لیے سامان بہم پہنچانا پڑتا ہی اور جس قدر قوت خوراک کی اُس کثیر مقدار کے ہضم کرنے میں صرف ہوتی ہی، جو ان بہت سے مطالبوں کے پورا کرنے کے لیے مطلوب ہی، اُس قوت کو بھی اس پر اضافہ کرنا چاہیے "اگر زائد قوت کا رُخ ان رستوں میں سے کسی رستہ کی طرف موڑ دیا جائے تو اُس کا رُخ دوسرے رستوں کی طرف سے ہٹ جاتا ہی" یہ بات ہر شخص کو ذاتی طور پر برہان لمی کے ذریعہ سے ظاہر اور برہان انی کے ذریعہ سے ثابت ہی، مثلاً ہر شخص جانتا ہی کہ زیادہ کھانے کے ہضم کرنے میں جسم پر اس قدر بار پڑتا ہی کہ نفس اور جسم میں کسل پیدا ہو جاتا ہی اور اُس کا نتیجہ یہ ہوتا ہی کہ اکثر نیند آتی ہی۔ ہر شخص یہ بھی جانتا ہی کہ اعتدال سے زیادہ جسمانی ورزش غور و فکر کی قوت کو گھٹاتی ہی، مثلاً عارضی افسردگی، جو یک لخت محنت کرنے کے بعد پیدا ہوتی ہی، یا تیس ۳۰ میل پیدل چلنے سے جو تکان ہوتی ہی، اُس کی وجہ سے عقلی محنت سے نفرت پیدا ہو جاتی ہی۔ ایک مہینے تک پیدل سفر کرنے سے عقلی سستی اس قدر ہوتی ہی کہ اُس کو رفع کرنے کے لیے کئی دن لگتے ہیں اور جو کسان جسمانی محنت میں اپنی عمریں صرف کرتے ہیں اُن میں ذہن کی تیزی بہت کم ہوتی ہی۔ پھر اس حقیقت سے بھی سب لوگ واقف ہیں

کہ اُس نمو کے دوران میں کبھی کبھی بچپن میں تیزی کے ساتھ واقع ہوتا ہے، قوت کا بڑا حصہ کچھ کر صرف ہو جاتا ہے اور یہ بات جسمانی اور عقلی افسردگی سے، جو اُن کو لازم ہے، ثابت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ واقعات کہ "کھانا کھانے کے بعد جو سخت تکان ہوتی ہے اُس سے نمو رک جاتا ہے" اور جن "بچوں سے ابتدا میں سخت محنت لی جاتی ہے اُن کے نمو میں فتور واقع ہو جاتا ہے" یہ واقعات بھی اسی اختلاف کو ظاہر کرتے ہیں یعنی یہ واقعات بھی اسی طرح اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ اگر کسی ایک کام میں اعتدال سے زیادہ **مستعدی** ظاہر کی جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہے کہ دوسرے کاموں میں مستعدی کی کمی ہو جاتی ہے۔ پس یہی قانون جو سخت حالتوں میں اس طرح صاف صاف نظر آتا ہے تمام حالتوں پر صادق آتا ہے۔ جب یہ ناواجب مطالبے (یعنی قویٰ سے زائد از اعتدال کام لینا) خفیف اور دائمی ہوتے ہیں اُس وقت بھی قوت کا خرچ ہو جانا یقیناً ایسا ہی مضر ہوتا ہے جیسا کہ اُس وقت جب کہ وہ مطالبے سخت اور ناگہانی ہوتے ہیں۔ اسی لیے اگر بچپن میں دماغی محنت کا خرچ قدرت کی مقررہ مقدار سے بڑھ جائے تو جس قدر خرچ دوسرے کاموں میں ہونا چاہیے تھا وہ واجبی اندازہ سے گھٹ جاتا ہے اور کسی نہ کسی قسم کی خرابیاں یقیناً عائد ہوتی ہیں ذیل میں ان خرابیوں پر اختصار کے ساتھ بحث کرتے ہیں۔

اگر دماغی محن
حد اعتدال
کسی قدر زیا
ہو تو اُس کا
پر کیا ہوتا

فرض کرو کہ "زائد از اعتدال دماغی محنت" باضابطہ محنت سے یوں ہی سی زیادہ ہو تو سوائے اس کے کہ **جسمانی** نشوونما میں کچھ خفیف سا خلل واقع ہو کچھ زیادہ نقصان نہ ہوگا۔ یعنی یا تو قد اُس انداز سے کسی قدر کم رہ جائے گا جہاں تک کہ وہ بصورت دیگر پہنچ سکتا تھا یا جثہ جس قدر کہ ہونا چاہیے تھا اُس سے کم رہ جائے گا اور جسم کا مادہ باعتبار اپنی کیفیت کے ایسا عمدہ نہ ہوگا۔ بہرکیف ان میں سے ایک یا زیادہ نتیجے یقیناً پیش آئیں گے۔ دماغی محنت کے دوران اور بعد کے زمانہ میں جب کہ

دماغی مادہ کی تلافی کی جاتی ہے خون کی جو زائد مقدار دماغ کے لیے مہیا کی جاتی ہے یہ وہی خون تو ہے جو بصورت دیگر اعضاء اور امعاء میں گردش کرتا اور اُس نمو یا بدل ما یتحلل میں، جس کے لیے وہ خون مواد بہم پہنچاتا ہے خلل واقع ہوتا ہے۔ جب یہ جسمانی نقصان یقینی ہے تو سوال یہ ہے کہ آیا وہ نفع جو زائد تربیت کا نتیجہ ہے نقصان کے مساوی ہے یا نہیں؟ جسمانی نمو یا جسمانی ساخت، جس سے طاقت اور استقلال پیدا ہوتا ہے، آیا اس نمو کے نقصان اور اس ساخت کے ناکمل رہ جانے کا معاوضہ اس زائد علم سے جو حاصل ہوا ہے ہو سکتا ہے یا نہیں؟

اگر دماغی محنت حد اعتدال سے بہت زیادہ ہو تو اس کا اثر جسم پر کیا ہوتا ہے

جب دماغی محنت بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے تو اور بھی زیادہ سخت نتیجے پیدا ہوتے ہیں جو نہ صرف جسمانی تکمیل بلکہ خود دماغ کی تکمیل پر بھی مضر اثر ڈالتے ہیں۔ علم الاعضاء کا ایک قانون، جو اول اول مسٹر الیسڈ و سینٹ ہلیر[۵۱] نے مرتب کیا تھا اور جس پر مسٹر لیوس نے اپنے ایک مضمون میں جس کا عنوان ہے "پست قد اور دراز قد" توجہ مبذول کی تھی، یہ ہے کہ گروتھ (نمو) اور ڈیولپمنٹ (تیاری) میں باہم تضاد ہے۔ لفظ نمو سے جثہ کی زیادتی سمجھی جاتی ہے۔ اور تیاری سے بناوٹ کی زیادتی۔ اور قاعدہ یہ ہے کہ ان دونوں عملوں میں سے کسی ایک کا عمل کا بہت زیادہ بڑھ جانا دوسرے عمل کے رک جانے یا بند ہو جانے پر دلالت کرتا ہے۔ اِس بات کی ایک عام مثال کیٹر پلر[۵۲] اور کرسلس

---

۵۱ مسٹر الیسڈ و سینٹ ہلیر۔ اُنیسویں صدی کا ایک مشہور فرانسیسی عالم اور مدبر سلطنت ہے مترجم

۵۲ کیٹر پلر۔ ریشم کے کیڑے کی اُس حالت کو کہتے ہیں جب کہ وہ انڈے سے نکل کر بشکل کرم ہوتا ہے۔ اس حالت میں چھ سات ہفتہ تک رہتا ہے۔ کھاتا بہت ہے اور جلدی جلدی بڑھتا ہے انڈے سے نکل کر صرف پاؤ انچ لمبا ہوتا ہے۔ مگر آخر میں تین انچ لمبا ہو جاتا ہے۔ اگلا کھانا چھوڑ دیتا ہے۔ اس کے جبڑے کے نیچے دو نلیاں ہوتی ہیں۔ ان میں سے ریشم کے تار نکال نکال کر اپنے اوپر گویا بنا لیتا ہے۔ اس کے بعد مردہ سا ہو جاتا ہے۔ پوست چکنا اور رنگ سنہری سا ہو جاتا ہے اس حالت کو انگریزی میں کرسلس (سنہری) کہتے ہیں تین ہفتے اسطرح کوئے کے اندر مردہ سا رہتا ہے پھر اندر ہی اندر پروانہ بن کر کوئے کو چیر کر نکل جاتا ہے مترجم

کی مختلف حالتوں سے ملتی ہی۔ کیٹر پلر کا جثہ بہت ہی جلد بڑھتا ہی مگر جب وہ پورے
قد کا ہو جاتا ہی اُس وقت بھی اُس کی بناوٹ بہ نسبت اس حالت کے جب کہ وہ
چھوٹا تھا شاید ہی کچھ زیادہ پیچیدہ ہوتی ہو۔
کرسلس کا جثہ نہیں بڑھتا برعکس اس کے زندگی کی اس حالت میں اس کا وزن
گھٹ جاتا ہے مگر زیادہ تر پیچیدہ بناوٹ کی تکمیل بڑی سرعت کے ساتھ جاری
رہتی ہے۔ یہ اختلاف جو یہاں ایسا صاف نظر آتا ہی اعلیٰ درجہ کے جانوروں
میں اس کا سُراغ کم ملتا ہی کیوں کہ اُن میں یہ دونوں عمل ساتھ ساتھ جاری
رہتے ہیں۔ مگر یہ تفاوت ہماری نوع میں جب کہ مردوں اور عورتوں کا باہم مقابلہ
کریں خاصی اچھی طرح نظر آتا ہی۔ لڑکی کا جسم اور نفس جلدی جلدی نشو و نما پاتا ہی یا یہ
تیاری پر آتا ہی اور نمو نسبتہً جلد رُک جاتا ہی۔ لڑکے کا جسمانی اور عقلی نشو و نما زیادہ
آہستہ آہستہ ہوتا ہی اور اُس کا نمو بھی زیادہ ہوتا ہی۔ جس عمر میں لڑکی بالغ ہو جاتی
ہی اُس کی جسمانی ساخت مکمل ہو جاتی ہی اور اُس کے تمام قویٰ اپنا عمل پوری طرح
کرنے لگتے ہیں۔ اُس عمر میں لڑکے کی جسمانی ساخت نسبتہً نامکمل ہوتی ہی۔ کیوں کہ
اُس کے قوائے نامیہ جثہ کی زیادتی کی طرف مائل ہوتے ہیں اور یہ بات مقابلۃً لڑکے
کے ادھڑپن سے ظاہر ہی۔ پس یہ قانون جسمانی ساخت کے ہر ایک جداگانہ حصہ پر
اور نیز بحیثیت مجموعی صادق آتا ہی۔ جب کسی عضو کی بناوٹ میں خلاف قاعدہ
جلد ترقی ہو جاتی ہی تو یہ امر اُس کے نمو کے قبل از وقت رُک جانے پر دلالت
کرتا ہی۔ اور یہ بات نفس کے ساتھ اسی طرح پیش آتی ہی جس طرح کہ کسی دوسرے
عضو کے ساتھ۔ دماغ ابتدائی عمر میں جثہ کے لحاظ سے نسبتہً بڑا مگر ساخت کے
لحاظ سے نامکمل ہوتا ہی اور اگر ناواجب مستعدی کے ساتھ دماغ سے کام لیا جائے
تو جس قدر ترقی اُس عمر کے مناسب حال ہونی چاہیے اُس سے زیادہ ترقی تو ہو جاتی

ہی مگر آخری نتیجہ یہ ہوتا ہی کہ جس درجہ تک اُس کا قد اور طاقت بصورت دیگر پہنچ سکتے تھے اُس میں کمی واقع ہو جاتی ہی۔ ''قبل از وقت نمو پانے والے'' بچے اور جوان، جو ایک خاص عرصہ تک تمام مشکلات پر غالب آتے تھے، اُن کی ترقی کے اوقات یکایک رُک جانے اور اُن کے والدین کی بڑی بڑی امیدوں کے خاک میں مل جانے کی ایک وجہ بلکہ خاص وجہ یہی ہی۔

سخت دماغی محنت کا اثر صحت پر کیا ہوتا ہی

مگر ''زائد از اعتدال تعلیم'' کے یہ نتائج جو اوپر بیان ہوئے ہیں گو آفت ناک ہیں تاہم بمقابلہ اُن نتائج کے، جو صحت پر مترتب ہوتے ہیں مثلاً جسمانی نظام کا زوال ضعف قویٰ خیالات فاسدہ، شاید کم آفت ناک ہوں۔ علم الاعضاء کی تازی تحقیقات سے ثابت ہوا ہی کہ دماغ کا اثر جسمانی افعال پر کس قدر زیادہ ہوتا ہی۔ دماغی تحریک سے ہضم، دوران خون اور ان کی بدولت تمام اعضائے کے افعال پر گہرا اثر پڑتا ہی۔ ویگس ایک عصب ہی جو دماغ کو امعا سے ملاتا ہی، جس شخص نے ہماری طرح اُس تجربہ کو بار بار دیکھا ہی جو اول اول ویبر نے کیا تھا جس سے اس عصب کی خراش کا نتیجہ ظاہر ہوتا ہی یعنی جس شخص نے یہ دیکھا ہی کہ قلب کا فعل اس عصب کو خراش پہنچانے سے یکایک بند ہو جاتا ہی اور جب یہ خراش جاتی رہتی ہی تو وہ فعل آہستہ آہستہ دوبارہ شروع ہو جاتا ہی اور اُس کے از سر نو شروع ہوتے ہی قلب کا فعل پھر رُک جاتا ہی وہ صاف صاف یہ بات سمجھ لے گا کہ دماغ سے بہت زیادہ کام لینا جسم پر کیا کچھ افسردگی پیدا کرنے والا اثر ڈالتا ہی۔ یہ نتائج جن کی تشریح اس طرح علم الاعضا سے کی گئی ہی اُن کی مثال درحقیقت معمولی تجربہ میں ملتی ہی۔ کوئی ایسا شخص نہ ہوگا جس نے اُس اختلاج قلب کو محسوس نہ کیا ہو جو امید، خوف، غصہ اور خوشی کے ساتھ ہوا کرتا ہی۔ کوئی شخص ایسا نہ ہوگا جس نے یہ مشاہدہ نہ کیا ہو کہ جب یہ جذبات شدید ہوتے ہیں تو قلب کے فعل میں کیسے زحمت کے آثار نظر آتے ہیں۔ اگرچہ بہت سے آدمی

ایسے ہیں جنھوں نے کبھی ایسے سخت جذبہ کی تکلیف نہیں اُٹھائی جس سے قلب کا فعل رُک جاتا ہے اور غش آجاتا ہے تاہم ہر شخص جانتا ہے کہ یہ دونوں باتیں بطور علت و معلول کے ہیں۔ یہ بھی ایک مشہور بات ہے کہ معدہ کا خلل اُس نفسانی تحریک کا نتیجہ ہوتا ہے جس کی شدت ایک خاص حد سے تجاوز کر جاتی ہے۔ زوال اشتہا نفس کی نہایت فرحت بخش اور نیز نہایت دردانگیز حالتوں کا یکساں نتیجہ ہے۔ جب کھانا کھانے کے تھوڑے عرصہ بعد کوئی ایسا واقعہ، جس سے نفس کو راحت یا رنج پہنچے پیش آجائے تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ یا تو معدہ کھائی ہوئی غذا کو رد کر دیتا ہے یا بڑی دقت اور ایا کے ساتھ اُس کو ہضم کرتا ہے، اور جب خالص عقلی عمل حد اعتدال سے بڑھ جاتا ہے تو اُس سے بھی ایسے ہی نتائج پیدا ہوتے ہیں اور ہر شخص جو اپنے دماغ پر زیادہ بار ڈالتا ہے اس امر کی تصدیق کرسکتا ہے۔ پس دماغ اور جسم کا تعلق، جو سخت حالتوں میں صاف صاف نظر آتا ہے، معمولی اور کم نمایاں حالتوں میں بھی بالکل اسی طرح قائم رہتا ہے جس طرح کہ یہ سخت مگر عارضی دماغی تحریک امعا میں سخت مگر عارضی خلل پیدا کرتی ہے۔ اسی طرح خفیف مگر دیرپا دماغی تحریک امعا میں خفیف مگر دیرپا خلل پیدا کرتی ہے۔ یہ نتیجہ ہی نہیں ہے بلکہ ایک واقعی بات ہے جس کی تصدیق ہر ایک طبیب کرسکتا ہے اور جس کا افسوس ناک تجربہ ہم نے ایک عرصہ تک کیا ہے اور ہم بذات خود اس کی تصدیق کرسکتے ہیں جسمانی ابتری کی مختلف صورتیں اور مختلف مدارج ایسے ہوتے ہیں جن کی جزوی اصلاح کے لیے مجبوراً برسوں تک کام چھوڑ کر آرام لینا پڑتا ہے اور یہ بات دماغ سے عرصہ دراز تک زیادہ کام لینے کا نتیجہ ہے۔ بعض اوقات قلب پر بالخصوص اثر پڑتا ہے۔ مثلاً دائمی اختلاج قلب اور نبض کا زیادہ ضعیف ہوجانا اور نبض کی ضربوں کی تعداد میں بالعموم کمی ہوجانا مثلاً بہتر فی منٹ سے گھٹ کر ساٹھ تک آجانا یا اس سے بھی کم۔ بعض اوقات معدہ میں نمایاں ابتری نظر آتی ہے مثلاً سوہضمی جس سے زندگی وبال ہوجاتی ہے

اور جس کا علاج سوائے وقت کے اور کچھ نہیں ہے۔ بہت سی حالتوں میں قلب اور معدہ دونوں مبتلا ہو جاتے ہیں، بسا اوقات نیند کم آتی ہے اور کبھی نیند میں آنکھ کھل جاتی ہے اور تھوڑی بہت عقلی افسردگی عموماً ہوتی ہے۔

اب غور کرو کہ وہ نقصان کیا کچھ سخت نہ ہوگا جو ناواجب نفسانی تحریک سے بچوں اور جوانوں کو پیش آتا ہے۔ واجبی مقدار سے بڑھ کر دماغ سے کام لینے کا نتیجہ یہ ہے کہ جسمانی نظام میں ضرور کم و بیش فتور واقع ہوتا ہے۔ اور اگر بالفرض اس قدر زیادہ فتور بھی نہ واقع ہو جس سے انسان بیمار پڑ جائے تو بھی یہ نتیجہ یقیناً پیدا ہوگا کہ ان نقصانات کے آہستہ آہستہ جمع ہونے سے جسمانی انحطاط پیدا ہوتا ہے، قلیل اور نازک اشتہا، ناقص ہاضمہ اور ضعف دوران خون کے ساتھ نشو و نما پانے والا جسم کیوں کر پنپ سکتا ہے؟ نشو و نما کے ہر عمل کا پورا ہونا عمدہ خون کے کافی ذخیرہ پر منحصر ہے۔ عمدہ خون کی کافی مقدار کے بغیر غدود مناسب طور پر خون سے پیدا نہیں ہو سکتا اعصاب اپنا فرض پوری طرح ادا نہیں کر سکتیں، عمدہ خون کی کافی مقدار کے بغیر کسی عصب، عضلہ، جھلی یا کسی اور مادہ کی کمی اچھی طرح پوری نہیں ہو سکتی۔ عمدہ خون کی کافی مقدار کے بغیر نمونہ تو کامل ہوتا ہے اور ناکافی۔ اب اس بات کا اندازہ کرو کہ جب ضعیف معدہ نمو کرنے والے جسم کے لیے ایسا خون مہیا کرے جو کمیت کم میں اور کیفیت میں ادنی درجہ کا ہو اور ضعیف قلب قلیل اور ادنی درجہ کے خون کو غیر طبیعی آہستگی کے ساتھ آگے کو حرکت دے تو کیا کچھ خراب نتیجے پیدا نہ ہوں گے۔

اگر جسمانی انحطاط کثرت مطالعہ کا نتیجہ ہے، جیسا کہ اُن تمام آدمیوں کو جو اس معاملہ کی تحقیقات کرتے ہیں ضرور تسلیم کرنا پڑے گا، تو طوطے کی طرح یاد کر لینے کا طریقہ جس کی مثالیں اوپر بیان ہو چکی ہیں کس قدر سخت قابل الزام نہ ہوگا، یہ

طریقہ ایک خوف ناک غلطی ہو خواہ کسی حیثیت سے اُس پر نظر کی جائے۔

پہلا نقصان

اوّل یہ ایک غلطی ہو جہاں تک محض تحصیل علم سے متعلق ہے۔ کیونکہ نفس بھی جسم کی طرح ایک خاص اندازہ سے بڑھ کر کسی شئے کو قبول نہیں کرسکتا اور جس قدر عرصہ میں کہ نفس واقعات کو اخذ کرسکتا ہو اگر اس سے زیادہ جلد اُن کے اخذ کرنے کا بار اُس پر ڈالا جائے تو وہ واقعات تھوڑے عرصہ میں پھر ذہن سے نکل جاتے ہیں اور بجائے اس کے کہ اُن سے عقلی عمارت قائم ہو امتحان پاس کرنے کے بعد ہی جس کے لیے وہ ازبر کئے تھے یا دسے اُتر جاتے ہیں۔

دوسرا نقصان

دوم یہ ایک غلطی ہے، اس وجہ سے بھی کہ اس طریقہ سے مطالعہ بے لطف ہو جاتا ہو خواہ اُس دردانگیز تسلسل خیالات کی بدولت جو متواتر عقلی محنت کی وجہ سے پیدا ہوتا ہو خواہ دماغ کی ابتر حالت کی بدولت جو اُس کا نتیجہ ہو، یہ طریقہ اکثر اوقات کتابوں سے متنفر کردیتا ہو اور بجائے اس کے کہ بعد میں اپنے نفس کی آپ تربیت کی جائے، جس کی طرف معقول تعلیم ہدایت کرتی ہو قدم بقدم رجعت قہقری ہوتی جاتی ہو۔

تیسرا نقصان

سوم۔ یہ ایک غلطی ہے، اس اعتبار سے بھی کہ اس میں یہ فرض کرلیا جاتا ہو کہ "حصول علم ہی سب کچھ ہو" اور یہ بات فراموش کردی جاتی ہے کہ اس سے بھی زیادہ ضروری بات "علم کا انضباط" ہو جس کے لیے وقت بطور خود فکر کرنا ضروری ہو۔ جیسا کہ ہمبولٹ عام ترقی عقل کی بابت کہتا ہو۔ کہ جب منتشر واقعات نہایت کثرت کے ساتھ دماغ میں بھر دیئے جاتے ہیں تو تحریر کا زور کم ہو جانے سے کائنات کی تعبیر مبہم ہو جاتی ہو" اسی طرح شخصی عقل کی ترقی کی بابت کہا جاسکتا ہو کہ وہ کثیر معلومات جو اچھی طرح ذہن نشین نہیں ہوتیں سخت بار

اور وبال جان ہوتی ہے۔ وقعت اُس علم کی نہیں جو بطور "عقلی چربی" کے جمع ہو جاتا ہے بلکہ وقعت اُس علم کی ہے جو "عقلی عضلہ" بن جاتا ہے۔

چوتھا نقصان

چہارم۔ مگر یہ غلطی اور بھی زیادہ سخت ہے اگر بالفرض طوطے کی طرح یاد کر لینا اس لحاظ سے عمدہ ہوتا کہ اُس سے عقلی قابلیت پیدا ہوتی حالانکہ ایسا نہیں ہوتا تاہم طریقہ مذکور جیسا کہ ہم ثابت کر چکے ہیں، اس وجہ سے خراب ہوتا ہے کہ وہ اُس جسمانی طاقت کو جو زندگی کی کشاکش میں عقلی تربیت حاصل کرنے کے لیے درکار ہے زائل کرتا ہے۔ جو معلم اپنے شاگردوں کے نفسوں کو ترقی دینے کے شوق میں اُن کے جسموں سے غفلت کرتے ہیں اُن کو یہ بات یاد نہیں کہ دنیا کی کامیابی بہ نسبت معلومات کے زیادہ تر جسمانی قوت پر منحصر ہے اور جو تدبیر علم کو دماغ میں ٹھونس لینے کے سبب جسمانی قوت کو زائل کرتی ہے وہ آپ اپنی ناکامی کا باعث ہے۔ مضبوط ارادہ اور نہ تھکنے والی مستعدی جو حیوانی طاقت کی افراط کا نتیجہ ہیں یہ دونوں باتیں تعلیم کے بڑے بڑے نقصانوں کا بہت کچھ معاوضہ کر سکتی ہیں، اور جب اس طاقت کے ساتھ اُس کافی و وافی تعلیم کو شامل کر لیا جائے جو صحت کو قربان کیے بغیر حاصل ہو سکے، تو اُن حریفوں پر، جن کو کثرت مطالعہ نے ضعیف کر دیا ہے، یقیناً بآسانی فتح حاصل ہو سکتی ہے اگرچہ وہ علم میں افلاطون زمانہ ہی کیوں نہ ہوں۔ جو انجن نسبتہً چھوٹا ہو اور اچھا بنا ہوا نہ ہو۔ اگر اس سے زیادہ زور سے کام لیا جائے تو وہ اُس انجن سے زیادہ کام دے سکتا ہے۔ پس یہ کیسی حماقت ہے کہ جس حالت میں انجن کی تکمیل کی جائے اُس کے بھبکے کو ایسا نقصان پہنچایا جائے کہ اس میں بھاپ پیدا نہ ہو۔

پانچواں نقصان

پنجم۔ پھر یہ طریقہ اس وجہ سے بھی ایک غلطی ہے کہ وہ زندگی کی بہبودی کا ایک غلط اندازہ قائم کرتا ہے۔ اگر بالفرض یہ طریقہ دنیاوی ناکامی کا ذریعہ

ہونے کے بجائے دنیاوی کامیابی کا ذریعہ بن جائے تو بھی بہ سبب اُس خراب صحت کے جو اُس کا نتیجہ ہے وہ اور بھی زیادہ آفت برپا کرے گا۔ اگر دولت کے ساتھ لگاتار بیماریاں لگی رہیں تو دولت کے حاصل کرنے سے کیا فائدہ ہے؟ عزت و امتیاز کی کیا وقعت ہے اگر اُس کے ساتھ مراق بھی پیدا ہو جائے؟ یقیناً کسی شخص کو اس بات کے بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ عمدہ ہاضمہ سرعت نبض اور اعلیٰ درجہ کا نشاط خوشی کے عناصر ہیں جن کا مقابلہ خارجی منافع نہیں کر سکتے۔ کسی مزمن جسمانی بیماری کی وجہ سے نہایت ہی روشن امیدوں پر غم کی تاریکی چھا جاتی ہے، مگر عمدہ صحت کی زندہ دلی بدقسمتی پر بھی ملمع کر دیتی ہے۔

پس ہم اس بات پر زور دیتے ہیں کہ "یہ زاید از اعتدال تعلیم" ہر ایک اعتبار سے خراب ہے یعنی

(۱) خراب اس اعتبار سے کہ جو کچھ علم اُس سے حاصل ہوتا ہے وہ جلد فراموش ہو جاتا ہے۔

(۲) خراب اس اعتبار سے کہ وہ علم سے متنفر کر دیتی ہے۔

(۳) خراب اس اعتبار سے کہ وہ اُس انضباط علم سے غافل رہے جو تحصیل علم سے بھی زیادہ ضروری ہے۔

(۴) خراب اس اعتبار سے کہ اُس قوت کو ضعیف یا ضائع کر دیتی ہے جس کے بغیر تربیت یافتہ عقل بیکار ہے اور

(۵) خراب اس اعتبار سے کہ وہ اُس خراب صحت کا باعث ہے جس کا معاوضہ کامیابی بھی نہیں کر سکتی اور جو ناکامی کو دو چند تلخ کر دیتی ہے۔

ممکن ہے کہ اس جابرانہ طریقۂ تعلیم کے نتائج بہ نسبت مردوں کے عورتوں کے لیے اور بھی زیادہ مضر ہوں۔ چونکہ لڑکیوں کو اُن طاقت بخش اور فرحت بخش

جسمانی ورزشوں سے بہت کچھ روکا جاتا ہے جن کے ذریعے لڑکے کثرت مطالعہ کی خرابیوں کو کم کرتے ہیں۔ اس لیے وہ ان خرابیوں کی پوری پوری سختی محسوس کرتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ بہت کم لڑکیاں ایسی نکلتی ہیں جو بڑی ہو کر تندرست رہیں اور جن کے اعضا میں تناسب پایا جائے زرد رو، بدشکل، چپٹے سینہ والی نوجوان خواتین جو لندن کے ملاقات کے کمروں میں کثرت کے ساتھ دیکھی جاتی ہیں، اُس بے رحمانہ محنت کا نتیجہ نظر آتا ہے جس کو جوانی کے کھیلوں سے ہلکا نہیں کیا جاتا اور جس قدر کہ اُن کے اکثر کمالات اُن کی بہبودی میں ممد و معاون ہوتے ہیں اُس سے کہیں زیادہ جسمانی انحطاط مزاحم ہوتا ہے۔ جو مائیں اپنی بیٹیوں کو دل کش بنانے کی خواہش مند ہیں وہ اس سے زیادہ کوئی مضر طریقہ جو جسم کو نفس پر قربان کر دیتا ہے، شاید ہی پسند کر سکیں، وہ باتیں مردوں کے مذاق کا لحاظ نہیں رکھتیں یا مردوں کے مذاق کا صحیح تصور نہیں کر سکتیں۔ مرد عورتوں کے علم کی کچھ ایسی پروا نہیں کرتے مگر اُن کے جسمانی حسن، نیک طینتی اور عقل سلیم کا بہت کچھ خیال کرتے ہیں۔ بھلا ایک عالم و فاضل شریف زادی اپنے وسیع علم تاریخ کی بدولت کتنے دلوں کو مسخر کر سکتی ہے؟ کون ایسا آدمی ہے جو کسی عورت پر اس وجہ سے فریفتہ ہوا ہو کہ وہ اٹلی کی زبان سمجھتی تھی؟ ایسا مجنوں کہاں ہے جو لیلی پر اس وجہ سے گرویدہ ہوا ہو کہ وہ جرمنی زبان جانتی تھی؟ مگر گل رنگ رخسار اور چشم خنداں میں بڑی کشش ہے، ایک اچھی مکمل شکل نگاہ تحسین کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے، زندہ دلی، خوش مزاجی جو کامل صحت کا نتیجہ ہیں محبت کے قائم کرنے میں بہت کچھ اثر رکھتی ہیں۔ ہر شخص کو ایسی حالتیں معلوم ہیں جہاں اور سب خوبیوں کی عدم موجودگی

لہ اصل کتاب میں ایڈون اور انجلینا ہے جو اپنے عشق کی وجہ سے انگریزی میں ضرب المثل ہیں۔ ہم نے مضمون کی مناسبت سے ان کا ترجمہ مجنوں اور لیلی کیا ہے مترجم

صرف جسمانی حسن نے طبیعت میں ایسا جوش پیدا کر دیا ہی جو سب خوبیوں پر غالب آگیا ہی۔ مگر مشکل سے کوئی شخص ایسی حالت بتا سکتا ہی جہاں اخلاقی یا جسمانی اوصاف سے قطع نظر کر کے عقلی علوم کی تحصیل نے طبیعت میں ایسا جوش پیدا کیا ہو۔ سچ یہ ہی کہ من جملہ اُن بہت سے عناصر کے جو انسان کے سینہ میں اُس پیچیدہ جذبہ کے پیدا کرنے کے لیے جسے ہم محبت کہتے ہیں، مختلف نسبت سے باہم ملتے ہیں، سب سے زیادہ قوی عناصر ہیں جو جسمانی کشش سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس کے بعد بلحاظ قوت کے دوسرا درجہ اُن کا ہی جو اخلاقی کشش سے پیدا ہوتے ہیں اور سب سے کم زور وہ ہیں جو عقلی کشش سے پیدا ہوتے ہیں اور اُن کا دار و مدار بھی کسی علم پر اس قدر نہیں جس قدر کہ قدرتی لیاقت پر ہی۔ مثلاً عقل و ذکاوت فہم و فراست اور بصیرت اگر بعض اشخاص اس دعوی کو بے وقعت خیال کریں اور مردوں کی طبیعت کے اس طرح مغلوب ہو جانے کی مخالفت کریں تو ہمارا جواب یہ ہی کہ قوانین الٰہی کے ساتھ اس طرح معارضہ کرتے وقت وہ یہ نہیں جانتے کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ اگر ترتیب مذکورۂ بالا کا مفہوم صاف ظاہر نہ ہوتا تو بھی ہم یقین کر سکتے تھے کہ قدرت کو اُس سے کسی اہم مقصد کا پورا کرنا مد نظر ہی۔ مگر جو لوگ تحقیقات کرتے ہیں اُن پر اس کا مفہوم بالکل ظاہر ہی۔ جب ہم اس بات کو یاد کریں کہ قدرت کے مقاصد میں سے ایک مقصد بلکہ سب سے اعلیٰ مقصد آیندہ نسل کی بہبودی ہی۔ اس کے علاوہ جو ترقی یافتہ عقل خراب جسمانی نظام پر مبنی ہی اُس کی وقعت (جہاں تک کہ آیندہ نسل کا تعلق ہی) کم ہوتی ہی کیوں کہ اُس کی اولاد ایک ہی دو پشتوں میں ختم ہو جائے گی۔ برعکس اس کے عمدہ جسمانی نظام کا قائم رکھنا گو اُس کے ساتھ قوائے عقلیہ نے انتہا ترقی کر سکتے ہیں، اب ہم سمجھ لیں گے کہ طبعی میلانوں کا وہ باہمی توازن جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہی کس قدر ضروری ہی۔ مگر فائدہ سے قطع نظر کر کے

یہ دیکھیں کہ ان طبیعی میلانوں کا باہمی توازن اس طرح ہو تو پھر کسی ایسے طریقہ پر جس سے لڑکیوں کے جسم کو نقصان پہنچے' اس غرض سے اصرار کرنا کہ اُن کے حافظہ میں بہت سا علم کوٹ کر بھر دیا جائے' حماقت ہو۔ جہاں تک کہ ممکن ہو اعلیٰ تعلیم دو بلکہ جتنی اعلیٰ تعلیم دی جائے اتنی ہی بہتر ہو بشرطیکہ کوئی جسمانی نقصان نہ ہو۔ (اور ہم ساتھ میں یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ اگر طوطے کی سی لیاقت کو کم اور انسانی لیاقت کو زیادہ ترقی دی جائے اور اگر تعلیم و تربیت کو اُس زمانہ تک جو مدرسہ چھوڑنے اور شادی کرنے کے درمیان واقع ہو اور جو آج کل رائگاں جاتا ہو' وسعت دی جائے تو کافی اعلیٰ درجہ کی تعلیم ہو سکتی ہو) مگر ایسے طریقہ سے یا ایسی حد تک تعلیم دینا جس سے جسمانی انحطاط پیدا ہو اُس بڑے مقصد کو فوت کر دیتا ہو جس کے لیے محنت' خرچ اور فکر برداشت کی جاتی ہو۔ والدین اپنی بیٹیوں کو اس طریقہ تعلیم میں مبتلا کر کے اُن کی زندگی کی امیدوں کو اکثر برباد کر دیتے ہیں۔ کم زور صحت اور اُس کی تمام تکالیف و ناتوانی افسردگی کا وبال اُن پر ڈالتے ہیں اور اس کے علاوہ اکثر اوقات تجرد کا فتویٰ بھی اُن پر لگا دیتے ہیں۔

پس بچوں کی جسمانی تعلیم مختلف اعتبارات سے نہایت ناقص ہو'

آج کل بچوں کی جسمانی تعلیم میں زیادہ تر چار نقص پائے جاتے ہیں۔

اوّل تو اس میں یہ غلطی ہو کہ بچوں کو ناکافی خوراک دی جاتی ہو۔

دوم ناکافی لباس پہنا جاتا ہو۔

سوم۔ ناکافی ورزش کرائی جاتی ہو (کم سے کم لڑکیوں سے)

چہارم۔ دماغی محنت بہت زیادہ لی جاتی ہو۔)

اگر اس دستور العمل پر بحیثیت مجموعی غور کیا جائے تو اُس کا رجحان یہ ہو کہ وہ ضروری مقدار سے زیادہ مطالبہ کرتا ہو یعنی مانگتا بہت زیادہ ہو اور دیتا بہت کم ہو۔ قویٰ نشو و نما پر اس قدر بار ڈالتا ہو کہ بچوں کی زندگی بالغوں کی زندگی سے جسقدر

مشابہت ہونی چاہیئے اُس سے بہت زیادہ مشابہت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ اس حقیقت
کو نظر انداز کر دیتا ہے کہ جس طرح جنین کی پوری زندگی نمو میں صرف ہوتی ہے اور جس طرح
شیر خواری کی زندگی نمو میں اس قدر زیادہ صرف ہو جاتی ہے کہ جسمانی یا عقلی عمل
کے لیے بہت ہی کم گنجائش باقی رہتی ہے اسی طرح تمام بچپن اور جوانی میں زیادہ
تر ضرورت نمو کی ہے، باقی تمام ضرورتیں اسی ضرورت کے تابع ہونی چاہئیں۔ یہ وہ
ضرورت ہے جو اس امر کی ہدایت کرتی ہے کہ زیادہ دیا جائے اور کم لیا جائے۔ یہ وہ
ضرورت ہے جو سرعت نمو کی مناسبت سے جسمانی اور دماغی محنت کو محدود کرتی ہے۔
یہ وہ ضرورت ہے جو جسمانی اور دماغی عملوں کو صرف اُس وقت بڑھنے دیتی ہے جب کہ نمو
کی رفتار گھٹ جاتی ہے۔

عقلی تعلیم پر اس قدر زور دینا اور جسمانی تعلیم سے اس قدر غفلت کرنا ہمارے موجودہ تمدن کا نتیجہ ہے۔

اس سخت جابرانہ تعلیم کی اصل یہ ہے کہ وہ ہمارے تمدن کی حالت موجودہ کا نتیجہ
ہے۔ ابتدائی زمانہ میں جب کہ مخاصمت اور مدافعت بڑے بڑے تمدنی کام سمجھے
جاتے تھے، جسمانی طاقت اور جرأت کی بڑی ضرورت تھی اور اُس وقت تعلیم تقریباً
بالکل جسمانی ہوتی تھی، عقلی تربیت کا خیال کم کیا جاتا تھا۔ اور جیسا کہ قرون متوسط
میں ہوتا تھا درحقیقت اُس کو بسا اوقات نظر حقارت سے دیکھا جاتا تھا۔ مگر اب جب کہ
ہماری حالت نسبتہً صلح جو ہو گئی ہے، اب جب کہ ہاتھ پاؤں کی محنت کے سوا کسی
دوسرے کام میں جسمانی قوت بہت کم کارآمد ہے، جب کہ معاشرت میں تقریباً ہر قسم
کی کامیابی بہت کچھ عقلی قوت پر منحصر ہے، ہماری تعلیم بھی قریب قریب بالکل عقلی
ہو گئی ہے۔ جسم کا لحاظ رکھنے اور نفس سے غفلت کرنے کے بجائے ہم آج کل نفس
کا لحاظ رکھتے اور جسم سے غفلت کرتے ہیں۔ یہ دونوں طریقے غلط ہیں۔ ہم نے ابتک
اس حقیقت کو نہ سمجھا کہ چونکہ ہماری اس زندگی میں نفس کا دارومدار جسم پر ہے اس لیے
جسم کو نقصان پہنچا کر عقل کو ترقی نہیں دینی چاہیئے۔ بلکہ قدیم اور جدید خیالات کو

آپس میں سمو لینا چاہیئے۔

صحت کا قائم رکھنا فرض ہے اور جب تک یہ خیال ذہن نشین نہ ہو اُس وقت تک جسمانی تربیت پر کما حقہ توجہ نہیں ہو سکتی

شاید اس اعتقاد کے پھیلنے سے کہ صحت کا قائم رکھنا فرض ہے (نہ کہ اور کسی وجہ سے) جلد وہ زمانہ قریب آجائے گا جب جسم اور نفس دونوں کی کافی غور و پرداخت کی جائے گی۔ بہت کم لوگ اس امر سے واقف معلوم ہوتے ہیں کہ جسمانی اخلاق بھی کوئی شے ہے۔ لوگوں کے اقوال و افعال ہمیشہ اس خیال کو کنایتہً ظاہر کرتے ہیں کہ "ہم آزاد ہیں جس طرح چاہیں جسم کے ساتھ برتاؤ کریں"۔ قدرت کے احکام کی نافرمانی سے جو بیماریاں پیدا ہوتی ہیں اُن کو محض اپنی حق تلفی سمجھتے ہیں نہ کہ اُس چال چلن کا نتیجہ جس میں تھوڑی بہت خرابی پائی جاتی ہے۔ اگرچہ وہ بد نتیجے، جو اُن کے متوسلوں اور آیندہ نسلوں کو بھگتنے پڑتے ہیں، اکثر ایسے ہی سخت ہوتے ہیں جیسے کہ وہ نتیجے جو کسی جرم سے پیدا ہوتے ہیں تاہم وہ اپنے آپ کو ذرا بھی مجرم نہیں سمجھتے۔ یہ سچ ہے کہ شراب خواری میں جسمانی خلاف ورزی کی بُرائی تسلیم کی جاتی ہے مگر معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شخص یہ نتیجہ نکالتا کہ "اگر جسمانی خلاف ورزی (یعنی شراب خواری) ایک خراب بات ہے تو یہی کیفیت ہر ایک جسمانی خلاف ورزی کی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قوانین صحت کی تمام خلاف ورزیاں جسمانی گناہ ہیں۔ جب یہ بات عام طور پر سمجھ میں آجائے گی اُسی وقت اور شاید اُس سے پہلے نہیں بچوں کی جسمانی تربیت پر کما حقہ توجہ کی جائے گی۔

انکشافات ہوئے ہیں اُن سب کو جمع کر دیا ہے طرزِ بیان دلچسپ اور کتاب ایک نعمت ہے قیمت ۸ر

**تاریخ تمدن** سر ٹامس بکل کی شہرۂ آفاق کتاب کا ترجمہ ہے الف سے یے تک تمدن کے ہر مسئلہ پر کمال جامعیت سے بحث کی گئی ہے۔ ہر بحث کے لیئے ایک عجیب مگر زبردست اُصول اختیار کیا گیا ہے اور ہر اصول کی تائید میں تاریخی انتقادسے کام لیا گیا ہے اس کے مطالعہ سے معلومات میں انقلاب اور ذہن میں وسعت پیدا ہوتی ہے بمبئی میں سرکاری لائبریریوں کے لیئے تجویز کی گئی ہے۔ قیمت حصّہ اوّل غیر مجلد عہ/ حصّہ دوم مجلد ع۱۲

**فلسفۂ جذبات** کتاب کا مصنّف ہندوستان کا مشہور نفسی ہے۔ جذبات کے علاوہ نفس کی ہر ایک کیفیت پر نہایت لیاقت اور زباں آوری کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔ متعلمان نفسیات اسے نہایت مفید پائینگے۔ قیمت مجلّد - - - ع۱۲

**مقدّمات الطبیعات** یہ ترجمہ ہے مگر انگلستان کے مشہور سائنسدان حکیم ہکسلی کی کتاب کا ترجمہ ہے۔ جس کا نام کتاب کی کافی ضمانت ہے۔ اس میں مظاہر فطرت کی بحث درج ہے لیکن کتاب علم و فضل کا مرقع ہے۔ متعلّمان سائنس اور عام شائقین کے لئے بہت مفید ہے قیمت - - - - - - - - - - - - - ۸ر

**البیرونی** کمالاتِ ذہنی میں ابو ریحان بیرونی کا مرتبہ تعریف سے مستغنی ہے دسویں صدی کا فاضل ہے مگر تبحر علمی اور دقیق النظری میں بیسویں صدی کا فرق معلوم ہوتا ہے ہندوستان آیا اور ہندوستان کے فلسفہ تاریخ اور مذہب و معاشرت پر ایک بے مثل کتاب لکھی۔ البیرونی اس کے حالاتِ زندگی اور کمالاتِ علمی پر مشتمل ہے قیمت مجلّد ۸ر

**فلسفۂ اجتماع** تالیف ہے اور اس کا موضوع نفس اجتماعی یعنی جماعت کے اعمال و قوائے دماغی کی تحلیل و تشریح ہے موجودہ انقلابات میں اس کا مطالعہ دلچسپی اور فائدہ سے خالی نہو گا۔ اس پر انگلستان و ہند کے علما و اخبارات نے اچھے اچھے ریویو لکھے ہیں۔ قیمت - - - - - - - - - - عہ/

**قاعدہ و کلید قاعدہ** مدت کے غور و خوص کے بعد اور بالکل جدید طرز پر لکھا گیا ہے۔ ڈائرکٹر تعلیمات بمبئی نے اپنے صوبہ کے گورنر سے تحریک کی کہ اس قاعدہ کو نصاب میں داخل کیا جائے۔ جن اُصول اور طریقہ پر اس کی تعلیم ہونی چاہیئے اُن کی تشریح کے لیئے ایک کلید بھی تیار کی ہے۔ قاعدہ ۲ر کلید قاعدہ ۴ر

**دریائے لطافت** ہندوستان کے مشہور سخن سنج میر انشاء اللہ خاں کی تصنیف ہے اُردو صرف و نحو اور محاورات و الفاظ کی پہلی کتاب ہے اس میں زبان کے متعلق بعض عجیب و غریب نکات درج ہیں قیمت - - - - عہ

**طبقات الارض** اس فن کی پہلی کتاب ہے تین سو صفحوں میں تقریباً جملہ مسائل قلمبند ہیں انگریزی اور اُردو داں دونوں کے لیئے یکساں طور پر مُفید ہے کتاب کے آخر میں انگریزی مصطلحات اور اُن کے مرادفات کی فہرست بھی منسلک ہے۔
قیمت - - - - - - - - - - عہ

**مشاہیر یونان و رومہ** پلوٹارک لائوز کا ترجمہ ہے سیرت نگاری اور انشاپردازی میں اصل کتاب کا مرتبہ دو ہزار برس سے آج تک مسلم الثبوت چلا آتا ہے ادبیاتِ عالم بلکہ شکسپیر تک نے اس چشمہ سے فیض حاصل کیا ہے وطن پرستی و بے نفسی، عزم و جوانمردی کی مثالوں سے اس کا ہر ایک صفحہ لبریز ہے ہماری قوم کے ہر نوجوان کے ہاتھ میں اس کا ایک نسخہ ضرور ہونا چاہیئے۔ دنیا کی تمام مہذب زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔
جلد اول غیر مجلد قیمت - - - عگار جلد دوم مجلد قیمت - - - - عگار

**اسباق نحو** دو حصے ملک کے ادیب کامل مولانا مولوی حمید الدین صاحب بی اے کی تالیف سے ہیں۔ اختصار کے باوجود عربی صرف و نحو کا ہر ایک ضروری مسئلہ درج ہے عربی خوان طلبہ کے لئے نادر تحفے ہیں قیمت فی حصہ ۴ر

**ملنے کا پتہ: مینجر صاحب مسلم یونیورسٹی بک ڈپو، علی گڈھ**